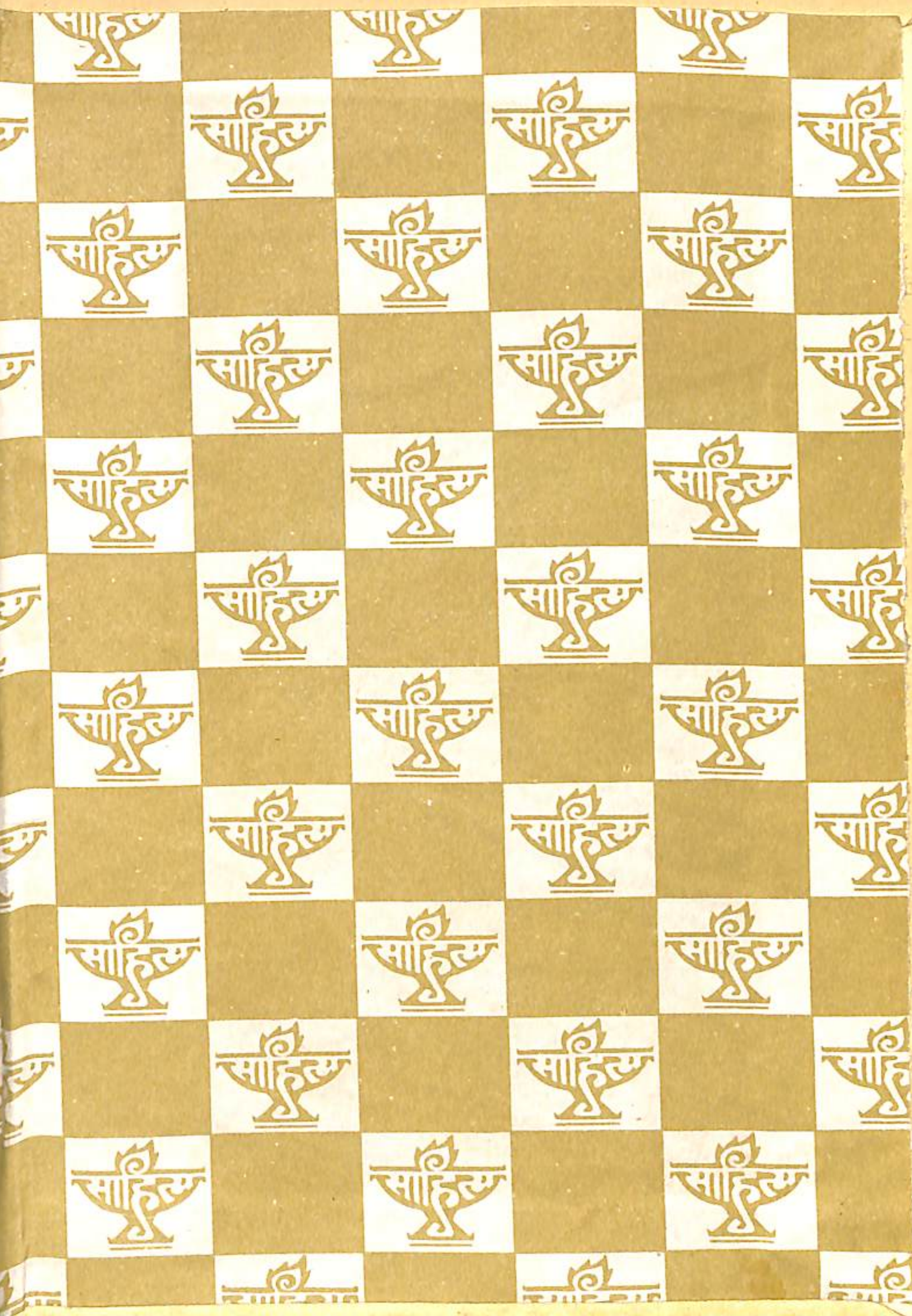


سب انسان بھائی بھائی ہیں

(مہاتما گاندھی کی زندگی اور خیالات)





سب انسان بھائی بھائی ہیں

سب انسان بھائی بھائی ہیں

(مہاتما گاندھی کی زندگی اور خیالات)

مقدمہ:

ڈاکٹر ایس، رادھاکرشنن

مرتبہ:

کے۔ آر۔ کرپلانی

مترجم:

ایس۔ عابد حسین



ساہتیہ اکادمی، نئی دلی ۱

SAB INSAN BHAI BHAI HAIN : Urdu
translation of **ALL MEN ARE BROTHERS**
a selection from the writings of
Mahatma Gandhi as edited by Krishna Kripalani
for UNESCO. Sahitya Akademi,
New Delhi (1966). Price Rs. 6.00

ساہتیہ اکادمی، رویندر بھون، نئی دِلّی

پہلا ایڈیشن، ۱۹۶۶ء

قیمت چھ روپے

(طابع :- دلی پرنٹنگ ورکس دھلی)

ترتیب

مقدمہ

—— ڈاکٹر ایس۔ رادھاکرشنن

عظیم رہنما دنیا میں مدتوں بعد تے ہیں۔ کبھی صدیوں میں ایک آجاتا ہے

اور جاتا ہے۔ لوگ اُسے اُس کی زندگی سے پہچانتے ہیں۔ پہلے وہ اپنی زندگی سے ایک مثال

قائم کرتا ہے۔ پھر لوگوں سے کہتا ہے کہ اُس کی پیروی کریں۔ ایسے ایک رہنما گاندھی تھے

اُن کی تقریروں اور تحریروں کے اِس انتخاب سے جو کرشنا کرپلانی نے بہت احتیاط

اور سلیقے سے کیا ہے پڑھنے والے کو گاندھی جی کے اندازِ فکر، اُن کے خیالات کی نشوونما

اور ان کے طرزِ عمل کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

وہ زندگی جس کی جڑیں نہ ہوں جس کی پُشت پر روایات نہ ہوں، سطحی ہوا کرتی ہے

بعض لوگ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ صحیح بات کیا ہے تو ظاہر ہے

ہم وہی کریں گے۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ یہ جاننے کے بعد بھی کہ صحیح بات کیا ہے

لازمی نہیں کہ ہم اُس کو اختیار کریں اور عمل میں لائیں۔ ہم نفسانی خواہشوں کی قوت سے

مغلوب ہو کر بُرے کام کر بیٹھتے ہیں اور اس نورِ باطن سے جو ہمارے اندر ہے مُنہ موڑ لیتے ہیں۔ ہندو نظریے کے مطابق ہم موجودہ حالت میں بس ادھورے انسان ہیں۔

ہمارا نفس ادنیٰ ابھی تک حیوانی ہے۔ ہم اُس حیوان کو جو ہمارے اندر ہے فقط اسی طرح مار سکتے ہیں کہ محبت کے ہتھیار سے اپنی ادنیٰ جبلتوں پر قابو پالیں۔ انسان راہ میں ٹٹول ٹٹول کر گرتا، اُٹھتا، اپنے آپ کو جانچتا، پرکھتا، کڑے ضبطِ عمل سے کام لیتا بڑی مشکل سے ایک ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔

گاندھی جی کا مذہب عملی اور اخلاقی تھا۔ وہ کسی عقیدے کو جو اُن کی عقل میں نہ آئے کسی امر کو جو اُن کے ضمیر کو نہ بھائے قبول نہیں کرتے تھے۔

اگر ہم خدا کو صرف ذہن سے نہیں بلکہ دل و جان سے مانتے ہیں تو ہم ساری نوعِ انسانی سے بغیر نسل، طبقے، قوم یا مذہب کی تفریق کے محبت کریں گے۔ "میرے عمل کی تحریک، نوعِ انسانی کی محبت ہے، جو میری فطرت کا جزو ہے۔ میں نے کبھی عزیزوں اور بیگانوں، ہم وطنوں اور پردیسیوں، گوروں اور کالوں، ہندوؤں اور دوسرے مذہب کے ماننے والوں میں خواہ وہ مسلمان ہوں یا پارسی، یا عیسائی یا یہودی۔ کبھی فرق نہیں کیا ہے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے اندر اس قسم کا فرق کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔" "مدتوں کی پرارتھنا اور سادھن کے بعد چالیس سال سے مجھے کسی سے نفرت نہیں رہی۔" "سب انسان بھائی بھائی ہیں۔ اس لیے اُن میں بیگانگی کا پردہ حائل نہیں ہونا چاہیے۔ سب کا بھلا "سرودے" ہمارا مقصد ہونا چاہیے۔ خدا کی ذات وہ رشتہ ہے۔ جو سب انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے۔ اس رشتے کو اپنے بڑے سے بڑے دشمن سے بھی توڑ دینا ایسا ہے جیسے عین ذات کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ بد سے بد آدمی میں بھی انسانیت ضرور ہوتی ہے۔" [1]

---

[1] مہابھارت : ۱۲- ۲۵۹- ۱۱

یہ تیدہ ہمیں خود بخود اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ ہم اہنسا کو سارے قومی اور بین الاقوامی مسائل حل کرنے کا بہترین ذریعہ سمجھ کر اختیار کریں۔ گاندھی جی کہتے تھے کہ وہ خیال پرست نہیں بلکہ عملی تصور پسند ہیں۔ "اہنسا صرف سنتوں اور عارفوں کے لیے نہیں بلکہ عام لوگوں کے لئے بھی ہے۔ اہنسا ہمارے بنی نوع کا قانون ہے۔ اُسی طرح جیسے ہنسا بہائم کا قانون ہے۔ بہائم کے اندر روح خوابیدہ ہوتا ہے۔ اور وہ حیوانی قوت کے قانون کے سوا کوئی قانون نہیں جانتے۔ انسانی وقار کا یہ تقاضا ہے کہ ہم ایک برتر قانون کی پیروی کریں۔ روحانی قوت کے آگے سر جھکائیں۔"

گاندھی جی انسانی تاریخ میں پہلے شخص تھے جو اہنسا کے اصول کو انفرادی سطح سے آگے سماجی اور سیاسی سطح پر لے گئے۔ وہ سیاست میں اسی لئے آئے کہ اہنسا کا تجربہ کریں۔ اور اُس کی عملی افادیت کو ثابت کریں۔ "بعض دوستوں نے مجھ سے کہا ہے کہ ستیہ اور اہنسا کی سیاست میں اور دنیوی امور میں کوئی گنجائش نہیں۔ مجھے اس بات سے اتفاق نہیں۔ اگر ستیہ اور اہنسا محض انفرادی نجات کے وسیلے ہیں تو میرے کام کے نہیں۔ انہیں روزمرہ کی زندگی میں لانا اور برتنا وہ تجربہ ہے جو میں شروع سے اب تک کرتا رہا ہوں۔" "میرے نزدیک سیاست جو مذہب سے عاری ہو گندی چیز ہے۔ اس سے دور رہنا چاہئے۔ سیاست کا تعلق قوموں سے ہے اور جو چیز قوموں کی بھلائی سے تعلق رکھتی ہو اُس سے مذہبی طبیعت کے آدمی کو یعنی خدا کے اور حق کے طالب کو ضرور تعلق رکھنا چاہئے۔ میرے نزدیک خدا اور حق مترادف الفاظ ہیں۔ اگر کوئی مجھ سے یہ کہے کہ خدا باطل کا یا ظلم کا خدا ہے تو میں اُس کی پرستش کرنے سے انکار کر دوں۔ غرض سیاست میں بھی ہمیں آسمانی سلطنت قائم کرنی ہے۔"

ہندوستان کی تحریک آزادی کے سلسلے میں اُن کا اصرار تھا کہ ہم اہنسا اور قربانی کے مہذب طریقے اختیار کریں۔ اُن کا ہندوستان کی آزادی کی حمایت کرنا برطانیہ سے

نفرت پر مبنی نہ تھا۔ "میرے لئے حبِ وطن اور انسانیت ایک چیز ہے۔ میں محبِ وطن اسی وجہ سے ہوں کہ مجھ میں انسانیت یا انسانی ہمدردی ہے۔ میں ہندوستان کی خدمت انگلستان یا جرمنی کو نقصان پہنچا کر نہیں کرنا چاہتا۔" اُن کا خیال تھا کہ درا صل یہ خود اہلِ برطانیہ کی خدمت ہے کہ وہ اُنہیں ہندوستان کو اُس کا حق دینے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ اِس کا نتیجہ صرف ہندوستان کی آزادی نہیں بلکہ نوعِ انسانی کے اخلاقی وسائل میں اضافہ ہوگا۔

آج کل جوہری طاقت کے ماحول میں اگر ہم دُنیا کو بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں اہنسا کے اصول اختیار کرنے چاہئیں۔ گاندھی جی نے کہا تھا۔ "جب میں نے پہلی بار سنا کہ ایک ایٹم بم نے ہیروشیما کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تو میری تیوری پر بل تک نہیں پڑا۔ بلکہ میں نے دل میں سوچا۔" اب دُنیا کو اہنسا اختیار کرنی پڑے گی۔ ورنہ پھر اُس کا اپنے ہاتھوں ہلاک ہونا یقینی ہے۔" آئندہ جو لڑائی ہوگی اُس میں کسی فریق کو یہ اطمینان نہیں ہو سکتا کہ فریقِ ثانی بالا ارادہ جوہری ہتھیاروں کا استعمال نہیں کرے گا۔ ہمارے ہاتھ میں وہ طاقت آگئی ہے کہ ایک دھماکے میں وہ سارا سرمایہ تہس نہس کر دیں جو ہم نے اپنی محنت اور قربانی کی بدولت صدیوں میں فراہم کیا ہے۔ پروپاگنڈا کے مہم کے ذریعے ہم لوگوں کے ذہنوں کو جوہری جنگ کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ اشتعال انگیز فقرے بے تکلف دُہرائے جا رہے ہیں ہم الفاظ تک میں جارحانہ اقدام سے کام لے رہے ہیں۔ بدظنی، بغض، غصہ یہ سب ہنسا کی چھپی ہوئی شکلیں ہیں۔

اِس مشکل زمانے میں جب ہم ہنوز اِن حالات سے جو سائنس نے پیدا کئے ہیں، نپٹ نہیں پائے ہیں، اہنسا، حق پسندی اور مفاہمت کے اصولوں کو اختیار کرنا آسان نہیں ہے۔ مگر اِس کی وجہ سے ہمیں کوشش سے باز نہیں آنا چاہئے۔ جہاں سیاسی لیڈروں کا ضدی پن ہمارے دلوں میں ڈر پیدا کرتا ہے وہاں دُنیا کے عام لوگ

کی سوجھ بوجھ اور اُن کی اخلاقی حس ہمیں اُمید کا سہارا دیتی ہے۔

جس تیزی سے اِس نئے زمانے میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں اُسے دیکھتے ہوئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ سو سال بعد دُنیا کا رنگ کیا ہوگا۔ ہم فکر و احساس کے آنے والے دھاروں کا پہلے سے اندازہ نہیں کر سکتے۔ لیکن کتنا ہی زمانہ گزر جائے۔ ستیہ اور اہنسا کے عظیم اصول ہماری رہنمائی کے لئے موجود رہیں گے۔ یہ خاموش ستاروں کی طرح اِس خستہ زمانۂ شور و شر سے معمور دُنیا سے پرے اُس کی حفاظت کے لئے حریم قدس میں شب بیداری کرتے رہیں گے۔ گاندھی جی کی طرح ہمیں بھی اپنے اِس عقیدے میں ثابت قدم رہنا چاہیئے کہ اِن آتے جاتے بادلوں کے اوپر سورج چمک رہا ہے۔

ہم ایک ایسے زمانے میں رہتے ہیں جسے اپنی شکست اور اخلاقی جمود کا احساس ہے۔ جس میں ایمان و یقین کے حصار ٹوٹ رہے ہیں۔ جانے بوجھے نقشے بگڑ رہے ہیں۔ نارواداری اور تلخی بڑھتی جاتی ہے۔ تخلیق کی حرارت جس نے عظیم انسانی سماج کے دلوں کو گرمایا تھا۔ ٹھنڈی پڑ رہی ہے ذہنِ انسانی کی نیرنگیاں جن کا بھید ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ بُدھ اور گاندھی، نیرو اور ہٹلر کے متضاد نمونے دکھاتی رہتی ہیں۔ یہ ہمارے لئے باعثِ فخر ہے کہ تاریخ کی ایک عظیم ترین ہستی ہماری ہمعصر تھی۔ ہمارے ساتھ چلتی پھرتی، ہم سے بات چیت کرتی ہمیں مہذب زندگی کے طور طریقے سکھاتی تھی۔ جو شخص کسی کی بُرائی نہ کرے اُسے کسی کا ڈر نہیں اُسے کچھ چھپانا نہیں اِس لئے وہ بے خوف ہوتا ہے۔ ہر ایک سے آنکھ ملاتا ہے۔ اُس کا قدم مضبوط، اُس کا سر اونچا، اور اُس کی بات سیدھی، صاف اور دو ٹوک ہوتی ہے افلاطون نے بہت پہلے کہہ دیا تھا۔

دُنیا میں ہمیشہ چند پہنچے ہوئے آدمی ہوتے ہیں۔ جن کی صحبت

ان مول ہے۔

نئی دہلی۔ ۱۵ راگست ۱۹۵۸ء

ایس۔ رادھا کرشنن

پہلا باب

آپ بیتی

دراصل میرا مقصد اِس قسم کی کتاب لکھنا نہیں ہے جو آپ بیتی کہلاتی ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ میں نے حق کی تلاش میں جو تجربے کیئے ہیں اُن کی کہانی سنا دوں۔ اِس میں شک نہیں کہ میری ساری عمر اِن ہی تجربوں میں گزری ہے۔ اِس لئے یہ کہانی بھی آپ بیتی بن جائے گی لیکن کتاب کے ہر صفحے میں ان تجربوں کے سوا کسی چیز کا ذکر نہ ہو تو میں اُس کے لکھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔(۱)

میں نے جو تجربے سیاست کے میدان میں کئے ہیں وہ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ایک حد تک "مہذب دنیا" میں بھی مشہور ہو گئے ہیں۔ میری نظر میں نہ ان کی کوئی وقعت ہے۔ نہ "مہاتما" کے لقب کی جو لوگوں نے اُن کی بنا پر مجھے دے رکھا ہے۔ مجھے اِس لقب سے بہت دُکھ پہنچا ہے اور جہاں تک مجھے یاد ہے اُس نے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی میرے دل کو نہیں لبھایا۔ ہاں اُن روحانی تجربوں

کو میں خوشی سے بیان کروں گا جن کی میرے سوا کسی کو خبر نہیں، اور جن کی بدولت مجھے سیاسی میدان میں کام کرنے کی تھوڑی بہت قوت حاصل ہوئی۔ اگر یہ تجربے سچ مچ روحانی ہیں تو اُن کا ذکر کرنے میں خودستائی کی کوئی گنجائش نہیں۔ سچ پوچھیے تو اُن کی یاد سے میرے دل میں عاجزی کا احساس اور بڑھ جاتا ہے۔ جتنا زیادہ میں پچھلے زمانے پر غور کرتا ہوں اتنی ہی مجھ پر اپنی نارسائی کھلتی جاتی ہے (۲)

میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ یہ تجربے مکمل ہیں۔ میں انہیں اِس سے زیادہ بھروسے کے قابل نہیں سمجھتا جتنا ایک دیانتدار سائنسدان اپنے تجربوں کو سمجھتا ہے۔ وہ نہایت صحت کے ساتھ خوب سمجھ بوجھ کر ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتے ہوئے تجربے کرتا ہے پھر بھی اُسے دعویٰ نہیں ہوتا کہ جو نتیجے اُسے حاصل ہوئے ہیں وہ آخری اور قطعی ہیں بلکہ وہ اُن میں ترمیم اور اصلاح کی گنجائش سمجھتا ہے۔ میں نے بہت گہرے مشاہدۂ باطن سے کام لیا ہے، اپنے نفس کو اچھی طرح ٹٹولا ہے اور ہر نفسیاتی حالت کی تحلیل کی ہے لیکن یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں کہ میں جن نتیجوں پر پہنچا ہوں وہ آخری اور قطعی اور خطا سے بری ہیں۔ البتہ اتنا دعویٰ مجھے ضرور ہے کہ میری ذات کے لیے یہ نتیجے بہ ظاہر بالکل صحیح اور فی الحال قطعی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ان پر اپنے عمل کی بنیاد نہ رکھتا۔ لیکن میں نے ہمیشہ ہر قدم اُٹھانے سے پہلے غور کر لیا ہے کہ کس نتیجے کو قبول کروں اور کسے رد کر دوں۔ اور اُس کے بعد جو رائے قائم ہوئی ہے، اُس پر عمل کیا ہے۔ (۳)

میری زندگی ایک سالم اکائی ہے۔ جس کے ٹکڑے نہیں کیے جا سکتے۔ میرے سارے کام ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، اور اُس کی جڑ وہ انتھاہ محبت ہے جو مجھے نوعِ انسانی کے ساتھ ہے۔ (۵)

گاندھی خاندان کے لوگ ذات کے بنئے ہیں اور ابتدا میں پنساری کی دوکان

کرتے تھے۔ لیکن تین پشتوں سے، یعنی میرے دادا کے وقت سے وہ کاٹھیاواڑ
کی مختلف ریاستوں میں دیوان رہے ہیں۔ ... معلوم ہوتا ہے۔ میرے دادا اصول کے
بڑے پکے تھے۔ ریاستی سازشوں سے مجبور ہو کر انہیں پوربندر سے جہاں وہ
دیوان تھے جوناگڑھ جانا پڑا۔ وہاں انہوں نے نواب صاحب کو بائیں ہاتھ سے
سلام کیا۔ کسی شخص کی نظر اس حرکت پر جو بظاہر بے ادبی معلوم ہوتی تھی پڑ گئی اور اس نے
اس کی وجہ پوچھی تو میرے دادا نے کہا "سیدھا ہاتھ پوربندر کے راجا کی خدمت
کا پابند ہو چکا ہے" (٦)

میرے والد اپنی برادری کے بڑے خیر خواہ بہادر اور فیاض آدمی تھے۔
نازک مزاج بھی بہت تھے۔ شاید وہ کسی حد تک جسمانی لذتوں کے دلدادہ تھے۔
کیونکہ چالیس برس سے زیادہ کی عمر میں انھوں نے چوتھی شادی کی لیکن وہ رشوت
کبھی نہ لیتے تھے۔ اور اپنوں بیگانوں میں ان کی منصف مزاجی کی دھوم تھی (٧)

والدہ کے متعلق میرے حافظے میں سب سے گہرا نقش ان کی عبادت گزاری
اور پرہیزگاری کا ہے۔ وہ بڑی پکی دین دار تھیں۔ ناممکن ہے کہ کبھی ان دعاؤں کے
بغیر جو وہ روز پوجا کرتی تھیں کھانا کھالیں۔ وہ سخت سے سخت برتوں کی منت مان
لیتی تھیں اور انہیں انتہائی ثابت قدمی سے پورا کرتی تھیں۔ بیماری کے عذر سے
وہ کبھی اس میں ڈھیل نہیں ڈالتی تھیں۔ (٨)

میں ان ماں باپ کے گھر میں پوربندر میں پیدا ہوا۔ اور وہیں میرا بچپن کا زمانہ
گزرا۔ مجھے یاد ہے کہ میں مکتب میں بٹھایا گیا تھا۔ یہاں میں نے بڑی مشکل سے
پہاڑے یاد کیے۔ مجھے اس زمانے کے بارے میں اس کے سوا کچھ یاد نہیں کہ اور
لڑکوں کے ساتھ مل کر طرح طرح کے فقرے کسا کرتا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ
میرا ذہن کند تھا اور حافظہ کمزور۔ (٩)

میں بہت جھینپو تھا اور کسی سے ملتا جلتا نہ تھا۔ صرف میری کتابیں اور میرے کام کے سوا کوئی رفیق نہ تھا۔ میں گھنٹہ بجتے ہی اسکول پہنچ جاتا اور چھٹی ہوتے ہی گھر بھاگتا۔ میں سچ مچ بھاگتا ہوا جاتا تھا۔ اس لیے کہ کسی سے بات کرنے کی ہمت نہ تھی بلکہ ڈرتا تھا کہ کوئی میری ہنسی نہ اڑائے۔ (١٠)

ہائی اسکول میں پہلے سال امتحان کے موقع پر ایک واقعہ پیش آیا۔ جو قابل ذکر ہے۔ مسٹر جائلس انسپکٹر مدارس معائنہ کے لئے آئے تھے۔ انھوں نے ہمیں ہجے کی مشق کے لئے پانچ لفظ لکھوائے۔ ان میں سے Kettle تھا۔ میں نے اس کے ہجے غلط لکھے تھے۔ استاد نے مجھے اپنے بوٹ کی نوک سے ٹھکرا کر جتانا چاہا۔ مگر میں نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ یہ بات کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے ساتھی کی سلیٹ سے ہجے نقل کر لوں کیوں کہ میرے خیال میں استاد وہاں اس لیے تھے کہ ہمیں نقل نہ کرنے دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے سوا سب لڑکوں کے یہاں ہر لفظ کے ہجے صحیح نکلے۔ ایک میں ہی بے وقوف ثابت ہوا۔ بعد میں استاد نے مجھے میری بے وقوفی سمجھانے کی کوشش کی، مگر مجھ پر کچھ اثر نہ ہوا۔ مجھے نقل کرنے کا فن کبھی نہ آیا۔ (١١)

میرا دردناک فرض ہے کہ اس حقیقت کو بیان کروں کہ میری شادی تیرہ برس کی عمر میں ہوئی۔ جب میں اس عمر کے لڑکوں کو جو میری نگرانی میں ہیں، دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے اوپر افسوس ہوتا ہے اور انھیں مبارکباد دینے کو دل چاہتا ہے کہ وہ اس مصیبت سے محفوظ ہے جو مجھ پر پڑی تھی۔ مجھے اتنی عمر میں شادی کا کوئی اخلاقی جواز نظر نہیں آتا تھا۔ (١١)

ان دنوں میرے نزدیک شادی کی بس اتنی اہمیت تھی کہ اچھے اچھے کپڑے پہننے میں آئیں گے، ڈھولک بجے گی۔ بارات نکلے گی، عمدہ عمدہ کھانے ملیں گے

اور ایک اجنبی لڑکی ساتھ کھیلنے کو ملے گی۔ شہوانی خواہش آگے چل کر پیدا ہوئی۔(۱۳)

آہ! وہ پہلی رات! دو معصوم بچے بے جانے بوجھے زندگی کے سمندر میں کود پڑے۔ میری بھاوج نے مجھے اچھی طرح سمجھا بجھا دیا تھا کہ مجھے پہلی رات کو کیا کرنا چاہیئے۔ معلوم نہیں میری بیوی کو کس نے سمجھایا تھا۔ میں نے اس بارے میں ان سے کبھی کچھ نہیں پوچھا اور نہ اب پوچھنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کا سامنا کرتے ہوئے کس قدر جھجکتے تھے۔ ہماری شرم حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ آخر اپنی بیوی سے کیسے باتیں کروں گا۔ اور کیا کہوں گا۔ جو کچھ مجھے سکھایا گیا تھا، اُس سے کہاں تک کام چلتا۔ مگر سچ پوچھئے تو ان معاملات میں سکھانے کی کوئی ضرورت نہیں..........

.... رفتہ رفتہ ہم ایک دوسرے سے واقف ہوتے گئے۔ اور بے تکلف بات چیت کرنے لگے ہم دونوں ہم سن تھے۔ مگر میں نے بہت جلد شوہر کی شان سے حکومت جتانا شروع کر دیا۔(۱۴)

مجھے اعتراف ہے کہ میں اُن پر دل سے فریفتہ تھا۔ اسکول میں بھی میں اُن ہی کے خیال میں محو رہتا۔ اور آنے والی رات اور خلوت کا تصور ہر وقت میرے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا۔ اُن کی جدائی میرے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ رات کو میں بڑی دیر تک فضول باتیں کر کے اُن کی نیند حرام کر دیتا۔ اگر اس جوشِ جنون کے ساتھ میرے دل میں فرض شناسی کی لگن نہ ہوتی تو یا تو میں بیماریوں میں مبتلا ہو کر قبل از وقت موت کا شکار ہو جاتا۔ یا پھر اس طرح جیتا کہ زندگی موت سے بدتر ہوتی۔ مگر روزمرہ کے فرائض کا ادا کرنا ضروری تھا۔ اور یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا تھا کہ جھوٹ بول کر اُن سے پیچھا چھڑا لوں۔ اسی چیز نے مجھے بہت سے گڑھوں میں گرنے سے بچا لیا۔(۱۵)

میرا خیال اپنی قابلیت کے بارے میں کچھ اچھا نہ تھا۔ اور مجھے وظیفہ اور انعام پا کر تعجب ہوا کرتا تھا۔ لیکن اپنے چال چلن کی دیکھ بھال میں بڑی سختی سے کیا کرتا تھا۔ اس پر اگر خفیف سا دھبہ بھی آگیا۔ تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے جب کبھی میری کوئی حرکت واقعی یا محض استاد کے خیال میں سرزنش کے قابل ہوتی تو مجھے اتنا دکھ ہوتا کہ میں برداشت نہ کر سکتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار مجھے جسمانی سزا دی گئی۔ سزا کی مجھے اتنی پروا نہ تھی۔ جتنا اس بات کا رنج تھا کہ میں سزا کا مستوجب سمجھا گیا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ (۱۶)

ہائی اسکول میں جن لڑکوں سے میری مختلف اوقات میں دوستی رہی ان میں سے دو قلبی دوست کہے جا سکتے ہیں..... دوسری دوستی کو میں اپنی زندگی کا ایک الم ناک واقعہ سمجھتا ہوں۔ یہ بہت دن قائم رہی۔ میں نے اسے اصلاح کے جوش میں شروع کیا تھا۔ (۱۷)

آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔ جو شخص کسی کی اصلاح کرنا چاہتا ہے وہ اس کے ساتھ گھل مل کر نہیں رہ سکتا۔ سچی دوستی روحانی اتحاد کا نام ہے جو اس دنیا میں بہت کم میسر آتا ہے۔ صرف ان ہی لوگوں میں جن کی طبیعت ایک سی ہو۔ دوستی پوری طرح مکمل اور پائدار ہو سکتی ہے۔ دو دوستوں میں سے ایک کا دوسرے پر اثر پڑتا ہے، اس لئے دوستی میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے۔ میری رائے میں کسی ایک شخص سے ایک جان دو قالب ہونے سے پرہیز کرنا چاہئے کیونکہ ایک انسان دوسرے سے نیکی کے مقابلہ میں بدی کا اثر جلد قبول کرتا ہے جو شخص خدا کا دوست بننا چاہتا ہے، وہ یا تو اکیلا رہے۔ یا ساری دنیا سے دوستی کرے۔ ممکن ہے میری رائے غلط ہو۔ مگر مجھے تو قلبی دوستی پیدا کرنے میں ناکامی ہوئی۔ (۱۸)

اِس دوست کے کارناموں نے مجھ پر جادو سا کر دیا۔ وہ بہت دور تک اور بڑی تیزی سے دوڑ سکتا تھا۔ کودنے پھاندنے میں مشاق تھا۔ اور سخت سے سخت جسمانی سزا برداشت کر لیتا تھا۔ وہ اکثر مجھے اپنے یہ کارنامے دکھایا کرتا اور قاعدہ کی بات ہے انسان دوسروں میں وہ صفتیں دیکھ کر جو خود اس میں نہ ہوں، دنگ رہ جاتا ہے۔ میرا بھی یہی حال ہوا۔ اور پھر دل میں ولولہ اٹھا۔ کہ اس جیسا بنوں۔ میں دکود سکتا تھا۔ نہ دوڑ سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں بھی اس کی طرح مضبوط کیوں نہ بن جاؤں۔[۲۱]

پھر میں بزدل بھی تھا۔ مجھے چوروں، بھوتوں اور سانپوں کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔ رات کو گھر سے باہر نکلنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اندھیرے میں میری روح فنا ہوتی تھی۔ میرے لئے سونا اندھیرے میں قریب قریب ناممکن تھا۔ مجھے یہ وہم ستاتا تھا کہ ایک طرف بھوت چلے آرہے ہیں، دوسری طرف سے چور، تیسری طرف سے سانپ۔ اس لئے جب تک کمرے میں روشنی نہ ہو، مجھے نیند نہیں آتی تھی۔

میرے دوست کو میری اِن کمزوریوں کا حال معلوم تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں زندہ سانپ کو ہاتھ میں لے سکتا ہوں۔ چوروں سے نپٹ سکتا ہوں اور بھوتوں کا تو سرے سے قائل ہی نہیں۔ یہ سب اس کی برکت ہے کہ میں گوشت کھاتا ہوں۔[۲۱]

ان سب باتوں کا مجھ پر کافی اثر پڑا...... مجھے رفتہ رفتہ یقین ہونے لگا کہ گوشت کھانا اچھا ہے۔ اِس سے مجھ میں قوت اور جرأت پیدا ہو جائے گی۔ اور اگر سارا ملک گوشت کھانے لگے تو انگریزوں کو مغلوب کیا جا سکتا ہے۔[۲۲]

جب کبھی میں (اپنے دوست کے ساتھ) چوری سے دعوتیں اڑاتا تو پھر گھر آکر مجھ سے کھانا نہیں کھایا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ میری والدہ کھانے کے لئے

اصرار کرتی تھیں اور خواہش نہ ہونے کا سبب پوچھتی تھیں، میں اُن سے کہہ دیتا تھا۔ "آج مجھے بھوک نہیں ہے۔ میرے ہاضمے میں کچھ خرابی ہے"۔ اس طرح بہانہ کرنے پر میرا دل مجھے ملامت کرتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اور وہ بھی اپنی والدہ سے۔ مجھے یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر میرے ماں باپ کو میرے گوشت کھانے کی خبر ہو گئی تو انہیں سخت صدمہ ہوگا۔ یہ خیال میرے لئے سوہانِ روح تھا۔

اس لئے میں نے اپنے دل میں کہا۔ "اگرچہ گوشت کھانا ضروری ہے اور یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ ملک میں غذا کی اصلاح کی جائے لیکن ماں باپ کو دھوکا دینا اور اُن سے جھوٹ بولنا گوشت نہ کھانے سے بھی بدتر ہے۔ جب تک وہ زندہ ہیں میرے لئے گوشت کھانا ممکن نہیں، جب وہ نہ رہیں گے اور میں آزاد ہو جاؤں گا تو کھلم کھلا گوشت کھاؤں گا۔ مگر اُس وقت تک میں اس سے پرہیز کروں گا"۔

اِس فیصلے کی اطلاع میں نے اپنے دوست کو کر دی۔ اُس دن سے آج تک میں نے پھر کبھی گوشت نہیں کھایا۔ (۲۳)

یہ دوست مجھے ایک بار ایک چکلے، (قحبہ خانے) میں لے گیا۔ اُس نے مجھے ضروری ہدایتیں دے کر اندر بھیجا۔ سب باتیں پہلے ہی طے ہو چکی تھیں، اور روپیہ ادا کر دیا گیا تھا۔ میں گناہ کے منہ میں جا چکا تھا۔ مگر خدا نے اپنی رحمت کاملہ سے مجھے میرے نفس سے بچا لیا۔ اور میں اِس بدکاری کے اڈے میں تقریباً قریب قریب اندھا اور گونگا ہو گیا۔ میں پلنگ پر اُس عورت کے قریب بیٹھ گیا۔ گم سم۔ ظاہر ہے کہ اُسے غصہ آ گیا اور اُس نے مجھے گالیاں دے کر گھر سے نکال دیا۔ اس وقت مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میری مردمی کو بٹہ لگ گیا ہے

عزم سے ملنے ہی چاہتا تھا کہ زمین پھٹے اور میں سما جاؤں۔ لیکن اس کے بعد میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے بچا لیا۔ مجھے اس زندگی میں اس قسم کے چار اور واقعات یاد ہیں۔ اور ان میں سے اکثر میں اپنی کوشش سے نہیں بلکہ خدا کے فضل سے محفوظ رہا۔ خالص اخلاقی نقطۂ نظر سے تو چاروں مرتبہ میں لغزش کا مرتکب قرار پاؤں گا کیونکہ شہوانی خواہش موجود تھی اور یہ بجائے خود ارتکاب فعل سے کم نہیں۔ لیکن عام خیال یہ ہے کہ جو شخص اپنے جسم کو گناہ میں نہ آلودہ ہونے دے وہ گویا گناہ سے بچ گیا۔ میں بھی اسی حد تک بچا۔(۲۴)

جس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسان اکثر انتہائی کوشش کے باوجود ترغیب گناہ سے مغلوب ہو جاتا ہے، اسی طرح یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ خود گناہ کی طرف راغب ہوتا ہے مگر خدا کی قدرت سے اس سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ کیوں کر ہوتا ہے، تدبیر کہاں تک چلتی ہے اور تقدیر کا دخل کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں بھید ہیں اور ہمیشہ بھید ہی رہیں گی۔(۲۵)

مجھ میں اور میری بیوی میں جو تناچاقی ہو جایا کرتی تھی اس کی ایک وجہ یقیناً اس دوست کی صحبت تھی۔ میں اپنی بیوی کا عاشق تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ بدگمان بھی بہت تھا۔ اور یہ دوست میری بدگمانی کی آگ کو اور بھڑکاتا تھا۔ مجھے اس کی راست گوئی میں کبھی شبہ نہیں ہوا۔ اکثر اس کی چغل خوری کی بنا پر میں نے اپنی بیوی کو دکھ دیا ہے جس کی بنا پر آج تک ندامت ہے۔ صرف ایک ہندو بیوی ہی شاید ان تکلیفوں کو سہہ سکتی ہے۔ اس لئے میں عورت کو صبر و تحمل کی پتلی سمجھتا ہوں۔(۲۶)

بدگمانی کا ناسور میرے دل سے اس وقت گیا جب میں نے اہنسا کے سب پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ اس وقت مجھے برہمچریہ کی عظمت اور شوکت کی خبر ہوئی۔ اور مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ بیوی شوہر کی لونڈی نہیں بلکہ اس کی

رفیق اور مددگار اور اس کے رنج و راحت میں برابر کی شریک ہے اور وہ بھی اپنی راہ عمل کے انتخاب میں اسی طرح آزاد ہے جیسے اس کا شوہر۔ جب کبھی مجھے شک اور شبہے کے وہ بھیانک دن یاد آتے ہیں تو مجھے اپنی حماقت اور اپنے شوہرانہ ظلم سے انتہائی نفرت ہوتی ہے اور اپنے دوست کی اندھی تقلید کرنے پر سخت افسوس ہوتا ہے۔(٢٧)

چھ سات برس کی عمر سے سولہ برس کی عمر تک میں اسکول میں رہا۔ اس عرصے میں مجھے دنیا بھر کی چیزیں سکھائی گئیں۔ سوا مذہب کے اور اس سلسلے میں جو کچھ مجھے اپنے استادوں سے بغیر ان کی شعوری کوشش کے حاصل ہو سکتا تھا وہ بھی میں نے حاصل نہیں کیا۔ تاہم اپنے ماحول سے متفرق چیزیں سیکھتا رہا۔ مذہب کے لفظ کو میں یہاں اس کے وسیع ترین مفہوم یعنی معرفت نفس کے معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔(٢٨)
لیکن ایک عقیدے نے میرے دل میں گہری جڑ پکڑ لی کہ اخلاق ساری زندگی کی بنیاد ہے اور حق اخلاق کا نچوڑ ہے۔ حق کی تلاش میری زندگی کا واحد مقصد بن گئی۔ اس کی قدر و قیمت میری نظر میں برابر بڑھتی چلی گئی۔ اور اس کا مفہوم بھی روز بروز وسیع ہوتا گیا۔

میں چھوت چھات کے عقیدے کو ہندو دھرم کے دامن پر ایک بدنما داغ سمجھتا ہوں۔ یہ تصور نہ ان تلخ تجربوں کی وجہ سے پیدا ہوا جو جنوبی افریقہ کی ستیہ گرہ کے دوران میں ہوئے اور نہ اس وجہ سے کہ کبھی میرا عقیدہ دھرم کی کتابوں سے اٹھ گیا تھا۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ میرے خیالات عیسائی مذہب کی کتابوں کے مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ یہ تو میرے دل میں اس وقت سے ہیں جب میں نہ تو بائبل کا اور نہ اس کے ماننے والوں کا قائل تھا اور نہ ان سے واقف تھا۔ ابھی میں پورے بارہ برس کا بھی نہیں تھا کہ یہ حقیقت مجھ پر منکشف

پڑی۔

اوکا نام اکب تھا۔ بھنگی ہمارے گھر کمانے آتا تھا۔ میں اکثر اپنی والدہ سے پوچھتا، آخر اس کو چھونے میں کیا برائی ہے۔ اور مجھے اس سے کیوں منع کیا جاتا ہے۔ اگر میں کبھی اتفاق سے اُسے چھو لیتا تو مجھے اشنان کرنے کو کہا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ میں اس کی تعمیل کرتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ مسکراتے ہوئے احتجاج ضرور کیا کرتا تھا کہ چھوت کا حکم مذہب کی طرف سے نہیں ہے۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ایسا حکم دیا گیا ہو۔ میں بڑا فرض شناس اور فرماں بردار بچہ تھا مگر والدین کے ادب و احترام کا لحاظ رکھتے ہوئے اکثر اُن سے اس معاملہ میں جھگڑتا تھا۔ میں والدہ سے کہا کرتا تھا۔ "یہ سراسر آپ کی بھول ہے کہ آپ اوکا سے چھو جانا گناہ سمجھتی ہیں۔" (۳۰)

۱۸۸۷ء میں میں نے میٹرکولیشن کا امتحان پاس کر لیا۔ (۳۱)

میرے بزرگ چاہتے تھے کہ اب میں کالج میں پڑھوں۔ کالج بھاؤنگر میں بھی تھا اور بمبئی میں بھی۔ مگر چونکہ بھاؤنگر میں خرچ کم تھا، اس لئے میں نے یہ طے کیا کہ وہاں جا کر ساملداس کالج میں داخل ہو جاؤں۔ جانے کو تو میں چلا گیا۔ مگر وہاں پہنچ کر میرے حواس جاتے رہے۔ ہر چیز میرے لئے مشکل تھی۔ پروفیسروں کے لیکچروں میں دلچسپی ہونا تو درکنار میں اُن کا مطلب ہی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اِس میں اُن کا کوئی قصور نہ تھا۔ اِس کالج کے پروفیسر اعلیٰ درجہ کے سمجھے جاتے تھے۔ یہ میری ہی کوتاہی تھی کہ میں اُن کے درس سے فائدہ نہ اُٹھا سکا اور پہلی ٹرم کے ختم ہوتے ہی میں گھر چلا آیا۔ (۳۲)

تعطیل کے دوران میں ایک دن اتفاق سے ایک ذی علم برہمن جو ہمارے خاندان کے دوست، مشیر اور بڑی سوجھ بوجھ کے آدمی تھے ...... تشریف

سے لوٹے تھے۔ والدہ اور بھائی صاحب سے گفتگو کے سلسلے میں انھوں نے میری
پڑھائی کا حال پوچھا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں سامل داس کالج میں پڑھتا ہوں
تو انھوں نے کہا: "اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اور تم میں سے کوئی بغیر معقول تعلیم حاصل
کئے ہوئے اپنے والد کی گدی پانے کی توقع نہیں رکھ سکتا۔......... میری
رائے میں تم اسے ولایت بھیج دو۔ میرا بیٹا کیول رام سمجھتا ہے کہ بیرسٹری کا
امتحان بہت سہل ہے۔ تین سال میں یہ لوٹ آئے گا خرچ بھی چار پانچ ہزار
سے زیادہ نہ ہوگا۔ ذرا اس بیرسٹر کو دیکھو جو ابھی ولایت سے آیا ہے۔ کیسے
ٹھاٹھ سے رہتا ہے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ اس کو اسی سال انگلستان بھیج دو۔ (۲۳)
میری والدہ عجیب کشمکش و پیچ میں تھیں۔ کسی نے اُن سے کہہ دیا کہ (انگلستان
جا کر نوجوان بگڑ جاتے ہیں۔ کوئی بولا وہاں جا کر گوشت کھانے لگتے ہیں۔ کسی
نے کہا۔ وہاں شراب کے بغیر گزر نہیں ہوتی۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا۔ "کہو،
اب تم کیا کہتے ہو؟" میں نے کہا۔۔۔۔ "آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں۔ میں قسم کھا کر کہتا
ہوں کہ ان چیزوں کے پاس نہ پھٹکوں گا۔ اگر ایسا خطرہ ہوتا تو بھلا جوشی جی مجھے
جانے دیتے۔"........... میں نے عہد کیا کہ شراب، عورت اور گوشت کو
ہاتھ بھی نہ لگاؤں گا۔ اس کے بعد والدہ نے اجازت دے دی۔ (۲۴)

تعلیم کے لئے لندن کے سفر کا ارادہ کرنے سے بہت پہلے میں چپکے
چپکے دل میں یہ منصوبے بنایا کرتا تھا کہ کبھی جا کر دیکھوں کہ لندن کیسا شہر ہے۔ (۲۵)

اب اٹھارہ برس کی عمر میں انگلستان پہنچا۔......... ہر چیز اجنبی نظر آتی۔
— یہاں کے لوگ، اُن کے طور طریقے یہاں تک کہ اُن کے گھر بھی۔۔ میں
انگریزی آداب و رسوم کے معاملے میں بالکل مبتدی تھا۔ اور مجھے ہر وقت احتیاط
سے کام لینا پڑتا تھا۔ ایک اور مصیبت یہ تھی کہ میں ترکاری کے سوا اور کچھ نہ کھا سکتا تھا

کا عہد کر چکا تھا۔ جو کھانے میں کھا سکتا تھا وہ پھیکے سیٹھے لگتے تھے۔ غرض عجب مخمصے میں تھا۔ نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن۔ انگلستان میں رہنا میرے بس سے باہر معلوم ہوتا تھا۔ اور ہندوستان واپس جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دل کے اندر سے یہ آواز آتی تھی کہ اب جب تم آگئے ہو تو کسی نہ کسی طرح یہ تین سال پورے کرو۔ (۱-۳۱)

مکان والی حیران تھی کہ میرے لئے کیا چیز پکائے ...... میرے دوست[1] مجھے اکثر سمجھاتے تھے کہ گوشت کھایا کرو۔ مگر میں ہمیشہ اپنے عہد کا عذر پیش کر کے چپ سادھ لیتا تھا ...... ایک دن اُن دوست نے مجھے بینتھم کی کتاب "نظریہ افادیت" پڑھ کر سنانی شروع کی۔ میں بہت چکرایا۔ عبارت اتنی مشکل تھی کہ میری سمجھ میں نہ آتی۔ میں نے کہا۔ "مجھے تو معاف ہی رکھئے۔ یہ دقیق مسئلے میرے بس کے نہیں۔ میں مانتا ہوں کہ گوشت کھانا ضروری ہے۔ مگر میں اپنا عہد نہیں توڑ سکتا۔ اس میں بحث کی گنجائش نہیں۔" (۲-۳۲)

میں روز دس بارہ میل کا چکر لگاتا تھا۔ اور کسی ریستوران میں جا کر روٹی سے پیٹ بھر لیتا تھا۔ مگر طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔ اس روزانہ گشت کے دوران میں ایک دن مجھے نباتاتی (ویجیٹیرین) کھانا ریستوراں میں مل گیا۔ اُسے دیکھ کر مجھے ایسی خوشی ہوئی۔ جیسے کسی بچے کو اپنے من بھاتی چیز پاکر ہوتی ہے۔ اس کے اندر داخل ہونے سے پہلے مجھے دروازے کے قریب ایک شیشے کی کھڑکی کے نیچے کچھ کتابیں نظر آئیں جو بکری کے لئے رکھی تھیں۔ ان میں سے سالٹ کی کتاب "نباتاتی مشرب کی حمایت" میں نے ایک شلنگ میں خریدی اور سیدھا کھانے کے کمرے میں پہنچا۔ انگلستان آنے کے بعد یہ پہلا دن تھا کہ میں نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ آخر خدا نے میری مدد کی۔

---

[1] ایک صاحب جن سے مہاتما گاندھی جی رچمنڈ میں ایک مہینہ رہے تھے۔

میں نے سالٹ کی کتاب اول سے آخر تک پڑھی اور مجھ پر اس کا بہت اثر ہوا۔ جس روز سے میں نے یہ کتاب پڑھی۔ میں دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں نے اپنی مرضی سے نباتاتی مشرب اختیار کیا۔ میں نے اس دن کو دعائیں دیں۔ جب میں نے اپنی ماں کے سامنے گوشت نہ کھانے کا عہد کیا تھا۔ اب تک میں گوشت سے پرہیز صرف سچائی کی خاطر کرتا تھا۔ اس عہد کو نبھانے کے لئے جو میں نے والدہ سے کیا تھا۔ مگر میرے دل میں یہ خواہش تھی کہ ہر ہندوستانی گوشت کھانے لگے اور مجھے انتظار تھا کہ کب وہ گھڑی آئے جب میں کھلم کھلا گوشت کھاؤں اور دوسروں کو بھی اس مبارک کام میں اپنے ساتھ شریک کروں۔ اب میں نے نباتاتی مشرب اختیار کیا اور اس کے پرچار کو اپنا دھرم بنا لیا۔(۲۸)

جو شخص کوئی نیا مذہب اختیار کرتا ہے اس میں اس شخص سے زیادہ جوش ہوتا ہے جس کا وہ آبائی مذہب ہے۔ نباتاتی مشرب انگلستان کے لوگوں کے لئے ایک نیا عقیدہ تھا اور میرے لئے بھی، کیونکہ میں کہہ چکا ہوں کہ پہلے میں شدت سے گوشت کھانے کا قائل تھا۔ اور نباتاتی مشرب کو میں نے ایک ذہنی عقیدے کے طور پر ابھی حال ہی میں اختیار کیا تھا۔ نئی عقیدت کے جوش میں میں نے لندن کے اس حصے میں جس میں رہتا تھا ایک نباتاتی کلب قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ سر اڈون آرنلڈ کو جو وہیں رہتے تھے میں نے صدر بنایا۔ اور رسالہ "ویجیٹیرین" کے ایڈیٹر اولڈ فیلڈ کو نائب صدر۔ میں خود سکریٹری بنا۔ کلب چند مہینے چلا اور پھر اس وجہ سے بند ہو گیا کہ میں اپنی تبدیلی مقام کی عادت کی بدولت اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلا گیا۔(۲۹)

ذرا آگے چل کر میں انگلستان کی نباتاتی انجمن کی مجلس کا ممبر منتخب ہوا۔ اور پابندی سے اس کے ہر جلسے میں شریک ہونے لگا۔ مگر خاموش بیٹھا رہتا تھا...... یہ بات نہ تھی کہ میرا بولنے کو جی نہ چاہتا ہو۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے خیالات کیوں کر ظاہر کروں...... جب تک میں انگلستان میں رہا۔ مجھ میں یہ حجاب باقی رہا۔ اگر

میں کسی سے ملاقات کرنے کے لئے جاتا تھا اور وہاں پانچ چھ آدمی موجود ہوتے تھے تو میری زبان نہ کھلتی تھی۔ (۴۰)

مگر حقیقت یہ ہے کہ اس خلقی حجاب سے سوا اس کے کہ کبھی کبھی میرا مذاق اڑایا گیا مجھے اور کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ ہر چیز میرے لئے سراسر مفید ثابت ہوئی۔ رک رک کر بولنے سے ایک زمانہ تھا میں مجھے تکلیف ہوتی تھی مگر اب لطف آتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس نے لفظوں کے استعمال میں کفایت سے کام لینا سکھایا۔ (۴۱)

سنہ ۱۸۹۰ء میں پیرس میں ایک عظیم الشان نمائش ہوئی۔ میں نے اخباروں میں پڑھا تھا کہ اس کی تیاریاں بڑی دھوم دھام سے ہو رہی ہیں۔ یوں بھی مجھے پیرس دیکھنے کا شوق تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اس وقت پیرس ہو آؤں تو ایک پنتھ دو کاج کا مضمون ہوگا۔ نمائش کی کشش کا ایک خاص سبب ایفل ٹاور تھا جو خالص لوہے کا اور ایک ہزار فٹ اونچا تھا۔ ظاہر ہے کہ اور بھی بہت سی دلچسپ چیزیں تھیں مگر یہ مینار سب سے بڑھ گیا تھا کیونکہ اس وقت تک لوگ سمجھتے تھے کہ اتنا اونچا مینار قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ (۴۲)

مجھے نمائش کے بارے میں اس کے سوا کچھ یاد نہیں کہ بہت بڑی تھی اور اس میں طرح طرح کی دلچسپ چیزیں تھیں۔ ایفل ٹاور کا مجھے اچھا خاصا دھیان ہے کیونکہ میں دو تین بار اس پر چڑھا تھا۔ پہلی منزل پر ایک ریستوران تھا اور صرف یہ کہنے کے لئے کہ میں نے اتنی بلندی پر کھانا کھایا ہے۔ مجھے سات شلنگ دوپہر کے کھانے پر ضائع کرنے پڑے۔ پیرس کے پرانے گرجے مجھے اب تک یاد ہیں، ان کی رفعت اور شوکت اور امن و سکون کی فضا جس نے دیکھی ہے وہ کبھی بھول نہیں سکتا۔ نوتردام کی حیرت انگیز عمارت اور سنگ تراشی کے خوبصورت نمونوں کا نقش ہے۔ اس کی اندرونی آرائش

کی گئی ہے۔ گہرا نقش دل سے نہیں مٹ سکتا۔ مجھے اُس وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ جن لوگوں نے کروڑ دل خرچ کر کے یہ گرجے بنوائے اُن کے دل میں یقیناً خدا کی محبت ہوگی۔ (۴۳)

میں چند الفاظ ایفل ٹاور کے بارے میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اب اِس سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ مگر اُس زمانے میں اُس کی میں تعریف بہت سنتا تھا اور مذمت بھی۔ مجھے یاد ہے کہ اُس کو بُرا کہنے والوں میں ٹالسٹائی پیش پیش تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ایفل ٹاور انسان کی دانشمندی کی نہیں بلکہ اُس کی حماقت کی یادگار ہے۔ وہ تمباکو کو دُنیا کا سب سے بُرا نشہ کہتا تھا۔ کیونکہ تمباکو پینے والے اُس کے خیال میں ایسے ایسے جرم کر بیٹھتے ہیں جن کے ارتکاب کی شرابیوں کو کبھی جرأت نہیں ہوتی۔ شراب تو انسان کے حواس کو بالکل ضبط کر دیتی ہے۔ مگر تمباکو سے اُس کا تخیل اس طرح دھندلا ہو جاتا ہے کہ وہ خیالی پلاؤ پکاتے اور بادِ ہوا عمارتیں بنانے لگتا ہے۔ ایفل ٹاور اُس کے خیال میں ایسا ہی کارنامہ ہے جو انسان تمباکو کے نشے میں کر دکھاتا ہے۔ اِس مینار میں آرٹ کی کوئی خوبی نہیں۔ اِس سے نمائش کی خوبصورتی میں کوئی حقیقی اضافہ نہیں ہوا۔ لوگ، اُسے جوق جوق دیکھنے کو آتے تھے اور اُس پر چڑھتے تھے، اِس لئے کہ وہ ایک نئی چیز تھی اور جسامت میں بے نظیر تھی؛ اُسے نمائش کا کھلونا کہنا چاہیئے۔ جب تک ہم میں بچپن باقی ہے۔ ہم کھلونوں کو دیکھ کر کھسل پڑتے ہیں۔ یہ مینار اِس بات کا ثبوت ہے کہ ہم سب بچے ہیں اور دکھاوے کی چیزوں پر جان دیتے ہیں اِسی کو ہم ایفل ٹاور کا مقصد سمجھ سکتے ہیں۔ (۴۴)

میں نے اپنے امتحان پاس کر لیے۔ ۱۰؍جون ۱۸۹۱ء کو مجھے بیرسٹری کی سند ملی اور ۱۱؍جون کو میرا نام ہائی کورٹ میں درج ہوا۔ ۱۲؍جون کو میں جہاز میں بیٹھ کر

ہندوستان روانہ ہو گیا۔(۴۵)

میرے بڑے بھائی نے مجھ سے بہت کچھ امیدیں باندھ رکھی تھیں۔ اُن کو
مال و دولت، عزت و شہرت کی بڑی آرزو تھی۔ وہ بڑے فراخ دل تھے۔ اور حد سے
زیادہ فیاض۔ اس کے ساتھ ان کی طبیعت میں بڑی سادگی تھی اس لیے اُن کی
بہت سے لوگوں سے دوستی تھی انھیں امید تھی کہ ان دوستوں کے ذریعہ سے
مجھے مقدمے دلوائیں گے۔ انھوں نے خواہ مخواہ یہ فرض کر لیا تھا کہ میری وکالت خوب
چلے گی۔ اور اس امید پر گھر کا خرچ بڑھا لیا تھا۔ میری وکالت کے لیے زمین ہموار
کرنے میں انھوں نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی (۴۶)

مگر میرے لیے بمبئی میں چار پانچ مہینے سے زیادہ رہنا ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ
خرچ روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور آمدنی کچھ نہ تھی اس طرح میری زندگی شروع ہوئی
میں نے دیکھا کہ بیرسٹری کا پیشہ میرے لئے بڑی ٹیڑھی کھیر ہے ٹیپ ٹاپ بہت اور
علم تھوڑا۔ مجھے اپنی ذمہ داری کا اتنا احساس تھا کہ میں اس کے بوجھ سے دبا جاتا تھا (۴۷)

آخر مایوس ہو کر میں بمبئی سے راجکوٹ آ گیا۔ اور یہاں اپنا دفتر قائم کیا۔ یہاں
میرا کام اچھا خاصا چلنے لگا۔ درخواستوں اور عرضداشتوں کے مسودے لکھ کر میں اوسطاً
تین سو روپے ماہانہ کما لیتا تھا۔(۴۸)

اس عرصہ میں ایک میمن نے جن کی دوکان پوربندر میں تھی۔ میرے بھائی سے کہلا
بھیجا۔ "ہم جنوبی افریقہ میں تجارت کرتے ہیں۔ ہمارا بڑا کاروبار ہے اور آج کل وہاں کی
ہماری طرف سے ایک بہت بڑا مقدمہ دائر ہے جس میں ہم نے چالیس ہزار پونڈ کا دعوے
کیا ہے۔ یہ مقدمہ بہت دن سے چل رہا ہے ہم نے بہترین وکیلوں اور بیرسٹروں کی
خدمات حاصل کی ہیں اگر آپ اپنے بھائی کو وہاں بھیج دیں تو اُن کے لئے بھی اچھا ہوگا
اور ہمارے لیے بھی۔ وہ ہمارے وکیلوں کو ہم سے بہتر ہدایات دے سکیں گے۔ اُن کا یہ

فائدہ ہے کہ آپ نئے ملک کی سیر کر لیں گے اور نئے نئے لوگوں سے ملاقات ہو جائے گی۔" (۴۹)

یہ بیرسٹر کی حیثیت سے جانا تو کہا نہیں جا سکتا۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ میں دوکان کے ایک ملازم کی حیثیت سے جا رہا تھا۔ مگر مجھے تو یہ فکر تھی کہ کسی طرح ہندوستان سے نکلوں۔ پھر یہ لالچ تھا کہ نیا ملک دیکھنے میں آئے گا اور نیا تجربہ حاصل ہوگا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ ایک سو پانچ پونڈ بھائی صاحب کو بھیج سکوں گا جس سے گھر کے خرچ میں مدد ہو گی۔ غرض میں نے بغیر کسی حجت کے ان شرطوں کو منظور کر لیا اور جنوبی افریقہ جانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ (۵۰)

جنوبی افریقہ جاتے وقت مجھے جدائی کا وہ درد محسوس نہیں ہوا جو انگلستان جاتے وقت ہوا تھا۔ اب میری والدہ دنیا سے اٹھ چکی تھیں۔ میں دنیا دیکھ چکا تھا۔ اور غیر ملکوں کے سفر کا تھوڑا بہت تجربہ رکھتا تھا۔ پھر راجکوٹ سے بمبئی جانا تو ہوتا ہی رہتا تھا۔

اس بار صرف مجھے اپنی بیوی کی جدائی شاق گزری۔ انگلستان سے واپس آنے کے بعد ہمارے ہاں ایک اور بچہ ہو چکا تھا۔ ہم دونوں کی محبت ابھی شہوانی خواہش سے پاک نہیں ہوئی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ ہوتی جا رہی تھی۔ جب سے میں یورپ سے واپس آیا تھا، مجھے اپنی بیوی کے ساتھ رہنے کا بہت کم موقع ملا تھا۔ اب تک جیسا کچھ برا بھلا مجھ سے ممکن تھا انھیں پڑھاتا تھا۔ اور بعض اصلاحوں میں ان کی مدد کرتا تھا۔ اس لیے ہم دونوں کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ ہم زیادہ دن تک اکٹھے رہیں تاکہ یہ اصلاحیں جاری رکھ سکیں۔ مگر میرے افریقہ جانے کے شوق میں فراق کا صدمہ سہنے کو تیار ہو گیا۔ (۵۱)

نٹال کی بندرگاہ ڈربن ہے۔ اسے پورٹ نٹال بھی کہتے ہیں۔ جب ہمارا

جہاز بندرگاہ کے قریب پہنچا تو میں اُن لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو اپنے دوستوں کو لینے کے لیے جہاز پر آئے تھے۔ مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ہندوستانی کچھ عزت کی نظر سے نہیں دیکھے جاتے۔ عبداللہ سیٹھ کے جاننے والوں کا جو برتاؤ اُن کے ساتھ تھا۔ اس سے ایک احساس برتری ظاہر ہوتا تھا جس سے میرے دل پر چوٹ لگی مگر خود عبداللہ سیٹھ اُس کے عادی ہو گئے تھے۔ مجھے لوگ تجسس کے انداز میں دیکھ رہے تھے اپنے لباس کی وجہ سے میں اور ہندوستانیوں سے ممتاز نظر آتا تھا۔ میں فراک کوٹ پہنے تھا اور سر پر پگڑی باندھے تھا (۵۲)

میرے آنے کے دوسرے تیسرے دن عبداللہ سیٹھ مجھے ڈربن کی عدالت دکھانے لے گئے۔ وہاں اُنہوں نے مجھے کئی آدمیوں سے ملوایا۔ اور پھر اپنے وکیل کے پاس بٹھا دیا۔ مجسٹریٹ مجھے دیر تک گھورتا رہا۔ آخر میں اُس نے مجھ سے کہا "پگڑی اُتار دو۔" میں نے اس سے انکار کر دیا۔ اور عدالت سے اُٹھ کر چلا آیا

ڈربن پہنچنے کے ساتویں آٹھویں دن میں وہاں سے (پریٹوریا) روانہ ہو گیا۔ میرے لئے اول درجہ کا ٹکٹ لیا گیا...... نو بجے رات کو گاڑی نٹال کے دارالحکومت میرتزبرگ پہنچی۔ بستر اسی اسٹیشن پر دئے جاتے تھے۔ ایک ریل کا ملازم آیا اور اُس نے مجھ سے پوچھا۔ "آپ کو بستر تو نہیں چاہئے؟" میں نے کہا۔ "نہیں، میرے پاس موجود ہے۔" وہ چلا گیا۔ اور اُس کے بعد ایک دوسرے (چمڑے کا) مسافر آیا۔ اُس نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ میں کالا آدمی ہوں۔ یہ بات اُسے کھٹکی۔ وہ فوراً چلا گیا۔ اور تھوڑی دیر میں وہ ایک ریلوے ملازم کو ساتھ لے کر آیا۔ اُنھوں نے تو مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ مگر ایک اور افسر میرے پاس آکر کہنے لگا۔۔۔

"تمہیں گارڈ کے ڈبے میں بیٹھنا پڑے گا۔"

میں نے کہا۔ "مگر میرے پاس تو اول درجے کا ٹکٹ ہے۔"
اُس نے کہا۔ "اِس سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں جو تم سے کہتا ہوں کہ تمھیں گارڈ کے ڈبے میں چلنا پڑے گا۔"
"اور میں تم سے کہتا ہوں کہ مجھے ڈربن میں اُس ڈبے میں بیٹھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اور میں اِسی میں جاؤں گا۔"
"ہرگز نہیں جا سکتے۔ تمھیں یہ ڈبہ خالی کرنا پڑے گا۔ اور میں پولیس کے سپاہی کو بُلوا کر تمھیں نکلوا دوں گا۔
"تمھیں اختیار ہے میں اپنی مرضی سے تو جاؤں گا نہیں۔"
سپاہی آیا۔ اور اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ میرا اسباب بھی اُتار دیا گیا میں نے دوسرے ڈبے میں جانے سے انکار کر دیا۔ اور گاڑی چل دی۔ میں جا کر ویٹنگ روم میں بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا ہینڈ بیگ اُٹھا لیا تھا۔ باقی سامان جہاں پڑا تھا۔ وہیں چھوڑ دیا تھا اور ریل والوں نے اُسے اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔
جاڑے کا موسم تھا، جنوبی افریقہ کے بلند خطوں میں کڑاکے کا جاڑا پڑتا ہے۔ میرٹزبرگ بہت اونچی جگہ ہے یہاں بڑی سخت سردی تھی۔ میرا اوورکوٹ میرے اسباب میں تھا۔ لیکن مجھے مانگنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ کہ کہیں ذلیل نہ ہونا پڑے۔ اِس لئے میں بیٹھا کانپتا رہا۔ کمرے میں روشنی نہیں تھی۔ آدھی رات کے قریب ایک اور مسافر آیا اور اُس نے چاہا کہ مجھ سے باتیں کرے۔ میں ایسی حالت میں کیا خاک باتیں کرتا۔
میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب میرا فرض کیا ہے۔ میں اپنے حقوق کے لیے لڑوں یا اِسی وقت ہندوستان لوٹ جاؤں۔ یا چُپ چاپ یہ ذلت برداشت کر کے پریٹوریا پہنچوں اور مقدمہ ختم ہونے کے بعد ہندوستان کی واپسی کا قصد کروں۔ میں نے دل میں کہا۔ جس کام کا میں نے ذمہ لیا ہے۔ اسے پورا کئے بغیر ہندوستان جانا بڑی

بزدلی ہے۔ مجھے جو تکلیف اُٹھانا پڑی یہ ایک سطحی چیز ہے ـــــ محض ایک علامت ہے رنگ کے تعصب کی جو ایک مہلک مرض کی صورت میں سطح کے نیچے موجود ہے اگر ہو سکے تو مجھے یہ کوشش کرنا چاہئے کہ اِس مرض کا پورا ازالہ ہو جائے اور اِس میں جتنی تکلیفیں پیش آئیں سب کو جھیلنا چاہئے۔ میرے ساتھ جو بدسلوکی کی گئی ہے اُس کی تلافی کی کوشش صرف اِس حد تک جائز ہے۔ جہاں تک نسلی تعصب کو دور کرنے میں مدد ملے۔

چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جو پہلی گاڑی ملے گی اِس سے میں پریٹوریا چلاؤں گا۔ (۵۴)

میرا پہلا قدم یہ تھا کہ میں نے پریٹوریا کے سارے ہندوستانیوں کا جلسہ کر کے ایک تقریر کی تاکہ اُنہیں یہ اندازہ ہو جائے کہ ٹرانسوال میں وہ کس حالت میں رہتے ہیں (۵۵)

میں نے اِس جلسے میں جو تقریر کی وہ گویا۔ ساری عمر میں میری پہلی تقریر تھی۔ اس کا موضوع تھا۔ کاروبار میں سچائی سے کام لینا۔ میں اچھی طرح تیار ہو کر گیا۔ میں نے ہمیشہ تاجروں کو یہ کہتے سُنا تھا کہ کاروبار میں سچائی سے کام نہیں چلتا۔ میں اِس بات کو نہ اِس وقت مانتا تھا۔ نہ اب ماننے کو تیار ہوں۔ اب بھی بعض تاجر دوستوں کا خیال ہے کہ کاروبار اور سچائی یہ دو چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ کاروبار عملی چیز ہے۔ سچائی مذہب سے تعلق رکھتی ہے اور عملی امور کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں اُن کے نزدیک کھری سچائی کا تو کاروبار میں کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ البتہ ایک مناسب حد تک سچائی برتنے کی بات کی جا سکتی ہے۔ میں نے اپنی تقریر میں اِس خیال کی سختی سے مخالفت کی اور اُن تاجروں کے دل میں اِس احساس کو اُبھارا کہ اُن پر دُہرا فرض عاید ہوتا ہے۔ میں نے کہا غیر ملک میں رہ کر ہم پر یہ ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ سچائی اور ایمانداری سے کام لیں۔ کیوں کہ یہاں کے لوگ ہم چند ہندوستانیوں کے

طرزِ عمل کو دیکھ کر ہمارے کروڑوں ہم وطنوں کی سیرت کا اندازہ کریں گے۔ (۵۶)

سڑک کی پٹڑی پر چلنے کے بارے میں جو ضابطہ (ٹرانسوال میں) تھا۔ اس سے مجھے بڑی تکلیف اٹھانی پڑی۔ میں ہمیشہ ٹہلنے کے لئے پریسیڈنٹ اسٹریٹ سے ہوتا ہوا کھلے میدان میں نکل جایا کرتا تھا۔ پریسیڈنٹ کروگر کا مکان اسی سڑک پر تھا۔ یہ ایک معمولی سا مکان تھا جس کے ساتھ باغ تک نہ تھا۔ اس میں اور دوسرے مکانوں میں مشکل سے تمیز کی جا سکتی تھی۔ پریٹوریا کے بہت سے لکھپتیوں کے مکان اس سے کہیں زیادہ شاندار تھے اور ان کے احاطوں میں باغ لگے ہوئے تھے۔ پریسیڈنٹ کروگر کی سادگی ضرب المثل تھی۔ صرف مکان پر پولیس کا پہرا دیکھنے سے پتہ چل سکتا تھا کہ یہ کسی بڑے حاکم کا مکان ہے۔ میں اکثر و بیشتر پٹڑی پر پہرے والوں کے قریب سے جایا کرتا تھا۔ اور کبھی روک ٹوک نہیں ہوتی تھی۔

مگر پہرے والے بدلتے رہتے تھے۔ ایک بار ایک شخص نے بغیر اس کے کہ پہلے سے آگاہ کرتا یا پٹڑی سے اترنے کے لئے کہتا۔ مجھے دھکا دے کر اور لات مار کر سڑک پر دھکیل دیا۔ ظاہر ہے کہ مجھے بڑا رنج ہوا۔ مگر قبل اس کے کہ میں اس شخص سے اس برتاؤ کا سبب پوچھوں، مسٹر کوٹس نے جو اتفاق سے کہیں وقت گھوڑے پر سوار ادھر سے گزر رہے تھے۔ مجھے پکار کر کہا۔

"گاندھی! میں نے سارا واقعہ دیکھا ہے اگر تم اس شخص پر مقدمہ چلاؤ۔ تو میں خوشی سے گواہی دوں گا۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ تم پر اس بدتمیزی سے حملہ کیا گیا۔"

میں نے کہا۔ "آپ کیوں افسوس کریں۔ اس غریب کو کیا معلوم کہ یہ کون شخص ہے۔ اس کے نزدیک سب کالے آدمی برابر ہیں۔ غالباً وہ حبشیوں کے ساتھ اسی طرح کا برتاؤ کرتا ہے۔ جیسا اس نے میرے ساتھ کیا۔ میں نے یہ اصول بنا لیا

ہے کہ اپنے ذاتی معاملے میں کبھی عدالت سے چارہ جوئی نہیں کروں گا۔ اِس لئے میرا ارادہ اُس پر مقدمہ چلانے کا نہیں۔" (۵۷)

اِس واقعہ سے میرے دل میں نو آباد ہندوستانیوں کا درد بڑھ گیا......

اِس طرح مجھے اُن کی مشکلات کا اندازہ کرنے کا موقع ملا اور وہ بھی دوسروں سے سُن کر یا کتابوں میں پڑھ کر نہیں بلکہ ذاتی تجربہ کی بنا پر۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ جنوبی افریقہ کسی خوددار ہندوستانی کے رہنے کی جگہ نہیں اور میں دن رات اِس فکر میں رہنے لگا۔ کہ اِس صورتِ حال میں اصلاح کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے (۵۸)

پریٹوریا کا ایک سال کا قیام میری زندگی کا سب سے قیمتی تجربہ تھا۔ یہیں مجھے قومی خدمت کے طریقے سیکھنے کا موقع ملا اور اُسے انجام دینے کی تھوڑی بہت قابلیت پیدا ہوئی۔ یہیں وہ مذہبی روح جو مجھ میں اندر تھی۔ ایک جیتی جاگتی قوت بنی اور یہیں مجھے وکالت کے پیشے سے صحیح واقفیت حاصل ہوئی۔ (۵۹)

مجھ پر یہ حقیقت کھل گئی کہ وکیل کا اصلی کام یہ ہے کہ دونوں فریقوں کو جن میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ ملا دے۔ یہ سبق میرے دل پر ایسا نقش ہوا کہ بیس سال کی وکالت کے زمانے میں میرا وقت زیادہ تر سینکڑوں مقدموں میں آپس میں راضی نامہ کرانے میں صَرف ہوا۔ اِس میں روپے پیسے کے لحاظ سے بھی میرا نقصان نہیں ہوا۔ اور اِس میں تو کوئی شُبہ نہیں کہ میری روح ہلاکت سے محفوظ رہی۔" (۶۰)

دل کی سچی اور پُرخلوص آرزو ہمیشہ پوری ہوتی ہے مجھے خود اِس کا بارہا تجربہ ہوا ہے۔ غریبوں کی خدمت کی مجھے ہمیشہ سے آرزو تھی۔ چنانچہ میں اُن میں گھل مل کر رہا۔ اور اُن ہی کا ہو رہا۔" (۶۱)

ابھی مجھے وکالت شروع کیے دو یا تین مہینے ہوئے تھے۔ اور کانگریس بالکل ابتدائی حالت میں تھی۔ کہ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ تامل دیس کا ایک ہندوستانی

چیتھڑے لگائے اپنا پھٹیا ہاتھ میں لیے میرے سامنے کھڑا کانپ رہا ہے اور رو رہا ہے اُس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے ہیں۔ اور اُس کے مُنہ سے خون بہہ رہا ہے۔ مجھے اُس کا سارا احوال اپنے محرر سے معلوم ہوا۔ جو خود تامل ہوئیں کا تھا۔ آنے والے کا نام بالاسندرم تھا اور یہ نٹال کے ایک مشہور یورپین کے ہاں پابند مزدور تھا۔ اُس کے آقا نے غصے میں آپے سے باہر ہو کر اُسے اتنا مارا کہ اُس کے دو دانت ٹوٹ گئے۔

میں نے اُسے ڈاکٹر کے پاس بھیجا۔ اُن دِنوں وہاں صرف دو یورپین ڈاکٹر تھے میں صرف ایک سرٹیفکیٹ چاہتا تھا جس سے معلوم ہو کہ بالاسندرم کی چوٹ کی کیا نوعیت ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ لے کر میں فوراً بالاسندرم کے ساتھ مجسٹریٹ کی کچہری میں گیا اور بیان حلفی داخل کرا دیا۔ مجسٹریٹ اُسے پڑھ کر آگ ہو گیا۔ اور اُس نے فوراً مالک کے نام سمن جاری کر دیا۔ (۶۲)

بالاسندرم کے معاملہ کی خبر ہر پابند مزدور کو ہو گئی اور میں ان مزدوروں کا دوست سمجھا جانے لگا۔ مجھے ان لوگوں سے رابطہ پیدا ہونے سے بڑی خوشی ہوئی میرے دفتر میں مزدوروں کا تانتا بندھ گیا۔ اور مجھے اُن کے دُکھ سُکھ سے واقف ہونے کا بہت اچھا موقع ملا۔ (۶۳)

یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہ آئی کہ لوگ اپنے ہم جِنسوں کی ذلت میں اپنی عزت کیوں کر سمجھتے ہیں (۶۴)

میں قومی خدمت میں محو ہو گیا اس کا اصلی سبب معرفت نفس کی آرزو تھی۔ میں نے خدمت کو اپنا دین دھرم بنا لیا تھا۔ یہ سمجھ کر کہ یہی معرفت الٰہی کا ذریعہ ہے اور خدمت کے معنی میں ہندوستان کی خدمت سمجھنا تھا کیوں کہ اس کا موقع مجھے بغیر تلاش کیے خود بخود مل گیا تھا۔ اور میں اِس کے لیے موزوں بھی تھا۔ میں جنوبی افریقہ کی سیاحت کا لُطف اُٹھانے۔ کاٹھیاواڑ کی سازشوں سے نجات پانے

اور روزی کمانے کی نیت سے آیا تھا۔ مگر جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے۔ میں یہاں آکر معرفتِ الٰہی اور معرفتِ نفس کی کوششوں میں معروف ہوگیا۔(۶۵)

برطانوی آئین کا متبادوفاداری میں تھا اتنا میں نے آج تک کسی کو نہیں دیکھا۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ اس وفاداری کی تہہ میں حق کی محبت تھی۔ مجھ سے وفاداری کا یا کسی اور نیک صفت کا جھوٹا اظہار کبھی نہ ہوسکا۔ نٹال میں جن جلسوں میں میں جاتا تھا۔ وہاں "نیشنل انیتھم" (انگریزوں کا قومی ترانہ) گایا جاتا تھا۔ میں اس زمانہ میں اپنا فرض سمجھتا کہ اس گیت کے گانے میں شرکت کروں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مجھے برطانوی سلطنت کی خرابیوں کا علم نہ تھا۔ مگر ان کے باوجود میں اسے مجموعی طور پر قابلِ قبول سمجھتا تھا۔ ان دنوں میرا یہ خیال تھا کہ بہ حیثیت مجموعی برطانیہ کی حکومت رعایا کے لیے مفید ہے۔

رنگ اور نسل کا جو تعصب مجھے جنوبی افریقہ میں نظر آیا، اسے میں برطانوی روایات سے منافی سمجھتا تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ یہ مقامی اور عارضی چیز ہے۔ اس لیے میں تاجِ برطانیہ کی وفاداری میں انگریزوں سے بازی لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے بڑی محنت سے "نیشنل انیتھم" کی لے سیکھی اور جب کبھی یہ گیت گایا جاتا تھا میں برابر ساتھ دیتا تھا۔ بغیر بناوٹ اور نمائش کے وفاداری کے اظہار کی جو تقریب بھی ہو، میں اس میں ضرور شرکت کرتا تھا۔

میں نے اپنی ساری عمر میں اس وفاداری سے کوئی بیجا فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس کے ذریعہ اپنی ذاتی اغراض پوری کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ تو میرے لیے ایک فرض کی حیثیت رکھتی تھی جسے میں بغیر کسی صلے کے پورا کرتا تھا۔(۶۶)

اب مجھے جنوبی افریقہ میں تین سال ہو چکے تھے۔ میں یہاں کے لوگوں سے اچھی طرح سے واقف ہو چکا تھا۔ اور یہ بھی مجھے خوب جان گئے تھے ۱۸۹۶ء

میں اُن سے چھ مہینے کے لیے گھر جانے کی اجازت مانگی کیوں کہ اب مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ جنوبی افریقہ میں مجھے بہت دن رہنا ہے۔ میری وکالت اچھی خاصی چلتی تھی اور مجھے یہ احساس ہوگیا تھا کہ لوگوں کو میری ضرورت ہے۔ اس لیے میں نے ارادہ کر لیا کہ گھر جا کر بیوی بچوں کو لے آؤں اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لوں۔ (۶۷)

یہ میرا پہلا سفر تھا، جس میں بیوی بچّے ساتھ تھے...... اُن دنوں میرا یہ عقیدہ تھا کہ ہم لوگوں کو اپنے لباس اور آداب معاشرت میں جہاں تک ہو سکے اہلِ یورپ کی تقلید کرنا چاہیئے۔ تاکہ ہم مہذب معلوم ہوں۔ میں سمجھتا تھا کہ صرف اسی طریقے سے ہم تھوڑا بہت اثر پیدا کر سکتے ہیں اور جب تک کچھ اثر نہ ہو قوم کی خدمت کرنا ناممکن ہے....... اُسے مدنظر رکھ کر میں نے اپنی بیوی بچوں کے لباس کی وضع معین کی۔ اُن دنوں ہندوستان میں پارسی سب سے زیادہ مہذب سمجھے جاتے تھے۔ اِس لیے جب بالکل یورپین وضع اختیار کرنا نامناسب معلوم ہوا تو ہم نے پارسیوں کی وضع اختیار کی........ اِسی مصلحت سے اور کچھ اور بھی زیادہ بردلی سے میرے بیوی بچّوں کو چھری کانٹے کا استعمال شروع کرنا پڑا۔ جب میرا جوش تہذیب کی اِن نشانیوں کے بارے میں ٹھنڈا پڑنے لگا۔ تو اُنھوں نے بھی چھری کانٹے کو خیرباد کہی۔ غالبًا نئی وضع کے اختیار کرنے کے بعد اُنھیں اُس کے چھوڑنے میں بھی اتنی ہی دقّت پیش آئی ہوگی۔ مگر اب میں دیکھتا ہوں کہ تہذیب کا زرق برق لبادہ اتار پھینکنے کے بعد ہم اپنے آپ کو ہلکا محسوس کرتے ہیں۔ اور اطمینان اور آسانی سے سانس لے سکتے ہیں۔ (۶۸)

۱۸ یا ۱۹ دسمبر کو جہاز ڈربن میں لنگر انداز ہوا۔ (۶۹)
ہمارے جہاز کو حکیم ملا کہ بمبئی سے روانگی کے تیئیسویں دن تک قرنطینے

میں رہے لیکن اِس حکم میں حفظانِ صحت کے سوا دوسری مصلحتیں بھی تھیں۔
ڈربن کے گورے باشندے یہ ایجی ٹیشن کر رہے تھے کہ ہم سب اپنے ملک کو لوٹا دیئے جائیں۔ ہمیں جو حکم ملا تھا۔ اُس کی ایک وجہ یہ بھی تھی.....
دراصل قرنطینے کا مقصد یہ تھا کہ کمپنی کے ایجنٹوں یا مسافروں کو ڈرا دھمکا کر جہاز ہندوستان واپس کر دیئے جائیں۔ اب ہمارے پاس تہدید آمیز پیام پہنچنے لگے ـــ "اگر تم واپس نہ جاؤ گے تو ہم تمہیں سمندر میں ڈبو دیں گے لیکن اگر تم واپسی پر راضی ہو جاؤ تو ممکن ہے کہ تمہارا کرایہ بھی لوٹا دیا جائے۔" میں برابر اپنے جہاز کے مسافروں سے ملتا رہتا تھا۔ اور اُن کی دل دہی کیا کرتا تھا۔ (۷۰)
آخر ایک دن میرے پاس اور دوسرے مسافروں کے پاس یہ الٹی میٹم پہنچا کہ اگر تم اپنی جان کی سلامتی چاہتے ہو تو جو کچھ ہم کہتے ہیں چُپ چاپ مان لو۔ اس کے جواب میں ہم سب نے یہ کہلا بھیجا کہ ہمیں پورٹ نٹال میں اُترنے کا پورا حق ہے اور ہم نے جی میں ٹھان لی ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو ہم نٹال میں ضرور داخل ہونگے۔
تیئس دن پورے ہونے پر جہاز کو گودی میں آنے کی اور مسافروں کو اُترنے کی اجازت مل گئی (۷۱)

جیسے ہی ہم کنارے پر پہنچے لڑکوں نے مجھے پہچان لیا۔ اور گاندھی، گاندھی چلانے لگے۔ پانچ چھ آدمی اور دوڑے آئے۔ اور اُنھوں نے بھی لڑکوں کے ساتھ مل کر چیخ پکار مچائی........ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے۔ مجمع زیادہ ہوتا گیا یہاں تک کہ رستہ بالکل رُک گیا........ اب مجھ پر اینٹ پتھر اور گندے انڈوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ ایک شخص میری پگڑی لے بھاگا اور کچھ لوگ مجھے گھونسے اور لاتیں مارنے لگے مجھے غش آنے لگا۔ اور میں ایک مکان کے جنگلے کے سہارے کھڑا ہو گیا کہ ذرا دم لے لوں۔ مگر لوگوں نے اِسکا موقع نہیں دیا۔ اور مجھ پر گھونسے اور

مکے پڑنے شروع ہو گئے۔ اتفاق سے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی بیوی جو مجھ سے خوب واقف تھیں اُدھر سے گزر رہی تھیں۔ یہ بہادر خاتون میری مدد کے لیے آئیں اور اپنی چھتری کھول کر میرے اور مجمع کے درمیان حائل ہو گئیں۔ اس سے لوگوں کا ہاتھ رُکا۔ اس لیے کہ اگر مجھے مارتے تو مسز الیگزینڈر کو بھی چوٹ آتی۔"
مسٹر چیمبر لین نے جو اس زمانے میں وزیرِ نو آبادیات تھے۔ نٹال کی حکومت کو تار کے ذریعے ان لوگوں پر جنہوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا، مقدمہ چلانے کی ہدایت کی۔ مسٹر الیسکومب نے مجھے بلایا اور کہا۔ "مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ کو یہ تکلیفیں اُٹھانی پڑیں۔ آپ یقین کیجیے کہ مجھے آپ کی خفیف سی تکلیف بھی گوارا نہیں ...... اگر آپ حملہ کرنے والوں کو پہچان سکیں تو میں اس کے لیے تیار رہوں کہ اُنھیں گرفتار کر کے اُن پر مقدمہ چلائیں۔ مسٹر چیمبر لین نے بھی مجھ سے یہی خواہش کی ہے۔"

میں نے جواب دیا۔ "میں کسی پر مقدمہ چلانا نہیں چاہتا۔ ممکن ہے میں اِن میں سے ایک دو کو پہچان لوں۔ مگر انھیں سزا دلانے سے کیا فائدہ؟ اور میرے نزدیک تو ان لوگوں کا کوئی قصور نہیں۔ اُنھیں یقین دلایا گیا کہ میں نے ہندوستان میں نٹال کے یورپین باشندوں کے بارے میں مبالغہ آمیز بیان دیے اور اُنھیں بدنام کیا۔ اگر ان باتوں کو سُن کر اُنھیں غصہ آگیا۔ تو کون سی تعجب کی بات ہے؛ قصور جو کچھ ہے وہ ان کے لیڈروں کا یعنی خود آپ کا ہے آپ اِن کی صحیح رہنمائی کر سکتے تھے۔ مگر آپ نے خود رپورٹر کی خبروں پر بھروسہ کر کے یہ فرض کر لیا کہ میں نے ضرور مبالغے سے کام لیا ہوگا۔ جب لوگوں کو صحیح حالات معلوم ہوں گے تو اُنھیں اپنی حرکتوں پر ندامت ہوگی۔" (۳۰)

جس دن میں جہاز سے اُترنے والا تھا۔ اُسی روز زرد جھنڈا نیچا ہو گیا۔

"نٹال ایڈورٹا ئزر" کا نمائندہ مجھ سے سوال و جواب کرنے پہنچ گیا تھا۔ اُس نے مجھ سے بہت سی باتیں پوچھیں اور میں نے اُن تمام الزامات کی جو مجھ پر لگائے گئے تھے اچھی طرح تردید کر دی .... اِدھر سوال جواب کا شائع ہونا۔ اُدھر میرا حملہ آوروں پر مقدمہ چلانے سے انکار کرنا، اِن باتوں کا بڑا گہرا اثر ہوا اور ڈربن کے یورپین باشندے اپنی حرکتوں پر نادم ہوئے۔ اخباروں نے میرا بے قصور ہونا تسلیم کیا اور عوام کو ملامت کی۔ اِس لیے یہ حملہ آگے چل کر میرے لیے یعنی قومی مقصد کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ اس سے جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کا وقار بڑھ گیا اور میرے کام میں آسانی پیدا ہو گئی۔ (۴۴)

میری وکالت اچھی طرح چل رہی تھی۔ مگر یہ میرے اطمینان کے لیے کافی نہ تھا .... میرے دل میں یہ خلش تھی کہ خدمتِ خلق کا کوئی مستقل کام کر سکوں۔ .... چنانچہ میں نے ایک چھوٹے سے اسپتال میں کام کرنے کی صورت نکالی۔ اس میں مجھے اسپتال آنے جانے کا وقت ملا کر ہر روز صبح کو دو گھنٹے صرف کرنے پڑتے تھے۔ میں مریضوں کے حالات دریافت کر کے ڈاکٹر سے بیان کرتا تھا اور پھر دوا بنا کر تقسیم کرتا تھا۔ اِس طرح مجھے ہندوستانی مریضوں سے جن میں سے اکثر تامل دیس، آندھرا دیس یا شمالی ہندوستان کے پابند مزدور تھے، ملنے جلنے کا موقع ملا۔

یہ تجربہ اُس وقت میرے بہت کام آیا۔ جب میں نے جنگ بوئر میں والنٹیر وں کی حیثیت سے بیماروں اور زخمیوں کی تیمارداری کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ (۴۵)

لہ اخبار کا نام

اپنے دوسرے بچے کی پیدائش میرے لیے بڑی آزمائش کا موقع تھا۔ میری بیوی کو دردِ زہ اچانک شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر فوراً مل نہیں سکا۔ دائی کے آنے میں بھی بہت دیر ہو گئی۔ اور اگر وہ موجود بھی ہوتی تو اس سے وضعِ حمل میں کوئی مدد نہ ملتی۔ اس لیے مجھے خود یہ کام کرنا پڑا۔(۷۶)

میں سمجھتا ہوں بچے کی مناسب تربیت کے لیے یہ ضروری ہے کہ والدین اُن کی پرورش اور پرداخت کے عام اصول جانتے ہوں۔ مجھے اِن اصولوں کے سیکھنے سے ہر ہر قدم پر فائدہ ہوا۔ اگر میں اُن سے واقف نہ ہوتا اور ان پر عمل نہ کرتا تو میرے بچوں کی عام صحت اتنی اچھی نہ ہوتی جتنی اب ہے۔ ہمارے دل میں یہ غلط خیال جم گیا ہے کہ بچوں کو اپنی زندگی کے پہلے پانچ سال میں کچھ سیکھنا نہیں پڑتا ہے۔ حالانکہ واقعہ اِس کے بالکل برعکس ہے بچہ پہلے پانچ سال میں وہ چیزیں سیکھتا ہے۔ جو بڑا ہو کر کبھی نہیں سیکھ سکتا۔ بچے کی تعلیم ماں کے پیٹ ہی میں شروع ہو جاتی ہے(۷۷)

جو میاں بیوی ان باتوں کو سمجھ لیں گے۔ وہ کبھی محض اپنی شہوانی خواہش کو پورا کرنے کے لیے مباشرت نہ کریں گے۔ بلکہ صرف اُس وقت ہم بستر ہوں گے جب انھیں اولاد کی خواہش ہو۔ میرے نزدیک یہ خیال انتہائی جہالت پر مبنی ہے کہ جماع بھی کھانے پینے کی طرح جسم کی ایک مستقل ضرورت ہے۔ یہ وہ فعل ہے جس پر دُنیا کے وجود کا انحصار ہے چونکہ یہ دُنیا شاہدِ حقیقی کی بازی گاہ اور اُس کے جلال وجمال کی جلوہ گاہ ہے۔ اس لیے اِس فعل کو سیدھی راہ پر لگا کر اُس سے دُنیا کی منظم نشوونما کا کام لینا چاہیے۔ جس شخص پر یہ حقیقت کھل جائے گی وہ ہر قیمت پر شہوانی خواہش کو قابو میں رکھے گا اور بچوں کے جسمانی اور روحانی علاج کے طریقے سیکھ کر آنے والی نسلوں کو فیض پہنچائے گا۔(۷۸)

اچھی طرح بحث ومباحثہ اور غور وفکر کرنے کے بعد میں نے ۱۹۰۶ء میں برہمچریہ

کا عہد کر لیا۔ میں نے اپنے خیالات کا ذکر پہلے اپنی بیوی سے نہیں کیا تھا مگر عہد کرتے وقت میں نے اُن سے مشورہ کیا اور اُنہوں نے بے تامل منظور کر لیا۔ مگر آخری فیصلہ کرنا میرے لیے سہل نہ تھا۔ میری ہمت جواب دے رہی تھی میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے جذبات کو کیسے روکوں۔ اِس زمانے میں یہ بات کہ شوہر اپنی بیوی سے ہم بستر ہونا ترک کرے۔ عجیب و غریب معلوم ہوتی تھی۔ مگر میں نے خدا کا نام لے کر اور اُس کی مدد پر بھروسہ کرکے عہد کر ہی ڈالا۔

جب میں اِس عہد کے بعد کی زندگی پر جسے اب بیس سال ہو گئے۔ غور کرتا ہوں تو میرا دل خوشی اور حیرت سے معمور ہو جاتا ہے۔ ضبطِ نفس کی کوشش میں سنہ ۱۹۰۱ء سے کر رہا تھا۔ اور اِس میں کم و بیش کامیابی بھی ہوئی تھی مگر جو خوشی اور آزادی کا احساس عہد کرنے کے بعد ہوا۔ وہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ عہد کرنے سے پہلے مجھے ہر وقت ترغیبِ نفس سے مغلوب ہو جانے کا خوف رہتا تھا۔ مگر اب یہ عہد ہر ترغیب کے مقابلے میں سپر کا کام دیتا تھا۔ (۷)

لیکن اگرچہ یہ عہد میرے لیے روز افزوں مسرت کا سرمایہ تھا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اِس کی پابندی کرنا کوئی سہل کام تھا۔ اب چھپن سال کی عمر میں بھی مجھے اُس کی دشواریاں محسوس ہوتی ہیں۔ مجھے روز بروز یقین ہوتا جاتا ہے کہ یہ تلوار کی دھار پر چلنے سے کم نہیں۔ اِس میں انسان کو ہر لحظہ ہوشیار رہنا چاہیے کہ کہیں قدم ڈگمگا نہ جائے۔

اِس عہد کی پابندی کے لیے پہلی ناگزیر شرط یہ ہے کہ انسان ذائقے کے معاملے میں ضبطِ نفس سے کام لے۔ میں نے دیکھا۔ کہ ذائقے کو پوری طرح قابو میں رکھنے سے برہمچریہ کی پابندی آسان ہو جاتی ہے۔ اِس لیے اب میں غذا کے متعلق جو تجربے کرتا تھا اِس میں صرف نباتاتی مشرب ہی کا نہیں بلکہ برہمچاری نقطۂ نظر کا بھی لحاظ رکھتا تھا۔ (۸)

مجھے معلوم ہے کہ بعض لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ روح کچھ کھاتی پیتی نہیں

اس لیے ہمارے کھانے کا اُس پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور اصل سوال یہ نہیں ہے کہ انسان پیٹ میں کیا چیز ڈالتا ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ دل و دماغ سے کیا بات نکالتا ہے۔ مگر میں اس استدلال پر تنقید کرنے کی بجائے صرف اپنا یہ عقیدہ بیان کرنے کی کوشش کروں گا کہ طالبِ حق کے لیے جو خوفِ خدا میں زندگی بسر کرنا چاہتا ہے اور دیدارِ الٰہی کی آرزو رکھتا ہے، اپنے خیال اور کلام کی طرح اپنی غذا کے کیف و کم میں بھی ضبطِ نفس سے کام لینا ضروری ہے۔ (۱۸)

میں نے عیش و آرام کی زندگی شروع کی تھی۔ مگر یہ زیادہ دن نہیں چلی۔ اپنے مکان کو سازو سامان سے آراستہ کرنے میں میں نے بڑے اہتمام سے کام لیا تھا۔ پھر بھی مجھے اس سے کوئی وابستگی نہیں تھی۔

تھوڑے ہی عرصے میں میں نے مصارف میں کتر بیونت شروع کر دی۔ میرا دھوبی ایک تو دھلائی بہت لیتا تھا۔ دوسرے کپڑے وقت پر نہیں دیتا تھا۔ اس لیے دو تین درجن قمیصیں اور کالر بھی میرے لیے کافی نہیں ہوتے تھے۔ کالر روز بدلنا پڑتا تھا۔ اور قمیص روز نہیں تو ایک دن بیچ۔ اس سے بہت خرچ پڑ جاتا تھا۔ جو میرے نزدیک بالکل فضول تھا۔ اس خرچ کو بچانے کے لیے میں نے کپڑے دھونے کا سامان خرید ا اور اس موضوع پر ایک کتاب خرید کر پڑھی۔ اس طرح میں نے کپڑے دھونا سیکھ لیا۔ اِس سے میرا کام تو ضرور بڑھ گیا تھا۔ مگر نئی چیز تھی۔ اس لیے لطف بھی آتا تھا۔

میں نے جو پہلا کالر اپنے ہاتھ سے دھویا تھا وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ میں نے کالر میں تریچ ضرورت سے زیادہ لگا دی۔ استری کافی گرم نہیں کی اور جلنے کے خوف سے کالر کو اچھی طرح دبایا بھی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کالر خاصا سخت تو ہو گیا مگر اُس میں سے تریچ ٹپکتی جاتی تھی یہی کالر لگا کر میں عدالت میں گیا۔ میرے ساتھی

بیرسٹروں نے میرا مذاق اُڑایا۔ مگر مجھے اُس زمانے میں کبھی اُس کی پروانہ تھی کہ لوگ مجھ پر ہنستے ہیں۔ (۸۲)

جس طرح میں نے دھوبی کا محتاج ہونے سے چھٹکارا پایا۔ اسی طرح نائی کا بھی محتاج نہیں رہا۔ جو لوگ انگلستان جاتے ہیں وہ سب کے سب ڈاڑھی مونڈنا تو سیکھ جاتے ہیں۔ مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے، بال اپنے ہاتھ سے کاٹنا کوئی نہیں سیکھتا۔ ایک بار میں پریٹوریا میں ایک انگریز حجام کے ہاں گیا۔ اُس نے حقارت سے انداز میں میرے بال کاٹنے سے انکار کر دیا۔ ظاہر ہے مجھے اس سے تکلیف ہوئی۔ مگر میں نے فوراً ایک بال کاٹنے کی مشین خریدی اور آئینہ سامنے رکھ کر خود اپنے بال کاٹنے لگا۔ سامنے کے بال کاٹنے میں تو مجھے کچھ بیش کامیابی ہوئی۔ مگر گردن کے بال خراب ہو گئے۔ عدالت میں میرے دوست اُنھیں دیکھ ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔

"گاندھی تمہارے بالوں کو کیا ہوا۔؟ چوہے کُتر لے گئے۔؟"

"نہیں، یوروپی حجام نے میرے کالے بالوں کو ہاتھ لگانے میں اپنی ذلت سمجھی۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کاٹوں گا۔ چاہے کیسے ہی خراب کیوں نہ کٹیں۔"

اس جواب سے میرے دوستوں کو کوئی تعجب نہیں ہوا۔

حجام نے جو میرے بال کاٹنے سے انکار کیا اُس میں اُس کا قصور نہیں تھا۔ اگر کالے آدمیوں کا کام کرتا تو اغلب تھا کہ اُس کے یوروپین گاہک چھوٹ جاتے۔" (۸۳)

جب جنگ بوئر کا اعلان ہوا تو مجھے ذاتی طور پر بوئروں سے ہمدردی تھی۔ مگر ان دنوں میرا یہ خیال تھا کہ ایسے معاملات میں مجھے یہ حق نہیں کہ اپنی رائے کو دوسروں پر تھوپوں۔ میں نے "جنوبی افریقہ کی ستیہ گرہ" میں اس اندرونی کشمکش کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ اور یہاں اُسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ جن لوگوں کو

اِس کا حال معلوم کرنے کا شوق ہو وہ اُس کتاب کو پڑھیں۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ برطانوی حکومت کی وفاداری کے جذبے نے مجھے لڑائی میں انگریزوں کی طرف کھینچ لیا۔ میں نے سوچا۔ اگر میں سلطنت برطانیہ کے شہری کی حیثیت سے حقوق کا طالب ہوں تو میرا فرض ہے کہ میں اِس سلطنت کی حفاظت کرنے میں شریک ہوں میرا ان دنوں یہ خیال تھا کہ ہندوستان کو پوری آزادی صرف سلطنت برطانیہ کی مدد سے اور اُس کے اندر رہ کر حاصل ہو سکتی ہے۔ اِس لیے مجھے جتنے ساتھی مل سکے سب کو جمع کر کے میں نے ایک ایمبولینس کو رہنمائی۔ اور حکومت نے اُس کی خدمات قبول کر لیں۔ (۸۴)

اِس طرح میں نے جنوبی افریقہ میں جو خدمت ہندوستانیوں کی انجام دی اس سے مجھے ہر ہر قدم پر حق کے نئے نئے پہلو نظر آئے۔ حق ایک عظیم الشان درخت کی طرح ہے اور اُسے جتنا زیادہ سینچیے۔ اتنے ہی زیادہ پھل دیتا ہے۔ سچائی کی کان کو جتنا زیادہ کھودیے۔ اتنے ہی زیادہ جواہرات ہاتھ لگتے ہیں یعنی سماج کی خدمت کے نت نئے اور بہتر موقعے ملتے ہیں۔ (۸۵)

انسان کی ذات اور اس کے افعال، یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اچھے فعل پر تحسین اور بُرے پر نفرین ضرور ہونی چاہیئے۔ لیکن فاعل اچھا ہو تو عزت کا اور بُرا ہو تو رحم کا مستحق ہے۔ "نفرت جرم سے کرو، مجرم سے نہ کرو" ایسی تعلیم ہے جس کا سمجھنا آسان ہے۔ مگر اس پر عمل بہت کم کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نفرت کا زہر دُنیا میں پھیل رہا ہے۔

یہی اہنسا "تلاشِ حق" کی بنیاد ہے۔ مجھ پر روز بروز یہ حقیقت روشن ہوتی جاتی ہے کہ حق کی بلندی تک رسائی کی کوشش اہنسا کے زینے کے بغیر بالکل بیکار ہے۔ کسی نظام کی مزاحمت یا اُسے بُرا کہنا تو بالکل جائز ہے۔ مگر اُس کے بانی سے

برسرپیکار رہنا تو ایسا ہی ہے جیسے انسان اپنے آپ سے لڑائی باندھ لے کیوں کہ ہم سب ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہیں۔ ایک ہی خالق کے مخلوق ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص بحر حقیقت کا قطرہ ہے اور قطرے میں سمندر کی نامحدود عظمت و قوت چھپی ہوئی ہے۔ کسی قطرے کو حقیر سمجھنا سمندر کی تحقیر کرنا ہے اور اُس سے صرف ایک فرد کو نہیں بلکہ ساری خدائی کو دُکھ پہنچتا ہے۔ (۸۶)

میری زندگی کچھ ایسے حالات میں گزری کہ مختلف مذہب و ملت کے لوگوں سے سابقہ رہا۔ اور ان تجربوں کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کبھی اپنے اور بیگانے، دیسی اور بدیسی، ہندو اور مسلمان، پارسی اور عیسائی میں فرق نہیں کیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میری طبیعت میں اس قسم کی تفریق کا مادہ ہی نہیں ہے۔ (۸۷)

میں سنسکرت کا عالم نہیں ہوں۔ میں نے ویدوں اور اپنشدوں کے صرف ترجمے پڑھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسے عالمانہ مطالعہ نہیں کہا جا سکتا۔ مجھے اُن کے مطالب پر پورا عبور نہیں ہے۔ مگر میں نے ایک ہندو کی حیثیت سے اُنھیں پڑھا ہے اور یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں نے اُن کی حقیقی روح کو سمجھ لیا ہے۔ بائیس برس کی عمر کو پہنچنے سے پہلے میں دوسرے مذاہب سے بھی واقفیت حاصل کر چکا تھا۔

ایک زمانے میں میں ہندو دھرم اور عیسائیت کے بیچ میں جھولنے لگا تھا۔ جب میرے خیالات میں توازن پیدا ہوا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرے لیے نجات صرف ہندو دھرم ہی کے ذریعے سے ممکن ہے اور اُس پر میرا عقیدہ روشن خیالی کے ساتھ اور گہرا ہو گیا۔

مگر اُس پر بھی مجھے یقین تھا کہ چھوت چھات ہندو دھرم کا جز نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو پھر ایسے ہندو دھرم کو میرا دور ہی سے سلام ہے۔ (۸۸)

بہت دن ہوئے میں نے پڑھا تھا کہ آپ بیتی بہ حیثیت تاریخ کے ناقص ہوتی

ہے۔ آج اِس بات کی تصدیق ہوگئی۔ مجھے جتنی باتیں معلوم ہیں، سب کی سب میں اِس کتاب میں نہیں لکھ سکتا۔ مگر یہ کون بتائے کہ حقیقت کی تصویر پیش کرنے کے لیے اُن میں سے کیا کیا لینا چاہئے اور کیا کیا چھوڑ دینا چاہیئے؟ اور پھر میری زندگی سے متعلق میری یک طرفہ شہادت کی کسی عدالت کے نزدیک کیا وقعت ہوسکتی ہے؟ اگر کوئی شخص میرے پیچھے پڑجائے۔ اور جتنے باب میں لکھ چکا ہوں اُن کے متعلق مجھ سے جرح کرنے لگے تو شاید اُن کا مطلب زیادہ واضح ہوجائے گا اور اگر اس طرح کی جرح مخالفانہ ہو تو یہ بھی ممکن ہے کہ اسے "میرے دعووں کی پول کھول دینے" پر فخر کرنے کا موقع ملے۔

ذرا دیر کیلیے میرے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ اب اِس دفتر کو تہہ کردوں مگر جب تک اندر کی آواز مجھے منع نہیں کرے گی میں لکھتا جاؤں گا۔ مجھے اِس دانشمندانہ اصول پر عمل کرنا چاہیے کہ جو کام ایک بار شروع کردیا جائے اُسے کبھی نہ چھوڑو سوائے اِس کے کہ اس میں کوئی اخلاقی بُرائی نظر آئے۔ (۸۹)

"انڈین اوپینین" [1] کے جاری ہونے کے بعد پہلے ہی مہینے میں یہ حقیقت کھل گئی کہ اخبار نویسی کا مقصد محض خدمتِ خلق ہے۔ اخبار بہت بڑی قوت ہے۔ مگر جس طرح پانی کے بے قید سیلاب میں علاقے کے علاقے ڈوب جاتے ہیں۔ اور فصلیں برباد ہوجاتی ہیں۔ اِسی طرح اخبار نویس کے بے روک قلم سے تخریب کے سوا کچھ اُور حاصل نہیں ہوتا۔ مگر روک ٹوک کسی بیرونی قوت کی طرف سے ہو تو اُس کا ہونا نہ ہونے سے زیادہ خطرناک ہے۔ ضبط اِسی طرح مفید ہوتا ہے جب وہ باہر سے نہیں اندر سے ہو۔ اگر یہ اصول صحیح ہے تو دُنیا میں کتنے اخبار اِس معیار پر پورے

---

[1] یہ اُس اخبار کا نام ہے جو جنوبی افریقہ میں گاندھی جی نے نکالا تھا۔

اتریں گے؟ لیکن بے کار اخباروں کو روکنے کا اختیار کسے دیا جائے؟ کون اس بات کا فیصلہ کرے کہ یہ اخبار مفید ہے اور وہ بے کار؟ دنیا میں نیکی اور بدی کی طرح مفید اور غیر مفید ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ ہر انسان کو خود ہی یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ان میں سے کس کو لے اور کس کو چھوڑ دے؟ (۹۰)

رسکن کی پہلی کتاب جو میری نظر سے گزری "Unto this Last" تھی میں طالب علمی کے زمانے میں درسی کتابوں کے سوا کچھ پڑھتا ہی نہیں اور دنیا کے دھندے میں لگ جانے کے بعد مجھے مطالعہ کا وقت بہت کم ملتا تھا۔ اس لیے میرا کتابی علم بہت محدود ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ مطالعہ کا محدود ہونا میرے حق میں برا نہیں ہوا بلکہ اس سے مجھے فائدہ ہوا کہ جو کچھ پڑھتا۔ وہ دماغ میں رچ پچ گیا۔ ان چند کتابوں میں سے جو میں نے پڑھیں جس کتاب سے میری زندگی میں فوری عملی تغیر ہوا۔ وہ یہی رسکن کی Unto this Last تھی۔ میں نے اس کا ترجمہ گجراتی میں "سرودے" کے نام سے کیا۔ مجھے رسکن کی اس عظیم کتاب میں اپنے بعض عقیدوں کی جھلک نظر آئی۔ اسی لیے اس نے میرے دل کو موہ لیا اور میری زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ شاعر وہ ہے جو انسان کے دل میں سوئی ہوئی نیکیوں کو جگا دے شاعروں کے کلام کا اثر سب پر یکساں نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ہر ایک میں اثر قبول کرنے کی استعداد یکساں نہیں ہوتی۔ (۹۱)

کہنے کو تو میں جوہانز برگ میں بس گیا تھا مگر ٹھکانے کی زندگی میرے نصیب میں نہیں تھی عین اس وقت جب میں سمجھتا تھا کہ اطمینان سے بیٹھوں گا۔ ایک ایسا واقعہ پیش آیا۔ جس کی بالکل توقع نہ تھی۔ اخباروں سے معلوم ہوا کہ نٹال میں زولو۔ بغاوت شروع ہو گئی ہے۔ مجھے زولو قوم سے کوئی پرخاش نہیں تھی انھوں نے کبھی ہندوستانیوں کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ مگر اس زمانے میں میرا

یہ عقیدہ تھا کہ سلطنت برطانیہ دُنیا کی فلاح وبہبود کے لیے قائم ہے۔ میں سلطنت برطانیہ کا اتنا سچا وفادار تھا کہ دل کی خلوت میں بھی اُس کا بُرا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے مجھے اس سے سروکار نہ تھا کہ بغاوت بجا ہے یا بے جا۔ میں نے برطانوی حکومت کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ نٹال میں ایک والنٹیر ڈیفنس کور تھی اور اُسے مزید رنگروٹوں کو بھرتی کرنے کا اختیار تھا۔ میں نے اخبار میں پڑھا کہ بغاوت کو فرد کرنے کے لیے اِس دستے کو جمع ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔

میں اپنے آپ کو نٹال کا شہری سمجھتا تھا اس لیے میں نے گورنر کو خط لکھا کہ اگر ضرورت ہو تو میں ہندوستانیوں کی ایمبولینس کور قائم کرنے کو تیار رہوں اُنھوں نے فوراً منظوری بھیج دی۔ (۹۲)

"بغاوت" کے مقام پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ کوئی ایسی شورش نہیں کہ جسے بغاوت کہا جا سکے کسی قسم کی مزاحمت نظر نہیں آتی تھی۔ وہ واقعہ جسے بڑھا چڑھا کر بغاوت کا نام دیا گیا تھا یہ تھا کہ کسی زولو سردار نے ایک نئے ٹیکس کے ادا کرنے سے انکار کیا تھا۔ اور جو سارجنٹ وصولی کے لیے گیا تھا۔ وہ نیزہ مار کر ختم کر دیا گیا تھا۔ بہر حال میری ہمدردی زولو قوم کے ساتھ تھی اور جب صدر کیمپ پہنچ کر یہ سنا کہ ہم لوگوں کا کام زیادہ تر زولو زخمیوں کی تیمارداری کرنا ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میڈیکل آفیسر کو ہمارا آنا بہت غنیمت معلوم ہوا۔ اُنھوں نے کہا کہ گورے لوگ زولو زخمیوں کی تیمارداری دل سے نہیں کرتے۔ اِن غریبوں کے زخموں میں کیڑے پڑ گئے ہیں۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ اُس نے ہم لوگوں کے پہنچنے کو ان بے گناہ غریبوں کے لیے بڑی نعمت سمجھا۔ ہمیں پٹیاں زخم صاف کرنے کی دوائیں وغیرہ دے کر عارضی ہسپتال میں پہنچا یا گیا۔ زولو ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ گورے سپاہی

ہسپتال کے باہر کھڑے ہو کر جنگلے کی سلاخوں سے جھانکا کرتے اور ہمیں زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے سے باز رکھتے۔ جب ہم اُن کی باتوں پر دھیان نہ دیتے تو وہ جھلا کر زولو قیدیوں کو فحش گالیاں دینے لگتے۔ (۹۳)

جو زخمی ہماری نگرانی میں تھے وہ لڑائی میں مجروح نہیں ہوئے تھے۔ اُن میں سے بعض شبہے میں گرفتار کر لیے گئے تھے اور جنرل نے اُن کے کوڑے لگوائے تھے۔ کوڑوں نے اُن کے بدن میں گہرے زخم ڈال دیئے تھے۔ اور مرہم پٹی نہ ہونے کے سبب سے زخموں میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ ان کے علاوہ اور سب وفادار زولو تھے۔ اُنھیں دشمنوں سے ممتاز کرنے کے لیے خاص بلّے دیے گئے تھے۔ مگر پھر بھی گوروں نے غلطی سے ان پر بندوق چلادی تھی۔ (۹۴)

زولو "بغاوت" کے سلسلے میں ہمیں نئے نئے تجربے ہوئے جنگ بوئر میں لڑائی کے خوفناک نتائج کا اندازہ اتنا نہیں ہوا جتنا اِس بغاوت میں ہوا۔ .... سچ پوچھیے تو لڑائی کا نام ہی نام تھا، اصل آدمیوں کا شکار کیا جا رہا تھا۔ یہ صرف میری ہی رائے نہ تھی۔ بلکہ بہت سے انگریز جن سے مجھے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا، یہی کہتے تھے۔ روز صبح اُٹھ کر بے گناہوں کی جھونپڑیوں پر رائفلوں کی باڑھ چلتے سننا۔ جیسے شب برات میں پٹاخے چھوٹتے ہوں۔ ہمارے لیے عذاب تھا۔ مگر میں مجبوراً زہر کے گھونٹ پیتا تھا خصوصاً اِس وجہ سے کہ ہماری کور کا کام صرف زولو زخمیوں کی خدمت کرنا ہے۔ مجھے اس خیال سے تسکین ہوتی تھی کہ اگر ہم نہ آتے تو غریب زولو کس مپرسی کی حالت میں پڑے رہتے۔ (۹۵)

میری دلی خواہش تھی کہ خیال۔ قول اور عمل میں برہمچریہ برتوں۔ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ ستیہ گرہ کی جد و جہد میں صرف کروں اور اِس تیاری کے لیے ضبط نفس بہت ضروری تھا۔ اِس لیے مجھے غذا کے

معاملے میں اور تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ اور مزید احتیاط سے کام لینا پڑا۔ اس سے پہلے جتنی تبدیلیاں ہوئیں وہ زیادہ تر صحت کے خیال سے ہوئیں مگر اب جو تجربے کیے جانے والے تھے اُن میں مذہبی مقصد پیش نظر تھا۔

اب میری زندگی میں فاقے اور غذا کی احتیاط نے خاص اہمیت حاصل کرلی انسان کے دل میں عام طور پر ہوائے نفس اور زبان کی چاٹ کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ یہی صورت میرے ساتھ بھی تھی۔ مجھے اپنی شہوانی خواہش اور اپنے ذائقے پر قابو پانے میں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں اور اب بھی میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں نے ان دونوں چیزوں کو قابو میں کرلیا ہے۔ میرے خیال میں میری خوراک اب بھی زیادہ ہے میرے دوست سمجھتے ہیں کہ میں ضبط نفس سے کام لیتا ہوں۔ مگر میں خود یہ محسوس نہیں کرتا۔ اگر اتنی احتیاط بھی نہ برتتا تو میری زندگی جانوروں سے بدتر ہوتی اور کب کا ٹھکانے لگ چکا ہوتا۔ بہرحال چونکہ مجھے اپنی خامیاں اچھی طرح معلوم تھیں، میں نے اُن سے نجات پانے کی پوری کوشش کی۔ اور اسی کی برکت ہے کہ میں اپنے جسم کو اتنے دن گھسیٹتا رہا۔ اور تھوڑا بہت کام کرے گیا۔(۹۶)

میں نے پھلوں پر بسر کرنا شروع کیا۔ مگر ضبط نفس کے نقطۂ نظر سے مجھے غلّے اور میوے میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوا۔ میوہ خوری میں غذا کی مقدار تو کم ہوگئی۔ مگر ذائقے کی لذت اتنی ہی رہی۔ بلکہ عادت پڑجانے کے بعد اور بھی بڑھ گئی۔ تہوار کے دن فاقہ کرنا یا ایک وقت کھانا زیادہ مفید معلوم ہوا۔ اور اگر کفارے وغیرہ کا موقع آتا تھا۔ تو میں فاقے ہی کے ذریعے کرتا تھا۔

مگر اس میں بھی میں نے دیکھا کہ جسم کی رطوبت کم ہوجانے کے سبب سے کھانے میں زیادہ مزا آنے لگا۔ اور بھوک بڑھ گئی۔ مجھ پر یہ راز کھلا کہ فاقے سے ضبط نفس اور لذتِ نفس دونوں کا کام لیا جاسکتا ہے خود میرے اور دوسرے لوگوں کے

تجربے اس حیرت انگیز حقیقت کی شہادت دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ میں اپنا جسم بھی بنانا چاہتا تھا مگر اس وقت تو مجھے زیادہ فکر ذائقے کو قابو میں لانے کی تھی اس لیے میں برابر غذائیں بدلتا رہا۔ اور اس کے ساتھ مقدار میں بھی کمی کرتا رہا۔ مگر ذائقہ ملا بن کر میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ جب میں ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری کو اختیار کرتا تو اس میں اور زیادہ مزہ آتا۔ (۹۷)

بہرحال تجربے سے مجھے یہی معلوم ہوا کہ غذا کے معاملے میں ذائقے کو اہمیت دینا بڑی غلطی ہے۔ ہمیں غذا کام و دہن کی لذت کے لیے نہیں، بلکہ جسم کی بقا کے لیے کھانی چاہیے۔ اگر ہمارے کل حواس ہمیشہ جسم کی اور جسم کے واسطے سے روح کی خدمت میں مصروف رہیں تو ان کی مخصوص لذت باقی نہیں رہتی اور وہ منشا جس کے لیے قدرت نے انھیں خلق کیا ہے پورا ہو جاتا ہے۔

فطرت سے ہم آہنگی حاصل کرنے کے لیے جتنے تجربے اور قربانیاں کی جائیں کم ہے۔ افسوس ہے کہ آجکل اُلٹی گنگا بہتی ہے۔ ہمیں ذرا بھی شرم نہیں آتی کہ ہم جسم فانی کو سنوارنے اور اُس کی زندگی کے چند لمحے بڑھانے کے لیے ہزاروں جانوں کا خون کرتے ہیں جس کا نتیجہ ہماری جسمانی اور روحانی ہلاکت ہے۔ (۹۸)

مجھے جیل جانے کا پہلا اتفاق ۱۹۰۸ء میں ہوا۔ میں نے دیکھا کہ قیدیوں کے لیے جو ضابطے بنائے گئے ہیں۔ اُن میں سے بعض ایسے ہیں کہ "برہمچاری" یعنی ضبطِ نفس کے طالب کو اپنی خوشی سے اختیار کر لینا چاہییں مثلاً یہ کہ شام کا کھانا غروبِ آفتاب سے پہلے کھا لیا جائے۔ ہندوستانی اور افریقی قیدیوں کو چائے اور کافی پینے کی اجازت نہ تھی۔ وہ چاہیں تو اوپر سے کھانے میں نمک ڈال سکتے تھے۔ مگر ذائقے کی خاطر انہیں کوئی چیز نہ دی جاتی تھی۔ (۹۹)

آگے چل کر یہ بندشیں بڑی مشکلوں سے کچھ کم ہوئیں۔ مگر اصل میں دونوں قاعدے

صحت کے لیے بہت مفید تھے جو سختیاں کسی بیرونی قوت کی طرف سے کی جائیں اُن کی پابندی میں بہت کم کامیابی ہوتی ہے۔ لیکن اگر ان ہی کو انسان خود اپنے اوپر عائد کرے تو بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ اس لیے جیل سے رہا ہوتے ہی میں نے اِن دونوں قاعدوں کی پابندی اپنے اوپر لازم کر لی۔ جہاں تک اس وقت ممکن تھا میں چائے کے استعمال سے پرہیز کرتا تھا اور شام کا کھانا سورج ڈوبنے سے پہلے کھا لیتا تھا۔ اب ان دونوں باتوں کی پابندی کے لیے کسی کوشش کی ضرورت نہیں پڑتی۔ (۱۰۰)

فاقہ شہوانی خواہشات کو دبانے میں صرف اسی وقت مفید ہے جب یہ ضبطِ نفس کی خاطر کیا جائے۔ میرے بعض دوستوں کا تو یہ تجربہ ہے کہ فاقے کے بعد شہوانی خواہش اور بھڑک اُٹھی اور ذائقے کی حِس اور تیز ہو گئی۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اگر فاقے کے ساتھ ساتھ ہر وقت ضبطِ نفس کا خیال نہ رکھا جائے تو یہ بالکل بیکار چیز ہے۔ (۱۰۱)

غرض فاقہ اور اسی قسم کی دوسری چیزیں ضبطِ نفس کا ذریعہ ضرور ہیں مگر بجائے خود کافی نہیں ہیں۔ اگر جسم کے فاقے کے ساتھ ساتھ دل کا فاقہ نہ ہو تو اس کا انجام ریاکاری اور تباہی ہے۔ (۱۰۲)

ٹالسٹائے کے فارم میں ہم نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا تھا کہ اُستاد سے جو کام خود نہ ہوتے ہوں وہ لڑکوں سے نہ کرائیں۔ جب کبھی لڑکوں کو کوئی کام دیا جاتا تو کوئی اُستاد اُن کے ساتھ رہتا اور اُن کا ہاتھ بٹاتا۔ اِس لیے اُنھیں جو کچھ سکھایا جاتا وہ خوشی سے سیکھتے تھے۔ (۱۰۳)

آج کل تعلیم میں درسی کتابوں کا بڑا چرچا ہے۔ مگر مجھے تو کبھی اُن کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، ویسے تھوڑی بہت کتابیں موجود تھیں ان سے جہاں تک یاد ہے

کچھ زیادہ کام نہیں لیا۔ مجھے لڑکوں پر کتابوں کا انبار لادنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ طالب علم کے لیے بہترین درسی کتاب اُس کا اُستاد ہے۔ میرے اُستادوں نے مجھے کتابوں میں سے جو کچھ پڑھایا اُس سے مجھے بہت کم یاد رہ گیا۔ مگر کتابوں سے باہر کی جو باتیں بتائیں وہ آج تک دل پر نقش ہیں۔

بچے کانوں سے سُن کر جتنا سیکھتے ہیں پڑھ کر نہیں سیکھ سکتے مجھے یاد نہیں کہ میں نے ان لڑکوں کو کوئی کتاب شروع سے آخر تک پڑھائی ہو۔ مگر مختلف کتابوں کے مطالعہ سے جو باتیں میرے دل میں بیٹھ گئی تھیں وہ میں اُنھیں اپنی زبان میں سمجھا دیتا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اُدھ اُنھیں اب تک بھولے نہ ہوں گے کتابوں کو پڑھ کر یاد رکھنا اُن کے لیے مشکل تھا۔ مگر جو کچھ اُنھیں زبانی بتاتا تھا۔ وہ آسانی سے دہرا سکتے تھے۔ پڑھنا اُن کے لیے ایک کٹھن کام تھا۔ مگر میری گفتگو سننا تو ایک تفریح تھی۔ بہ شرطے کہ میرا اندازِ بیان دلچسپ ہو۔ میری گفتگو سے اُنھیں جو سوالات پوچھنے کی تحریک ہوتی تھی۔ اِس سے میں اُن کی قوتِ فہم کا اندازہ کر سکتا تھا۔ (۱۰۴)

جس طرح جسمانی تربیت صرف جسمانی پرورش کے ذریعہ سے ممکن ہے اسی طرح روحانی تربیت صرف روح کی ورزش ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے اور روح کی ورزش تمام تر اُستاد کی زندگی اور سیرت پر منحصر ہے۔ اُستاد کو بچوں کے سامنے اور اُن کے پیچھے ہر وقت خیال رکھنا چاہیے کہ اُس سے کوئی نامناسب حرکت سرزد نہ ہو۔ (۱۰۵)

اگر میں خود جھوٹ بولوں اور اپنے شاگردوں کو سچ بولنے کی تلقین کروں تو ظاہر ہے کہ کوئی اثر نہ ہوگا۔ بزدل معلم کبھی اپنے لڑکوں کو بہادر نہیں بنا سکتا

نفس پرست اُستاد ہرگز ضبطِ نفس نہیں سکھا سکتا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ مجھے اِن لڑکوں اور لڑکیوں کے سامنے جن کی تربیت میرے سپرد ہے، اپنی زندگی کو نمونہ بنا کر پیش کرنا چاہیے۔ گویا یہ بچے میرے اُستاد تھے۔ اور مجھے اگر اور کسی وجہ سے نہیں تو اُن کی خاطر نیکی اور عفت کی زندگی بسر کرنا چاہیے۔ سچ پوچھیے تو میں ٹالسٹائے فارم میں ضبطِ نفس میں جو اہتمام کرتا تھا وہ زیادہ تر اسی کے سبب سے تھا۔

اُن میں سے ایک لڑکا وحشی، سرکش اور جھگڑالو تھا۔ ایک بار اُس نے اتنا دنگا مچایا کہ میں تنگ آگیا۔ میں اپنے شاگردوں کو کبھی سزا نہیں دیتا مگر اِس مرتبہ مجھے غصہ آگیا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ مجھے خاطر میں نہ لایا۔ آخر میں نے رول اُٹھایا اور اُس کے بازو پر مارا۔ میں اِس وقت سارے بدن سے کانپ رہا تھا۔ اور میرے خیال میں اُسے اُس کی خبر تھی۔ یہ ان سب لڑکوں کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا۔ وہ لڑکا رونے لگا۔ اور اُس نے اپنے قصور کی معافی کی درخواست کی اُس کے رونے کا سبب چوٹ کی تکلیف نہیں تھی۔ سترہ سال کا مضبوط لڑکا تھا۔ چاہتا تو مجھے مار بیٹھتا۔ مگر اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے مجبور ہو کر اتنی سخت سزا دینی پڑی .... اور اس سے مجھے سخت اذیت ہوئی۔ مگر مجھے اِس تشدد پر آج تک ندامت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُس روز میں نے اُس کے سامنے اپنی روحانیت کا نہیں بلکہ اپنی بہیمیت کا مظاہرہ کیا تھا۔

میں جسمانی سزا کا ہمیشہ سے مخالف ہوں، جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے اپنے لڑکوں میں سے ایک کو صرف ایک مرتبہ مارا ہے۔ اس لیے میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اُس روز میرا رول سے کام لینا جائز تھا یا ناجائز

تھا۔ غالباً میرا یہ فعل نامناسب تھا کیوں کہ اُس کا محرک غصہ اور سزا دینے کا جذبہ تھا۔ اگر یہ محض میری بے بسی کا اظہار ہوتا تو میں اِسے جائز سمجھتا۔ مگر میری نیت خالص نہ تھی۔ (۱۰۶)

اس کے بعد بھی لڑکوں نے شرارتیں کیں۔ لیکن میں نے کبھی جسمانی سزا سے کام نہیں لیا۔ غرض کہ ان لڑکوں اور لڑکیوں کی روحانی تربیت کی کوشش میں مجھ پر روز بروز یہ حقیقت کھلتی گئی۔ کہ روح میں بڑی قوت ہے۔ (۱۰۷)

اِن دنوں میں کبھی جوہانس برگ میں رہتا تھا اور کبھی فینکس میں۔ ایک بار مجھے جوہانسبرگ میں یہ اطلاع ملی کہ فینکس آشرم کے رہنے والوں میں سے دو شخص بدفعلی کے مرتکب ہوئے۔ اگر میں یہ سُنتا کہ سفینہ گرہ کی تحریک بیٹھ گئی۔ تو اتنا صدمہ نہ ہوتا۔ مگر اس خبر سے مجھ پر بجلی سی گر گئی۔ میں اسی دن ریل سے فینکس روانہ ہو گیا۔ (۱۰۸)

رستے میں میرے ذہن میں یہ بات صاف ہو گئی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھے یہ احساس تھا کہ سرپرست یا اُستاد ایک حد تک اس لڑکے کی لغزشوں کا ذمہ دار ہے۔ جو اُس کے زیر نگرانی یا زیر تربیت ہو۔ اِس لیے اِن واقعے کی ذمہ داری صریحاً مجھ پر عاید ہوتی تھی۔ مجھے پہلے ہی اِس خطرہ سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ لیکن میں نے اپنی سادہ دلی سے ان باتوں پر دھیان نہیں دیا۔ میں نے سوچا کہ جن لوگوں سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہے اُنہیں اپنے قصور اور میرے صدمے کا اندازہ اُسی وقت ہو گا۔ جب میں اُس کا کفارہ ادا کروں اِس لیے میں نے عہد کیا کہ سات دن فاقہ کروں گا۔ اور اس کے بعد ساڑھے چار مہینے تک صرف ایک وقت کھانا کھاؤں گا۔ (۱۰۹)

میرے فاقے سے سب کو دُکھ ہوا۔ مگر اس سے آشرم کی فضا پاک صاف ہو گئی۔ ہر شخص کو یہ محسوس ہو گیا کہ گناہ کس قدر بھیانک چیز ہے۔ مجھ میں اور میرے بچوں میں جو رشتۂ محبت تھا وہ اور سچا اور مضبوط ہو گیا۔ (۱۱۰)

میں نے اپنے پیشے میں کبھی جھوٹ سے کام نہیں لیا۔ میری وکالت زیادہ تر قومی معاملات کے لیے وقف تھی جس کا معاوضہ میں صرف اتنا لیتا تھا کہ مجھے اپنے پاس سے جو خرچ کرنا پڑا ہے وہ نکل آئے۔ اور کبھی کبھی اُسے بھی چھوڑ دیتا تھا... بچپن میں میں نے سنا تھا کہ وکالت جھوٹوں کا پیشہ ہے۔ مگر میں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی۔ کیونکہ مجھے جھوٹ بول کر دولت یا عزت حاصل کرنا مقصود نہ تھا......
جنوبی افریقہ میں میری آزمائش کے بہت سے موقعے آئے اکثر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ فریق مخالف کے وکیلوں نے گواہوں کو سکھایا پڑھایا ہے اور اگر میں بھی اپنے موکل یا اس کے گواہوں کو جھوٹ بولنے دوں تو مقدمہ جیت جاؤں گا۔ مگر میں نے اسے کبھی جائز نہیں رکھا۔ صرف ایک بار ایک مقدمہ جیتنے کے بعد مجھے یہ شبہ ہوا کہ میرے موکل نے مجھے دھوکا دیا۔ میں ہمیشہ دل میں یہ دُعا مانگا کرتا تھا کہ اگر میرا موکل حق پر نہ ہو تو میں مقدمہ ہار جاؤں۔ فیس مقرر کرتے وقت میں نے کبھی یہ شرط نہیں کی کہ اگر مقدمے میں کامیابی ہوئی تو زیادہ لوں گا۔

میں ہر نئے موکل کو پہلے ہی جتا دیتا تھا کہ مجھ سے جھوٹا مقدمہ لڑنے کی یا گواہوں کو سکھلانے کی توقع نہ رکھے۔ جب اس بات کی شہرت ہوئی تو میرے پاس جھوٹے مقدموں کا آنا ہی بند ہو گیا۔ بعض موکل یہ کرتے تھے کہ سچے مقدمے میرے پاس لاتے اور مشتبہ مقدمے دوسروں کے پاس لے جاتے۔ (۱۱۱)

میرا یہ بھی معمول تھا کہ اپنی جہالت کو اپنے موکلوں یا اپنے ساتھ کام کرنے والے وکیلوں سے کبھی نہیں چھپاتا تھا۔ جب کبھی کوئی مقدمہ میری سمجھ میں نہیں آتا تو میں موکل کو ہمیشہ یہ مشورہ دیتا کہ کسی دوسرے وکیل کے پاس جائے۔ اور اگر وہ مجھ ہی کو وکیل کرنے پر مصر ہوتا تو میں اُس کے مشورے سے کسی بڑے وکیل کو شریک کر لیتا۔ اس طرزِ عمل کی وجہ سے میرے موکلوں کو مجھ سے بڑی محبت ہو گئی اور وہ مجھ پر بجید

اعتماد کرنے لگے جب کسی بڑے وکیل سے مشورہ کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ تو وہ خوشی سے اُس کی فیس ادا کرتے تھے اِس محبت اور اعتماد کی بدولت مجھے اپنے پبلک کاموں میں بڑی مدد ملی (۱۱۲)

۱۹۱۴ء میں جب ستیہ گرہ ختم ہو گئی تو گوکھلے کا حکم پہنچا کہ لندن ہوتے ہوئے ہندوستان آجاؤ ......۴ر اگست کو جنگ (پہلی جنگ عظیم) کا اعلان ہوا۔ ۶ر اگست کو ہم لندن پہنچ گئے (۱۱۳)

مجھے محسوس ہوا کہ جتنے ہندوستانی انگلستان میں مقیم ہیں سب کو اپنی بساط کے مطابق جنگ میں حصہ لینا چاہیئے جس طرح انگریز طالب علموں نے اپنی خدمات فوج میں بھرتی ہونے کے لیے پیش کی ہیں۔ ہندوستانیوں کو بھی کرنا چاہیے۔ اِس پر طرح طرح کے اعتراض کیے گئے بعض لوگوں نے کہا کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہم غلام ہیں، وہ آقا ہیں، جب آقا پر بُرا وقت پڑے تو غلام کیوں ساتھ دے؟ اُسے تو اِس موقع سے فائدہ اُٹھا کر اپنی آزادی کی فکر کرنا چاہیے۔ اُس وقت اِس دلیل سے میری تسکین نہیں ہوئی میں جانتا تھا کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں میں فرق ہے۔ مگر میری نظر میں ہندوستانیوں کی حالت اتنی بُری نہیں تھی کہ غلامی کہی جا سکے۔ اِن دنوں میرا یہ خیال تھا کہ قصور جو کچھ ہے حکام کا افراد کی حیثیت سے ہے برطانوی نظامِ حکومت کا قصور نہیں ہے اگر ہم انگریزوں کی مدد اور تعاون سے اپنی حالت سدھارنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ضرورت کے وقت اُن کے کام آئیں۔ اُن کی حکومت میں خرابیاں ضرور ہیں مگر اتنی نہیں کہ ناقابلِ برداشت ہوں۔ آج جب مجھے برطانوی حکومت پر اعتماد نہیں رہا، میں اُن کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اسی زمانے سے برطانوی نظامِ حکومت اور برطانوی حکام دونوں سے بدظن تھے۔

وہ اُن کا ساتھ کیوں کر دے سکتے تھے۔ (۱۱۴)

میں یہ کہتا تھا کہ ہمیں انگلستان کی مصیبت سے فائدہ نہیں اُٹھانا چاہیے۔ شرافت اور دور اندیشی کا تقاضا ہے کہ جنگ کے ختم ہونے تک ہم اپنے مطالبات ملتوی رکھیں۔ غرض میں اپنی رائے پر قائم رہا۔ اور میں نے لوگوں کو دعوت دی کہ جس کا جی چاہے وہ اپنا نام رضاکاروں میں لکھوا دیے۔ (۱۱۵)

ہم سب کا خیال تھا کہ جنگ اخلاقاً ناجائز ہے۔ جب میں نے ان لوگوں پر جنہوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا مقدمہ نہیں چلایا تو میرے دوستوں کو مجھ سے یہ توقع کیوں کر ہو سکتی تھی کہ میں جنگ میں شریک ہو جاؤں گا خصوصاً ایسی حالت میں جب مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ حق پر کون ہے۔ میرے دوست جانتے تھے کہ میں جنگ بوئر میں شریک رہ چکا ہوں مگر وہ یہ سمجھتے تھے کہ اُس کے بعد میرے خیالات بدل گئے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جن وجوہ سے میں جنگ بوئر میں شریک ہوا تھا اُن ہی کی بنا پر میں نے اِس بار بھی شرکت کا فیصلہ کیا۔ اِس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ جنگ میں حصہ لینا اہنسا کے خلاف ہے مگر مشکل یہ ہے کہ ہر انسان کو صحیح موقعے پر اپنا فرض نہیں سوجھتا۔ حق کے طالب کو اکثر اندھیرے میں ٹٹول کر چلنا پڑتا ہے۔ (۱۱۶)

جنوبی افریقہ اور انگلستان میں لوگوں کو ایمبولینس کور میں اور ہندوستان میں فوج میں بھرتی کر کے میں نے لڑائی کو سہارا نہیں دیا بلکہ اِس ادارے کو جو برطانوی سلطنت کہلاتا ہے اور جس کے بارے میں اُس وقت میرا یہ خیال تھا کہ مجموعی طور پر وہ دُنیا کے لیے مفید ہے۔ مجھے لڑائی سے اس وقت بھی اتنی ہی نفرت تھی جتنی آج ہے اگر مجھ سے رائفل چلانے کو کہا جاتا تو میں ہرگز نہ چلا سکتا۔ مگر انسان کی زندگی ایک سیدھی لکیر نہیں ہوتی۔ یہ ایسے فرائض کا مجموعہ ہے جو اکثر ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور ہمیں اکثر یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ دو فرائض میں سے کس کو اختیار کریں۔ اس زمانے میں میں

ایک ریفارمر کی حیثیت ــــ سے جنگ ــــ کے خلاف کوئی تحریک نہیں چلا رہا تھا ملکہ نا
بھی نہیں چلا رہا ہوں مجھے ایک شہری کی حیثیت سے ان لوگوں کو جو جنگ کے قائل تھے مگر
بُزدلی یا دوسرے ادنٰے محرکات یا سلطنت برطانیہ سے خفگی کی وجہ سے بھرتی نہیں ہو رہے
تھے، کچھ نہ کچھ مشورہ دینا تھا اور اُن کی رہنمائی کرنا تھی، میں نے بے تامل اُنھیں یہ
مشورہ دیا کہ جب تک وہ جنگ کے قائل ہیں۔ اور برطانوی دستور کی وفاداری کا دعوے
کرتے ہیں، اُس وقت تک اُن کا فرض ہے کہ اُس کی حفاظت کے لیے فوج میں بھرتی
ہوں........ میں انتقام کا قائل نہیں ہوں۔ مگر میں نے بے تکلف اب سے چار
سال پہلے بیٹیا کے قریب گاؤں والوں سے یہ بات کہی تھی کہ جب وہ اہنسا کا نام
تک نہیں جانتے تو یہ اُن کی بُزدلی تھی کہ اُنھوں نے اپنی عورتوں کی عزت اور اپنے
مال کی حفاظت ہتھیاروں کے ذریعہ سے نہیں کی اور ابھی تھوڑے دن پہلے
میں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ہندوؤں سے کہا تھا کہ اگر وہ کامل اہنسا کے قائل
نہیں ہیں اور اس پر عمل نہیں کر سکتے تو اُن کا ہتھیاروں کی مدد سے اپنی عورتوں کی عزت
کو حملہ آوروں سے بچانے سے قاصر رہنا جرم ہے۔ ان سب نصیحتوں کو بھی اور اپنے پچھلے
عمل کو بھی میں اپنے کامل اہنسا کے عقیدے کے منافی نہیں سمجھتا بلکہ اِس کا بلاواسطہ
نتیجہ سمجھتا ہوں۔ اہنسا کے بلند و برتر اصولوں کو بیان کر دینا تو آسان ہے مگر اُسے
اچھی طرح جاننا اور اس دُنیا میں جو فتنہ و فساد اور جذبات و خواہشات سے معمور ہے۔
اُس پر عمل کرنا بڑا دشوار کام ہے اور مجھے اُس کی دُشواری کا احساس روز بروز بڑھتا
جاتا ہے مگر اسی کے ساتھ یہ یقین بھی بڑھ رہا ہے کہ اِس پر عمل کے بغیر زندگی بےکار
ہے۔

اگر محض اہنسا کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو میرے اِس طرزِ عمل کا کوئی جواز
نہیں ہے۔ میں اُن لوگوں میں جو مہلک ہتھیار استعمال کرتے ہیں اور اُن پر جو بیڈ کرتے ہیں

کا کام کرتے ہیں، کوئی فرق نہیں کرتا۔ دونوں جنگ میں حصہ لیتے ہیں اور اس کی حمایت کرتے ہیں۔ دونوں جنگ بازی کے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مگر اتنے سال احتساب نفس سے کام لینے کے بعد بھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جو حالات مجھے ان دنوں درپیش تھے ان میں مجھے لازمی طور پر وہی کرنا چاہیے تھا جو میں نے جنگ بوئر اور جنگ عظیم کے دوران میں کیا۔ یہی نہیں بلکہ سنہ ۱۹۰۶ء کی نام نہاد " زولو بغاوت " کے موقع پر بھی میرا طرزِ عمل صحیح تھا۔

زندگی بہت سی مختلف قوتوں کا کھلونا ہے۔ اگر ایسا ہوتا کہ انسان اپنے طرزِ عمل کو کسی عام اصول کے مطابق معین کر سکتا اور ہر موقع پر بلا کسی غور و تامل کے یہ بات اس پر واضح ہو جاتی کہ وہاں عام اصول کس طرح عائد کیا جائے تو معاملہ بہت آسان تھا۔ لیکن مجھے تو کوئی ایک موقع بھی یاد نہیں جب میں آسانی سے یہ فیصلہ کر سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

چونکہ میں بہت سختی سے جنگ کا مخالف ہوں، اس لیے میں نے کبھی مہلک ہتھیاروں سے کام لینے کی ٹریننگ حاصل نہیں کی، باوجود اس کے کہ مجھے اس کے مواقع حاصل تھے۔ شاید اسی وجہ سے میں انسانوں کو بلاواسطہ ہلاک کرنے سے بچ گیا مگر جب تک کہ میں ایک ایسے نظام حکومت کے ماتحت رہتا تھا جو تشدد پر مبنی تھا اور اپنی خوشی سے ان گوناگوں سہولتوں سے اور حقوق سے جو اس حکومت نے مجھے دے رکھے تھے فائدہ اٹھاتا تھا، میرا فرض تھا کہ اِن حکومت کی جنگ کے زمانے میں اپنی بساط کے مطابق مدد کروں۔ ہاں، اگر میں اِس حکومت سے ترکِ تعاون کرتا اور حتی الامکان اُسکے دیے ہوئے حقوق سے فائدہ اٹھانے سے باز رہتا تو اور بات تھی۔

آیئے ایک مثال لے لیجیے۔ میں ایک ادارے کا رکن ہوں۔ جس کے پاس چند ایکڑ زمین ہے اس پر جو فصلیں اگائی جاتی ہیں۔ انھیں ہر وقت بندروں سے خطرہ رہتا ہے۔ میں تمام جانداروں کی حرمت کا قائل ہوں اور اسے اہنسا کی خلاف ورزی سمجھتا ہوں

کہ بندروں کو کسی قسم کا نقصان پہنچایا جائے۔ مگر بے تامل اِس کا اہتمام کرتا ہوں کہ اِن بندروں پر حملہ کر کے فصل کو بچایا جائے۔ اگر ممکن ہوتا تو میں اِس بُرے کام سے پرہیز کرتا، مگر اُس سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ میں اِس ادارے کو چھوڑ دوں یا اُسے ختم کر دوں۔ اور یہ میں اِس لیے نہیں کرتا کہ مجھے دُنیا میں کوئی ایسی سماج نہیں مل سکتی جہاں کھیتی نہ ہوتی ہو اور اُس کی حفاظت کے لیے جانوروں کو مارنے کی ضرورت نہ پڑتی ہو۔

اس لیے میں خوف سے لرزتے ہوئے عاجزی اور ندامت کے ساتھ بندروں کو مار بھگانے کی مہم میں شریک ہوتا ہوں، اِس اُمید کے ساتھ کہ شاید کسی دن اس مشکل کا کوئی حل نکل آئے۔

اِسی طرح میں ان تین لڑائیوں میں بھی شریک ہوا۔ میرا جس سماج سے تعلق ہے اُسے چھوڑ نہیں سکتا۔ اگر ایسا کروں تو یہ دیوانگی کی حرکت ہوگی۔ ان تینوں موقعوں پر میرے دل میں برطانوی حکومت سے ترکِ تعاون کا خیال نہ تھا۔ مگر آج اِس حکومت کے بارے میں میرا رویہ بالکل مختلف ہے۔ اِس لیے میں کبھی اپنی خوشی سے اس کی لڑائیوں میں شریک نہیں ہوں گا اور اگر مجھے ہتھیار اُٹھانے پر یا کسی اور شکل میں جنگی کارروائی میں شرکت کرنے پر مجبور کیا جائے تو ہرگز اس پر تیار نہ ہوں گا چاہے اِس میں جیل میں جانے یا پھانسی پر چڑھنے کا خطرہ کیوں نہ ہو۔

مگر ابھی اِس مسئلے کی ساری پیچیدگیاں دور نہیں ہوئیں۔ اگر قومی حکومت ہوتی تب بھی میں براہِ راست لڑائی میں حصہ نہ لیتا مگر ایسے موقعوں کا تصور کر سکتا ہوں جب میں اپنا فرض سمجھتا کہ جو لوگ فوجی ٹریننگ حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے ٹریننگ کا انتظام کرنے کے حق میں رائے دوں۔ اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ قوم کے سب افراد اہنسا کے اِس حد تک قائل نہیں جس حد تک میں ہوں۔ کسی فرد کو یا سماج کو زبردستی اہنسا پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

اہنسا کا عمل بڑے پُراسرار طریقے سے واقع ہوتا ہے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص کے افعال کا جائزہ اہنسا کے نقطۂ نظر سے لینا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اُس کے افعال بہ ظاہر ہنسا پر مبنی نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں اہنسا کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار کے مطابق ہوتے ہیں۔ اور آگے چل کر اُن کا تشدد سے پاک ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ بہرحال، میں اپنے طرزِ عمل کے بارے میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ جن واقعات کا اوپر ذکر آیا ہے، اُن میں میں نے جو کچھ کیا اپنے نزدیک اہنسا کے مقصد کے ماتحت کیا۔ اس میں کوئی ادنیٰ درجہ کی قومی غرض یا کوئی اور غرض شامل نہ تھی۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ قومی مصلحت یا کسی اور مصلحت کی خاطر کسی اخلاقی قدر کو قربان کیا جائے۔

میں اس بحث کو آگے نہیں بڑھاؤں گا۔ زبان بہرحال انسان کے خیالات کو ظاہر کرنے کا ایک ناقص ذریعہ ہے میرے لیے اہنسا محض ایک فلسفیانہ اصول نہیں ہے۔ میرا قانونِ حیات ہے۔ میری روحِ زندگی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اکثر میں اس پر عمل کرنے سے قاصر رہتا ہوں، کبھی کبھی شعوری طور پر زیادہ تر غیر شعوری طور پر۔ اس کا تعلق دماغ سے نہیں ہے، دل سے ہے۔ سچی ہدایت انسان کو اس طرح ملتی ہے کہ عجز و انکسار، حضورِ قلب کے ساتھ خدا سے لو لگائے۔ اور ہمیشہ اپنی جان قربان کرنے کو تیار رہے اہنسا پر عمل کرنے کے لیے انتہائی ہمت وجرأت کی ضرورت ہے۔ مجھے بڑے دُکھ کے ساتھ اپنی کوتاہیوں کا احساس ہے۔ لیکن میرے سینے میں شمعِ ایمان روشن ہے اور اُس کی لَو کبھی جھلملائی نہیں۔ ہم میں سے کسی کی نجات بغیر سچائی اور اہنسا کے ممکن نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ جنگ ناجائز ہے۔ سراسر بُری ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کو ختم کرنا نہایت ضروری ہے۔ میرا ایقا عقیدہ ہے کہ جو آزادی خونریزی کے ذریعہ حاصل کی جائے وہ حقیقت میں آزادی

نہیں ہے۔ مجھے یہ منظور ہے کہ جو الزام مجھ پر لگائے جاتے ہیں، وہ سب نا قابلِ تردید قرار پائیں، مگر یہ گوارا نہیں کہ میرے کسی فعل سے اہنسا کے اصول پر حرف آئے یا یہ سمجھا جائے کہ میں تشدد یا جھوٹ کا کسی صورت میں کسی شکل میں حامی ہوں۔ تشدد اور جھوٹ نہیں بلکہ عدم تشدد اور سچائی ہماری زندگی کا قانون ہے۔ (۱۱۸)

مجھے اپنی کوتاہیوں کا احساس ہے اور یہی احساس میری واحد قوت ہے۔ مجھے اپنی زندگی میں جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی۔ زیادہ تر اسی وجہ سے ہوئی کہ میں اپنی خامیوں سے واقف ہوں۔ (۱۱۹)

مجھے عمر بھر اس کی عادت رہی ہے کہ لوگ مجھ پر غلط الزام لگائیں۔ یہ تو ہر قومی کارکن کو بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ اس کو زیادہ حساس نہیں ہونا چاہیے۔ اگر انسان ہر الزام کا جواب دینا ہے، تو زندگی دشوار ہو جائے۔ میں نے تو اپنی زندگی کا اصول بنا لیا ہے کہ جو الزام مجھ پر لگائے جاتے ہیں۔ ان کا کبھی جواب نہیں دیتا سوا اس کے کہ قومی مقصد کی خاطر ان کا جواب دینا ضروری ہو۔ اس اصول کی بدولت میرا بہت سا وقت بچ گیا۔ اور میں خواہ مخواہ کی فکر اور پریشانی سے محفوظ رہا۔ (۱۲۰)

مجھے صرف ایک چیز کا دعوے ہے کہ میں عدم تشدد اور سچائی کا پیرو ہوں۔ میں فوقِ انسانی قوتوں کا دعویدار نہیں ہوں اور نہ مجھے ان کی خواہش ہے۔ میرا جسم اسی طرح فانی ہے جیسے میرے کمزور سے کمزور ہم جنس کا اور میں اتنا ہی خطاکار ہوں جتنا کوئی اور انسان۔ جو خدمات میں نے انجام دیں ان میں کوتاہیاں ہیں، مگر خدا نے ان سب خامیوں کے باوجود انھیں کامیابی عطا فرمائی۔

اپنی خطاؤں کا اعتراف ایک جھاڑو کی طرح ہے جس سے سطحِ قلب کی گرد جھڑ جاتی ہے۔ اور وہ پہلے کے مقابلے میں صاف ہو جاتی ہے۔ مجھے اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ میری قوت پہلے سے بڑھ گئی۔ اور اس طرح

قدم پیچھے ہٹانے سے قومی مقصد کو نقصان نہیں بلکہ فائدہ پہنچے گا۔ راہِ راست سے منحرف ہو کر انسان کبھی اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکا ہے۔ (۱۲۱)

بے چارے مہاتما کو میں تقدیر کے حوالے کرتا ہوں۔ اگرچہ میں حکومت سے ترکِ تعاون کر چکا ہوں۔ لیکن ایسے مسودۂ قانون کی بڑی خوشی سے تائید کروں گا۔ جس کی رو سے مجھے مہاتما کہنا اور میرے پیر چھونا جرم قرار دیا جائے۔ جہاں میرا قانون چلتا ہے۔ یعنی آشرم میں۔ وہاں یہ فعل جرم سمجھا جاتا ہے۔ (۱۲۲)

اب میں اُس مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں میری آپ بیتی کو ختم ہونا چاہیے اس کے بعد میری زندگی کے واقعات اس طرح منظرِ عام پر آ رہے ہیں کہ لوگ ان سے اچھی طرح واقف ہیں ____ میری زندگی ہمیشہ ایک کھلی کتاب رہی ہے نہ میں کوئی بات چھپاتا ہوں۔ نہ کسی کو یہ رائے دیتا ہوں کہ وہ اپنی کسی بات کو چھپائے۔ (۱۲۳)

مجھے برابر یہی تجربہ ہوا ہے کہ حق کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور اگر اس کتاب کا ہر صفحہ پکار پکار کر نہ کہے کہ حق کو حاصل کرنے کا واحد ذریعہ اہنسا ہے تو میں یہ سمجھوں گا کہ ان اوراق کو لکھنے میں جتنی محنت میں نے کی وہ برباد ہو گئی۔ اور فرض کیجیے اِس معاملہ میں میری سعی رائیگاں ہو تو اسے میرے بیان کا قصور سمجھنا چاہیے نہ کہ اہنسا کے عظیم اصول کا۔ (۱۲۴)

جب سے میں ہندوستان واپس آیا ہوں۔ میرے دل میں نفسانی خواہشات کی دبی آگ سلگتی رہتی ہے۔ اس سے مجھے ندامت کا احساس ہوتا ہے مگر مایوسی کا نہیں۔ میرے روحانی تجربے میرے لیے مسرت اور تقویت کا باعث ہیں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ مجھے ابھی بہت کٹھن منزل سے گزرنا ہے۔ جب تک میں اپنے آپ کو بالکل مٹا نہ دوں مجھے چین نہیں آئے گا انسان کی نجات اسی پر موقوف ہے۔

کہ وہ اپنے آپ کو خدا کی مخلوق میں سب سے کمتر سمجھنے لگے۔ اہنسا عجز و انکسار کی آخری حد کا نام ہے۔ (۱۲۵)

مجھے اس کی خواہش نہیں کہ لوگ میرا رعب مانیں۔ اس کی ضرورت تو بادشاہوں کے دربار میں ہوتی ہے۔ میں مسلمانوں، عیسائیوں، پارسیوں اور یہودیوں کا اسی طرح خادم ہوں جیسے ہندوؤں کا۔ اور خادم کو محبت کی ضرورت ہوتی ہے رعب داب کی نہیں۔ اور یہ مجھے یقین ہے کہ اگر میں وفاداری سے خدمت کرتا رہوں تو محبت مجھے ضرور ملے گی۔ (۱۲۶)

نہ جانے کیا بات ہے کہ مجھے یورپ اور امریکہ جانے سے ڈر لگتا ہے۔ اس کی وجہ نہیں کہ میں ان عظیم اقلیموں کے لوگوں پر بھروسہ نہیں کرتا۔ بلکہ اصل میں مجھے اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہے۔ نہ مجھے صحت کی یا سیر کی خاطر مغربی ملکوں کے سفر کی خواہش ہے اور نہ عام جلسوں میں تقریر کرنے کا شوق ہے۔ مجھے اس سے چڑ ہے کہ لوگ مجھے بڑا آدمی سمجھ کر آسمان پر چڑھائیں۔ شاید اب میری صحت بھی اس زبردست بوجھ کو برداشت نہ کر سکے۔ جو عام جلسوں میں تقریر کرنے اور عام مظاہروں سے پڑتا ہے۔ اگر خدا کو کبھی یہ منظور ہوا کہ میں مغربی ملکوں میں جاؤں تو میں وہاں اس غرض سے جاؤں گا کہ عوام کے دلوں میں جگہ کروں۔ نوجوانوں کے ساتھ سکون اور اطمینان کے ساتھ گفتگو کروں اور اپنے ہم مشربوں سے یعنی اُن لوگوں سے ملوں جو امن کی خاطر سچائی کے سوا ہر چیز کو قربان کرنے کو تیار ہیں۔

مگر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ابھی تک میرے پاس کوئی ایسا پیام نہیں جو میں بذاتِ خود مغرب کے لوگوں کو پہنچاؤں۔ یوں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرا پیام ساری دُنیا کے لیے ہے۔ مگر ابھی تک میرا یہ خیال ہے کہ اس پیام کو پہنچانے کا سب سے اچھا ذریعہ وہ کام ہے، جو میں ملک میں کر رہا ہوں۔ اگر میں یہ دکھا سکوں کہ مجھے

ہندوستان میں صریحی طور پر کامیابی ہوئی تو میری پیام رسانی مکمل ہو جائے لیکن اگر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندوستان میں میرے پیام کی کوئی قدر نہیں تو مجھے یہ گوارا نہیں ہوگا۔ کہ اس کی سچائی پر عقیدہ رکھنے کے باوجود میں سننے والوں کی تلاش میں اور کسی ملک میں جاؤں اگر میں نے کبھی ہندوستان سے باہر قدم رکھنے کی جرأت کی تو وہ اسی بنا پر ہو گی کہ میرے خیال میں میرا پیام اپنے ملک میں دھیرے دھیرے مقبول ہو رہا ہے۔ اگرچہ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں دے سکتا جو ہر شخص کو مطمئن کر دے۔

چنانچہ جب میں اپنے دوستوں سے جنہوں نے مجھے دعوت دی تھی برابر خط و کتابت کر رہا تھا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ مجھے اگر کسی اور وجہ سے نہیں تو روما رولاں سے ملنے کے لیے جانے کی ضرورت ہے بغیر کسی معقول وجہ کے میں یورپ جانے سے ہچکچا رہا تھا۔ اس لیے اپنے سفر کی خاص غرض یہ قرار دینا چاہتا تھا کہ مغرب کے اس دانشمند سے ملاقات کروں۔ چنانچہ میں نے اپنی مشکل ان کے سامنے پیش کی اور ان سے صاف صاف پوچھا کہ کیا وہ مجھے اس خاص غرض سے یورپ کے سفر کا مشورہ دیتے ہیں؟ ان کا جواب آیا ہے کہ سچائی کا یہ تقاضا ہے کہ اگر میرے سفر یورپ کی اصل وجہ ان سے ملنا ہے تو وہ مجھے اس سے باز رکھیں۔ انھیں یہ گوارا نہیں کہ میں اس ملاقات کے لیے ان کاموں کو جو میں یہاں کر رہا ہوں چھوڑ کر جاؤں اور مجھے اس ملاقات کے سوا اور کسی چیز کے لیے کوئی اور اندرونی تحریک محسوس نہیں ہوتی۔ مجھے اس فیصلے کا افسوس ہے۔ مگر بظاہر یہ بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے یورپ جانے کے لیے تو اندر سے کوئی تقاضا نہیں ہے اور یہاں بہت سے کام کرنے ہیں جن کے لیے ہر وقت یہ تقاضا محسوس ہوتا رہتا ہے۔ (۱۲۸)

میں سمجھتا ہوں کہ میں دنیا میں کسی شخص سے نفرت کر ہی نہیں سکتا۔ ایک مدت کی دعاؤں اور ریاضتوں کے بعد مجھے یہ بات حاصل ہوئی کہ پچھلے چالیس برس میں

میں نے کسی سے نفرت نہیں کی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے۔ پھر بھی نہایت عجز و انکسار کے ساتھ میں دعویٰ کرتا ہوں۔ البتہ بدی سے خواہ وہ کسی شکل میں ہو میں نفرت کرسکتا ہوں اور کرتا ہوں۔ مجھے اس نظام حکومت سے نفرت ہے جس نے بے دردی سے ہندوستان کو لوٹا جا رہا ہے۔ اس سے مجھے نفرت ہے اور چھوت چھات کے مکروہ نظام سے جس کی ذمہ داری کروڑوں ہندوؤں پر عائد ہوتی ہے، میں دل وجان سے نفرت کرتا ہوں۔ مگر میں ان انگریزوں اور ہندوؤں سے نفرت نہیں کرتا ہوں۔ جنہوں نے دوسروں کو دبا رکھا ہے جنہوں نے اپنے ہم جنسوں کو دبا رکھا ہے۔ میں ان تمام محبت آمیز طریقوں سے جو میرے لیے ممکن ہیں۔ اُن کی اصلاح کی کوشش کرتا ہوں۔ (۱۲۹)

کچھ دن ہوئے آشرم میں ایک گائے کا بچھڑا زخمی ہوکر بالکل معذور ہوگیا تھا۔ اور تکلیف سے پڑا سسک رہا تھا۔ جو کچھ دوا علاج دیکھ بھال ممکن تھی وہ کی جا چکی تھی جانوروں کا سرجن جس سے اِس معاملہ میں مشورہ کیا گیا۔ وہ کہہ چکا تھا کہ اب کوئی اُمید اور تدبیر باقی نہیں رہی۔ اُس کی تکلیف اِس قدر شدید تھی کہ ہر ایک کروٹ میں درد سے تڑپ اُٹھتا تھا۔

اِن حالات میں میں نے انسانیت کا تقاضا یہی سمجھا کہ اُسے جان سے مار کر اِس اذیت سے چھٹکارا دلایا جائے یہ معاملہ پورے آشرم کے سامنے رکھا گیا۔ بحث کے دوران میں ایک بھلے مانس نے جو ہمارے ہمسائے میں رہتے تھے۔ اس بات کی بڑی شدت سے مخالفت کی کہ کسی جاندار کی جان لی جائے چاہے وہ اسے اذیت سے بچانے کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ اُن کی دلیل یہ تھی۔ کہ جو جان دے نہیں دے سکتا۔ اُسے جان لینے کا حق نہیں ہے۔ مجھے یہاں یہ دلیل بالکل بے تکی معلوم ہوئی تُک کی بات تب ہوتی جب جان خودغرضی کی بنا پر لی جاتی۔ آخر میں نہایت عاجزی

سے مگر پورے یقین اور وثوق کے ساتھ میں نے اپنے سامنے بچھڑے کو ڈاکٹر سے زہر کا انجکشن دلوایا تاکہ زندگی سے چھٹکارا پلائے سارا کام دو منٹ میں ختم ہو گیا۔

میں جانتا تھا کہ رائے عامہ خصوصاً احمد آباد میں میرے اس فعل کو نا پسند کرے گی۔ اور اُسے تشدّد کے سوا اور کچھ نہ سمجھے گی۔ مگر میرا یہ خیال تھا اور ہے کہ انسان کو اپنے فرض کے ادا کرنے کے سلسلے میں رائے عامہ سے متاثر نہ ہونا چاہئے۔ میں ہمیشہ سے اس کا قائل ہوں کہ انسان کو وہی کرنا چاہیے جسے وہ صحیح سمجھتا ہے۔ چاہے دوسروں کے نزدیک وہ غلط ہو اور تجربے سے ثابت ہو گیا ہے کہ اس کے سوا اور کوئی مناسب طریقہ نہیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔ "محبت کی راہ میں انگاروں پر چلنا پڑتا ہے۔ جو بودے ہیں وہ اُس پر قدم رکھنے سے کتراتے ہیں۔" یعنی اہنسا کی راہ اکثر انسان کو اکیلے ہی طے کرنی پڑتی ہے۔ مجھ سے بجا طور پر یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ بچھڑے کے بارے میں جو اصول میں نے بیان کیا ہے کیا اُسے انسانوں پر بھی عاید کر سکتا ہوں؟ کیا اُسے اپنے آپ پر عاید کرتے کو تیار ہوں؟" میرا جواب یہ ہے "کہ ہاں، یہ اُن دونوں صورتوں میں عاید ہوتا ہے۔" اس قانون میں کہ جو ایک کے ساتھ ہو وہی سب کے ساتھ ہو۔" کسی استثناء کی گنجائش نہیں، ورنہ پھر بچھڑے کو مارنا بھی ناجائز اور تشدّد پر مبنی ٹھہرے گا۔ مگر عملاً ہم اپنے بیمار عزیزوں کے دُکھ کا خاتمہ موت کے ذریعہ سے نہیں کرتے۔ کیونکہ عام طور پر ہمارے پاس اُن کی مدد کرنے کی کوئی نہ کوئی تدبیر ہوتی ہے اور پھر اُن میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے بارے میں خود سوچیں اور فیصلہ کریں۔ مگر فرض کیجئے کہ میرا کوئی دوست بیمار ہے۔ میں اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ مرض میں افاقے کا کوئی امکان نہیں اور مریض بے ہوش پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ ایسی صورت میں مجھے اس میں کوئی تشدّد نظر نہیں آتا کہ اُس کی تکلیف کو موت کے ذریعہ ختم کر دیا جائے۔

جس طرح ایک سرجن کا اپنے چاقو سے کام لینا ہنسا نہیں بلکہ خالص اہنسا ہے

اسی طرح بعض صورتوں میں بالکل مجبور ہو کر ہمیں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے کہ ایک قدم اور آگے بڑھیں اور غریب دُکھیارے کی ہمدردی میں جسم و جان کا رشتہ قطع کردیں ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ سرجن تو آپریشن مریض کی جان بچانے کے لیے کرتا ہے اور ہمارا طرز عمل اس سے برعکس ہوگا۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ آخری مقصد تو دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے کہ جسم کے اندر جان کو دُکھ سے نجات ملے۔ پہلی صورت میں آپ اس کی خاطر روگی حصے کو کاٹ کر جسم سے الگ کرتے ہیں اور دوسری صورت میں روگی جسم کو جان سے جس کو اُس نے عذاب میں ڈال رکھا ہے الگ کر دیتے ہیں، دونوں صورتوں میں ہمارا مقصد جان کو دُکھ سے نجات دینا ہے، اس لیے کہ بے جان جسم کو تو دُکھ سُکھ کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اس قسم کی اور صورتوں کا تصور کیا جا سکتا ہے جن میں مار ڈالنا اہنسا اور نہ مارنا ہنسا قرار پائے گا۔ مثلاً فرض کیجیے میری لڑکی کو جس کی مرضی معلوم کرنا اس وقت میرے امکان میں نہیں ہے، کوئی شخص عصمت دری کی دھمکی دے رہا ہے اور میں کسی طرح لڑکی کی حفاظت نہیں کرسکتا تو یہ خالص اہنسا کا فعل ہوگا کہ میں اُسے مار ڈالوں اور اپنے آپ کو اس بدمعاش حملہ آور کے قہر و غضب کے حوالے کر دوں۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے اہنسا وادیوں نے اہنسا کو ایک عجیب و غریب بُت بنا لیا ہے اور اس طرح سچی اہنسا کے پھیلنے میں بڑی زبردست رکاوٹ ڈال دی ہے۔ اہنسا کے مروجہ تصور نے جو میرے خیال میں سراسر غلط ہے، ہمارے ضمیر کو نشے میں ایسا مدہوش کر دیا ہے کہ ہمیں ہنسا کی ان بہت سی قسموں کی طرف سے جو چپکے چپکے دہر پھیلاتی ہیں، بے حس کر دیا ہے۔ جیسے سخت کلامی، سخت گیری، بد اندیشی، غصہ، کینہ جوئی اور ایذا پسندی، اُس نے ہمیں یہ بھلا دیا ہے کہ ہمدردی کی بنا پر کسی کی جان لینے سے کہیں زیادہ ہنسا انسانوں اور جانوروں کو دھیرے دھیرے رگڑنے، خود غرضی سے لوٹنے اور بھوکوں مارنے، کمزوروں کو ستانے اور ذلیل کرنے میں ہے۔ جس کا

ہم آج کل روزمرہ مشاہدہ دیکھتے رہتے ہیں۔ کیا کسی شخص کو ایک لمحے کے لیے بھی اِس میں شبہ ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو امرتسر کی بدنام سڑک پر کیڑوں کی طرح پیٹ کے بل پہ رینگنے پر مجبور کیا گیا۔ وہ کھڑے کھڑے قتل کر دیے جاتے تو اس سے کہیں زیادہ انسانیت اور ہمدردی کا سلوک ہوتا۔ اگر کوئی شخص ترکی بہ ترکی جواب دے کہ خود ان لوگوں کا تو کچھ اور ہی خیال ہے ان کا تو پیٹ کے بل رینگنے سے کچھ نہیں بگڑا تو میں یہ کہوں گا کہ وہ اہنسا کی الف بے تک نہیں جانتا۔ انسان کی زندگی میں ایسے موقع آتے ہیں جب اُس کا ناگزیر فرض ہوتا ہے کہ جان پر کھیل جائے۔ انسانی عزت و وقار کے اِس بنیادی اصول کو نظرانداز کرنا اہنسا کی بنیادی حقیقت سے ناواقف ہونے کی دلیل ہے مثلاً اہنسا کا پجاری اپنے دشمن کے آگے گھٹنے ٹیک کر گڑگڑا لے گا۔ کہ مجھے مار ڈالو مگر ذلیل نہ کرو اور مجھ سے ایسے کام نہ کراؤ جو انسانی وقار کے خلاف ہوں۔ شاعر نے کہا ہے۔

"رضائے الٰہی کی راہ بہادروں کے لیے ہے نہ کہ بزدلوں کے لیے۔"

یہی اہنسا کا بنیادی طور پر غلط تصور، یہی اقدار کی اضافی اہمیت کا غلط اندازہ ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارے دیس میں اہنسا کا مفہوم محض "جان نہ لینا" سمجھ لیا گیا ہے اور اہنسا کے نام سے خوفناک حد تک ہنسا کی جاتی ہے۔ (۱۳۰)

مجھے سچائی "مہاتمائی" سے کہیں زیادہ عزیز ہے، مجھے اپنی کمزوریوں کا اور اپنے ناچیز ہونے کا علم ہے اور اِسی نے مجھے مہاتمائی کے بوجھ کے نیچے دب کر رہ جانے سے بچایا ہے میں یہ تکلیف دہ احساس رکھتا ہوں کہ جسمانی بقا کی بدولت میں برابر ہنسا میں مبتلا رہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں روز بروز اپنے جسم سے بے پروا ہوتا جاتا ہوں۔ مثلاً میں جانتا ہوں کہ سانس لینے میں بے شمار جراثیم کو جو نظر نہیں آتے، مگر ہوا میں تیرتے رہتے ہیں، ہلاک کر دیتا ہوں۔ مگر میں سانس لینا نہیں چھوڑتا۔ سبزی

ترکاری کھانے میں بھی ہنسا ہوتی ہے مگر اُسے ترک نہیں کرتا۔ اسی طرح جراثیم کش دواؤں کے استعمال میں ہنسا ہے۔ مگر میں مچھروں وغیرہ سے بچنے کے لیے مٹی کے تیل یا اسی قسم کی چیزوں کے استعمال کو بند نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ آشرم سے بیلوں کو ڈنڈے مار کر بھگا دیا جاتا ہے تو میں اسے بھی برداشت کر لیتا ہوں۔ غرض جو ہنسا بالواسطہ اور بلا واسطہ کرتا ہوں اُس کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ اور اب مجھے بندروں کے مسئلے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ میں پڑھنے والوں کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ابھی انھیں جلد ہلاک کرنے کا انتہائی قدم نہیں اُٹھاؤں گا۔ سچ پوچھیے تو مجھے یہ بھی یقین نہیں کہ میں آگے چل کر اُنھیں ہلاک کرنے کا فیصلہ کر سکوں گا۔ مگر یہ وعدہ نہیں کر سکتا کہ میں ان بندروں کو کبھی نہیں ماروں گا۔ چاہے وہ آشرم کی ساری فصل برباد کر دیں چاہے اس اعتراف کے نتیجے کے طور پر میرے دوست میری طرف سے مایوس ہو جائیں۔ مگر میں کسی حالت میں بھی ان کوتاہیوں کو چھپانے کی کوشش نہیں کروں گا جو مجھ سے اہنسا پر عمل کرنے میں رہ جاتی ہیں۔ میرا دعویٰ صرف یہ ہے کہ میں برابر اس کوشش میں لگا ہوا ہوں کہ اہنسا جیسے عظیم نصب العین کے تقاضوں کو بھول اور اُنھیں خیال، قول اور عمل میں پورا کروں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ ابھی مجھے اس راہ میں بہت بڑا فاصلہ طے کرنا ہے۔ (۱۳۱)

میں ایک غریب بھکاری ہوں۔ مالِ دُنیا میں سے میرے پاس چھ چرخے، جنیل کے کھانے کے برتن، ایک دودھ کی بالٹی، چھ کھدر کی دھوتیاں اور تولیہ اور میری ذاتی شہرت ہے جس کی قیمت کچھ زیادہ نہیں ہے۔ (۱۳۲) [1]

جب میں نے دیکھا کہ میں سیاست کے پھندے میں پھنس گیا ہوں تو میں نے جی میں سوچا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے کہ میں بددیانتی، جھوٹ اور سیاست کو ذاتی فائدے

---

[1] یہ بیان گاندھی جی نے ۱۱ ستمبر ۱۹۳۱ء کو مارسیلز کسٹم کے کارکن کو دیا تھا۔

کا ذریعہ بنانے سے بچا رہوں ۔ میں اِس واضح نتیجہ پر پہنچا کہ اگر میں ان لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں جن کے درمیان میری زندگی بسر ہو رہی ہے ۔ اور جن کی مشکلوں اور مصیبتوں کو میں روزمرہ دیکھتا رہتا ہوں تو مجھے ساری دولت ساری املاک سے دست بردار ہونا چاہیئے ۔

میں سچائی کے ساتھ یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ جب میرے دل میں یہ بات آئی تو میں نے فوراً ان سب چیزوں کو ترک کر دیا ۔ مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ شروع میں اِس عمل کی رفتار بہت سست تھی ۔ اور جب میں اِس کشمکش کے زمانے کا دھیان کرتا ہوں تو یہ بھی یاد آتا ہے کہ ابتدا میں یہ میرے لئے بہت تکلیف دہ بھی تھا ۔ مگر جوں جوں دن گزرتے گئے میرے دل میں یہ بات بیٹھتی گئی کہ مجھے اور بھی بہت سی چیزوں کو جنھیں میں اپنی ملک سمجھتا تھا ، چھوڑنا ہوگا ۔ اور ایک ایسا وقت آیا کہ ان چیزوں کو ترک کرنے میں سچ مچ خوشی محسوس ہونے لگی ۔ پھر تو بڑی تیزی کے ساتھ ایک ایک کر کے ساری چیزیں میرا ساتھ چھوڑتے لگیں اور اِس وقت جب میں اپنے تجربوں کا حال لکھ رہا ہوں میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرے کندھے پر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے ۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ اب میں آسانی سے قدم اُٹھا سکتا ہوں اور اپنے بنی نوع کی خدمت بڑے آرام اور بڑی خوشی سے کر سکتا ہوں ۔ اب کسی چیز کو اپنی ملکیت میں رکھنا مجھے ایک مصیبت اور بوجھ معلوم ہونے لگا

جب میں نے اس کا کھوج لگانا شروع کر دیا کہ آخر اِس خوشی کی کیا وجہ ہے تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ اگر میں کسی چیز کو اپنی ملکیت بنا کر رکھوں تو مجھے دُنیا بھر کے لوگوں سے اس کی حفاظت کرنی ہوگی ۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگوں کو اس کی ضرورت ہے ، مگر وہ ان کے پاس نہیں ہے ۔ اور اگر کچھ بھوکے اور قحط کے مارے مجھے ایک سنسان جگہ میں پا کر نہ صرف اس چیز میں حصہ بٹانا بلکہ ساری کی ساری چھین لینا چاہیں تو مجھے پولیس سے

مدد لینے کی ضرورت ہوگی۔ اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر انھیں اُس کی ضرورت ہو اور وہ مجھ سے چھین لیں تو اُن کا یہ عمل بُغض یا حسد کی وجہ سے نہیں ہوگا۔ بلکہ محض اِس وجہ سے کہ اُنھیں اُس کی ضرورت مجھ سے زیادہ ہے۔

پھر میں نے اپنے آپ سے کہا مجھے تو املاک کا رکھنا جُرم معلوم ہوتا ہے۔ میں اُنہی چند چیزوں کو رکھ سکتا ہوں جن کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ دوسرے لوگ بھی اگر چاہیں تو حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر ہم جانتے ہیں اور ہم میں سے ہر شخص کو اُس کا تجربہ ہے کہ یہ بات ناممکن ہے، اِس لیے صرف ایک ہی چیز ہے کہ جو سب کے لیے ممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم کوئی چیز بھی نہ رکھیں یا دوسرے الفاظ میں ہر چیز کو خوشی سے ترک کر دیں۔.........

چنانچہ جب میں اس اصول پر کامل عقیدہ رکھتا ہوں تو مجھے ہر وقت یہی آرزو رہنی چاہیے کہ جب خدا کی مرضی ہو تو اُس کی راہ میں اپنے جسم کو بھی ترک کر دوں۔ اور جب تک میرے پاس رہے میں اُسے عیش و عشرت اور راحت و مسرت کے لیے استعمال نہ کروں بلکہ نیند کے چند گھنٹوں کو چھوڑ کر سارا وقت خدمت اور صرف خدمت کے لیے۔ اور اگر یہ اصول جسم کے بارے میں صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ پہننے کے کپڑوں اور دوسری چیزوں کے بارے میں جو ہم استعمال کرتے ہیں۔۔ اور بھی زیادہ صحیح ہوگا۔

اور وہ لوگ جنھوں نے اپنی خوشی سے غربت کی زندگی اختیار کرنے کے عہد پر حتی الامکان زیادہ سے زیادہ دکامل طور پر تو ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر جہاں تک انسان کے لیے ممکن ہے اِس حد تک) عمل کیا ہے، یہ کہتے ہیں کہ جب انسان اپنی ساری املاک کو چھوڑ دے تو حقیقت میں وہ تمام دُنیا کے خزانوں کا مالک ہو جاتا ہے۔ (۱۴۳)

میں نے نوجوانی کے زمانے سے یہ بات سیکھ لی تھی کہ مذہبی کتابوں کی قدر و قیمت کا اندازہ اُن کی اخلاقی تلقین کی بنیاد پر کرو۔ معجزوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اگر میں اِن معجزوں پر جو حضرت عیسیٰؑ سے منسوب کیے جاتے ہیں لفظ بہ لفظ یقین رکھتا تب بھی

میں اُن کی تعلیم کے کسی جز کو جو عالمگیر اخلاقی معیار پر پورا نہ اُترتا، قبول نہ کرتا۔ بہر حال مذہبی ہادیوں کی زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں اُن میں میرے لیے اور میں سمجھتا ہوں کہ اور کروڑوں آدمیوں کے لیے ایک ایسی جیتی جاگتی قوت ہوتی ہے جو اُن ہی الفاظ میں جب وہ معمولی آدمیوں کی زبان سے نکلیں نہیں ہوتی۔

حضرت عیسےٰ میرے نزدیک عالمگیر ہادیانِ مذہب میں سے ہیں، بے شک اُن کے زمانہ کے لوگ اُنھیں "خدا کا اکلوتا حقیقی بیٹا" مانتے تھے۔ یہ ضروری نہیں کہ میں بھی یہی عقیدہ رکھوں۔ اگر میں اُنھیں خدا کے بہت سے حقیقی بیٹوں میں سے ایک مانتا ہوں تو جو اثر اُن کا میری زندگی پر پڑتا ہے۔ اِس میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ حقیقی بیٹے کا مفہوم محض روحانی اولاد سے زیادہ گہرا اور غالباً زیادہ شاندار ہے۔ اپنے زمانہ میں وہ خدا سے زیادہ قریب تھے۔

حضرت عیسےٰ نے اپنے پیروؤں کے گناہوں کا کفارہ اِس طرح ادا کیا کہ وہ اُن کے لیے ایک پاک اور معصوم ہستی کی مثال بن گئے۔ لیکن یہ مثال اُن لوگوں کے لیے بے کار تھی جنھیں خود اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی گوارا نہ تھی۔ جو لوگ اپنے گناہوں سے توبہ کرکے نئی زندگی شروع کرتے ہیں وہ آلودگی سے اِس طرح پاک ہو جاتے ہیں جیسے تپایا ہوا سونا میل سے۔

میں نے بہت سے گناہوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ مگر میں اُن کا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھائے نہیں پھرتا۔ اگر میرے قدم خدا کی طرف اُٹھ رہے ہیں جیسا کہ میں سمجھتا ہوں تو پھر مجھے کوئی ڈر نہیں۔ مجھے اِس مہرِ منور کے پرتو سے گرمی اور روشنی پہنچتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اگر میں اپنے زہد و ریاضت اور تسبیح و عبادت پر بھروسا رکھوں کہ وہ میری اصلاح کے لیے کافی ہیں تو وہ بالکل بے قدر ثابت ہوں گے۔ لیکن اگر وہ، جیسی کہ مجھے اُمید ہے، اُس آزردگی کی علامت ہیں کہ ایک

تھکا ماندہ عاجز و ناچار بندہ اپنا سر اپنے خالق کی گود میں رکھ دے تو اُن کی قدر و قیمت بے اندازہ ہے۔ (۱۳۴)

ایک انگریز دوست پچھلے تیس سال سے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور مجھے یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہندو دھرم سے عاقبت خراب ہوتی ہے اور مجھے عیسائی مذہب قبول کر لینا چاہیے۔ جب میں جیل میں تھا۔ تو مجھے تین مختلف آدمیوں نے "سینٹ تھریزہ کی سوانح عمری" کے تین نسخے بھیجے' اِس اُمید میں کہ میں اِن محترم خاتون کی طرح حضرت عیسےٰ کو "خدا کا واحد حقیقی بیٹا" اور اپنا نجات دہندہ مان لوں گا۔ میں نے حضورِ قلب کے ساتھ اِس کتاب کا مطالعہ کیا۔ مگر میں سینٹ تھریزہ کی سند کو بھی قبول نہ کر سکا۔ ہاں' میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اِس معاملے کے بارے میں کھُلا ذہن رکھتا ہوں (اگر بڑھاپے کی منزل پر کھُلا ذہن رکھنا ممکن ہے) بہرحال اِس معنی میں کھلا ذہن رکھنے کا تو میں دعوےٰ کر سکتا ہوں کہ اگر مجھ پر وہ واردات گزرے جو سال پر پاآل بننے سے پہلے گزری تو میں ضرور اِس عقیدے کو قبول کر لوں گا۔ مگر آج تو میں سوارج عیسائیت سے بغاوت کرتا ہوں اِس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ اُس نے حضرت عیسےٰ کے پیغام کو مسخ کر دیا ہے۔ وہ ایشیا کے رہنے والے تھے اور اُن کا پیغام دُنیا کو مختلف ذریعوں سے پہنچا' جب سے اُسے رومی شہنشاہوں کی حمایت حاصل ہوئی۔ وہ ایک سامراجی مذہب بن گیا اور اب تک ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ بہت سے عالی نقش عیسائی اِس کلیے سے مستثنٰی ہیں لیکن عام رجحان وہی ہے جو میں نے بتایا۔ (۱۳۵)

میرا ذہنی دائرہ محدود ہے۔ میں نے بہت کم کتابیں پڑھی ہیں اور بہت کم دُنیا دیکھی ہے۔ میں نے زندگی میں اپنی ساری توجہ چند خاص چیزوں پر صرف کی اور اُن کے سوا مجھے کسی چیز سے دلچسپی نہیں (۱۳۶)

مجھے اِس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ جو کچھ میں نے حاصل کیا وہ ہر مرد اور عورت کو حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر میری طرح سعی و عمل سے کام لے اور امید اور عقیدے کو دلیل راہ بتائے۔ (۱۳۷)

میرا خیال ہے کہ میں تشدد سے بری رہ کر جینے اور مرنے کا فن جانتا ہوں مگر ابھی مجھے اِس کا ثبوت دینا باقی ہے۔ ایک ایسے فعل کے ذریعے سے جو اہنسا کا کامل نمونہ ہو۔ (۱۳۸)

"گاندھی واد" نام کی کوئی چیز نہیں ہے اور میں نہیں چاہتا۔ کہ میرے بعد میرے پیروؤں کا کوئی الگ فرقہ ہو۔ میں نے صرف اِس بات کی اپنی سی کوشش کی ہے کہ اِن اصولوں کو جو ابدی حقیقت رکھتے ہیں روزمرہ کی زندگی اور روزمرہ کے معاملات میں برتوں۔ اِس لیے اِس کا کوئی سوال نہیں کہ میں منو کے دھرم شاستر کی طرح کوئی شاستر چھوڑ کر جاؤں۔ بھلا میرا اِس عظیم قانون ساز سے کیا مقابلہ! میں نے جو رائیں قائم کی ہیں۔ اور جن نتیجوں پر پہنچا ہوں وہ آخری اور قطعی نہیں۔ ممکن ہے کل میں انھیں بدل دوں۔ مجھے دُنیا کو کوئی تعلیم نہیں دینی ہے۔ ستیہ اور اہنسا کے اصول ابتدائے آفرینش سے چلے آرہے ہیں۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ اُن کے تجربے جتنی بڑی سطح پر ممکن تھے کرڈالے۔ اِس میں مجھ سے کبھی کبھی غلطیاں ہوئیں اور میں نے اُن سے سبق حاصل کیا۔ اِس لیے زندگی اور اُس کے مسائل نے میرے لیے ستیہ اور اہنسا کے تجربوں کی حیثیت حاصل کرلی۔ مجھ میں سچائی کا خلقی مادہ تھا۔ مگر عدم تشدد کا نہیں جیسا کہ ایک جین مُنی نے میرے بارے میں کہا تھا کہ میں اہنسا کا اتنا بھگت نہیں جتنا ستیہ کا۔ میں آخرالذکر کو مقدم اور اول الذکر کو موخر سمجھتا ہوں، کیوں کہ بقول اُن کے عدم تشدد کو سچائی کی خاطر قربان کرسکتا ہوں۔ سچ پوچھیے تو ستیہ کی تلاش میں مجھے اہنسا کا پتہ چلا ہماری مقدس کتابوں میں۔ ہے کہ ستیہ سے بڑھ کر کوئی دھرم نہیں اور اہنسا سب سے

بڑا فرض ہے۔ اِن دونوں اقوال میں "دھرم" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر میرے خیال میں اِس کا مفہوم دونوں جگہ الگ الگ ہے:

اچھا تو میرا فلسفہ، اگر اسے اس پُر تکلف نام سے پکارا جائے۔ وہی ہے جو میں نے اوپر بیان کیا۔ مگر آپ اِسے گاندھی وادیا گاندھزم نہیں کہہ سکتے اس میں "اِزم" کی کوئی بات نہیں ہے اور نہ اس کے لیے کسی لمبے چوڑے لٹریچر یا پروپیگنڈے کی ضرورت ہے، میرے عقیدے کی تردید میں مقدس کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہوں مگر میں اس پر اور زیادہ مضبوطی سے قائم ہوں کہ سچائی کو کسی چیز کی خاطر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ اِن سیدھی سادی حقیقتوں پر جنہیں میں نے بیان کیا ہے۔ عقیدہ رکھتے ہیں وہ ان کا پرچار صرف اِس طرح کر سکتے ہیں کہ اُن پر عمل کر کے دکھائیں۔ لوگوں نے میرے چرخے کا مذاق اُڑایا ہے۔ اور ایک تیز طبیعت نقاد نے یہ بھی کہا ہے کہ جب میں مروں گا تو یہ چرخے میری چتا میں جلانے کے کام آئیں گے۔ مگر اس سے وہ پکا عقیدہ جو مجھے چرخے پر ہے، ذرا بھی نہیں ڈگمگایا بھلا میں کتابوں کے ذریعہ سے لوگوں کو کس طرح یقین دلا سکتا ہوں کہ میرا سارا پروگرام اہنسا پر مبنی ہے۔ یہ تو صرف میری زندگی سے ثابت ہو سکتا ہے۔ (۱۳۹)

آپ (اہلِ امریکہ) نے مجھے تھورو جیسا معلم دیا۔ جس کے مضمون "ڈیوٹی آف سول ڈس اوبیڈینس" میں مجھے اپنی جنوبی افریقہ کی جدوجہد کی تائید میں علمی دلیل مل گئی۔ برطانیہ سے مجھے رسکن ملا۔ جس کی کتاب "انٹو دِس لاسٹ" نے مجھے رات بھر میں وکیل اور شہر کے باشندے سے ایک دیہاتی بنا دیا۔ جو ڈربن سے دور قریب ترین ریلوے اسٹیشن سے تین میل کے فاصلہ پر ایک زراعتی فارم میں رہنے لگا۔ اور روس سے مجھے ٹالسٹائے ملا۔ جس کی تعلیم سے میں نے عدم تشدد کی عقلی بنیاد حاصل کی۔ ٹالسٹائے نے میری جنوبی افریقہ کی ستیہ گرہ کو

اس وقت آشیرواد دی، جب وہ بالکل ابتدائی منزل میں تھی اور مجھے اس سے زبردست امکانات کا کوئی اندازہ نہ تھا۔

ان ہی نے میرے نام ایک خط میں یہ پیش گوئی کی تھی۔ کہ جو تحریک میں چلا رہا تھا، وہ ایک دن ساری دنیا کے مظلوموں کے لیے امید کا پیغام ثابت ہوگی اس سے آپ کو یہ اندازہ ہوگا کہ جو کام میں اب کر رہا ہوں اس میں برطانیہ اور مغربی ملکوں سے دشمنی کا جذبہ نہیں ہے۔ " انٹو دِس لاسٹ " کے پیغام سے سرشار ہونے کے بعد میں اس جرم کا مرتکب ہو ہی نہیں سکتا کہ فاشزم یا نازی ازم کی حمایت کروں۔ جن کا اصول فرد اور اس کی آزادی کو کچلنا ہے۔ (۱۴۰)

میری زندگی میں کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں۔ میں اپنی کمزوریوں کا اعتراف کر چکا ہوں۔ اگر مجھے شہوانی خواہش ہوتی تو مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ اس کا اعتراف کر لیتا میں نے برہمچریہ کا عہد ۱۹۰۶ء میں اس وقت کیا، جب مجھے خود اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستری سے گھن آنے لگی تھی اور میں اچھی طرح اپنے نفس کا امتحان کر چکا تھا۔ یہ عہد اس غرض سے کیا تھا کہ اپنے آپ کو پورے اطمینان سے اپنے ملک کی خدمت کے لئے وقف کر سکوں۔ یہ گویا میری کھلی زندگی کا آغاز تھا۔ جس دن سے میں نے برہمچریہ اختیار کیا، اسی دن سے ہم دونوں میاں بیوی کی آزادی شروع ہوئی۔ میری بیوی کو ایک آزاد عورت کی حیثیت سے اپنے شوہر اور آقا کی خدمت سے چھٹکارا ملا اور مجھے اپنی خواہش نفس کی، جو اس بیچاری کو پوری کرنی پڑتی تھی، غلامی سے نجات ملی۔ کوئی اور عورت میرے لیے اس قسم کی کشش نہیں رکھتی تھی جیسی میری بیوی میں تھی۔ میں شوہر کی حیثیت سے اُن کا اس قدر وفادار اور اس عہد کا جو میں نے اپنی ماں سے کیا تھا۔ اتنا پابند تھا کہ کسی اور عورت کے چکر میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ مگر جس شان سے میرا برہمچریہ شروع ہوا اس کے طفیل میں عورت

ماں کی حیثیت سے مجھے اپنی طرف بے اختیار کھینچنے لگی .... میرے برہمچریہ کو اُن قدیم ضابطوں سے کوئی تعلق نہیں تھا جو اس کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ میں اپنے حسب ضرورت خود ضابطے بنا لیتا تھا۔ میں نے یہ کبھی نہیں مانا کہ برہمچریہ کی پابندی کی خاطر عورتوں کے سایے سے بھی دور رہنا ضروری ہے۔ یہ ضابطہ کہ جنس مخالف سے کسی قسم کا واسطہ خواہ وہ کتنا ہی بے ضرر کیوں نہ ہو' نہیں رکھنا چاہیے زبردستی بنا لیا گیا ہے۔ اور اُس کی ہماری زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس لیے خدمت کے سلسلے میں قدرتی طور پر عورتوں سے ملنے جلنے کے موقعے آئیں تو ایسی ملاقاتوں پر میں کوئی پابندی نہیں لگاتا۔ چنانچہ جنوبی افریقہ میں مجھے بہت سی یوروپی اور ہندوستانی عورتوں کا اعتماد حاصل رہا۔ اور جب میں نے وہاں ہندوستانی بہنوں کو سول نافرمانی کی تحریک میں شریک ہونے کی دعوت دی تو میں اُن کا رفیق کار بن گیا۔ میں نے دیکھا کہ مجھ میں صنف نسواں کی خدمت کی خاص طور پر صلاحیت ہے۔

اس طویل حکایت کو جو میرے لیے نہایت دلپذیر ہے' مختصر کر کے لکھتا ہوں کہ ہندوستان واپس آکر میں بہت جلد ہندوستانی عورتوں سے گھل مل گیا۔ مجھ پر اس خوشگوار حقیقت کا انکشاف ہوا کہ میں آسانی سے ان کے دل میں گھر کر لیتا ہوں۔ مسلمان بہنیں نہ مجھ سے یہاں پردہ کرتی ہیں۔ نہ جنوبی افریقہ میں کرتی تھیں۔ میں آشرم میں عورتوں کے بیچ میں سوتا ہوں اس لیے کہ میری طرف سے اُنھیں ہر لحاظ سے اطمینان ہے۔ یہ یاد رہے کہ سیوگاؤں آشرم میں لوگوں کے الگ الگ رہنے کا انتظام نہیں ہے۔

اگر مجھے عورتوں سے شہوانی رغبت ہوتی تو مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ اس عمر میں بھی میں کئی شادیاں کر لیتا۔ میں بے نکاح جنسی تعلقات کا قائل نہیں ہوں چاہے وہ علانیہ ہو یا خفیہ۔ اس طرح کے تعلقات کو میں کتوں کی زندگی سمجھتا ہوں اور پھر خفیہ تعلقات میں تو بزدلی بھی پائی جاتی ہے۔ (۱۴۱)

ایک صاحب نے مجھے لکھا ہے کہ آپ اپنے لڑکے کو اپنا ہم خیال نہ بنا سکے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ اپنی کوششیں خود اپنے گھر کی اصلاح تک محدود رکھیں "

اِسے طعن سمجھا جاتا ہے۔ مگر میں نہیں سمجھتا۔ اِس لیے کہ یہ سوال دوسروں سے پہلے خود میرے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ میں آواگون کا قائل ہوں۔ ہمارے سارے رشتے اور تعلقات اِن سنسکاروں کا نتیجہ ہیں۔ جو ہم پچھلے جنم سے لے کر آئے ہیں۔ خدا کے بھید کوئی نہیں جانتا لوگ ہمیشہ سے اُن کی چھان بین کرتے رہے۔ مگر نہ کوئی اُن کی تہہ تک پہنچا اور نہ پہنچے گا۔

میں اپنے بیٹے کے معاملے کو اِس روشنی میں دیکھتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے گھر میں ایک بُرے بیٹے کا پیدا ہونا میرے پچھلے کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔ چاہے وہ اِس زندگی کے ہوں یا پچھلی زندگی کے۔ میرا پہلا بیٹا اُس وقت پیدا ہوا تھا۔ جب میں خواہشِ نفس میں اندھا ہو رہا تھا۔ اِس کے علاوہ اُس کی نشوونما ایسے زمانے میں ہوئی۔ جب میں خود نشوونما کے دور سے گزر رہا تھا۔ اور اپنے آپ کو بہت کم جانتا تھا۔ مجھے یہ دعوےٰ نہیں کہ اب میں اپنے آپ سے پوری طرح واقف ہو گیا ہوں۔ مگر اِس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ جانتا ہوں۔ برسوں تک یہ لڑکا مجھ سے دور رہا۔ اور اُس کی تربیت تمام تر میرے ہاتھوں میں نہیں رہی۔ اِس لیے وہ ہمیشہ سے آوارہ رہا۔ اِس کو مجھ سے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ میں نے اُسے اور اُس کے بھائیوں کو فلاحِ عامہ کے غلط تصور کے بھینٹ چڑھا دیا۔ اور دوسرے بیٹوں نے بھی مجھ پر کم و بیش یہی الزام لگایا۔ مگر بہت ہچکچاتے ہوئے۔ اور اُنھوں نے فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے مجھے معاف کر دیا۔ میرا بڑا بیٹا خاص طور پر میرے تجربوں کا اور میری زندگی میں زبردست تبدیلیوں کا شکار ہوا۔ اِس لیے وہ اِن باتوں کو جنھیں وہ میری زبردست غلطیاں سمجھتا ہے، بھلا نہیں سکتا۔ اِن سب وجوہ سے میرا یہ خیال ہے کہ میں خود ہی اپنے بیٹے کے ہاتھ سے نکل جانے

کا باعث ہوں۔ اِس لیے میں اِس صدمے کو صبر سے برداشت کرتا ہوں۔ پھر بھی یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اِس لیے کہ میں دن رات دُعا کرتا رہتا ہوں کہ خدا اُسے اُس کی گمراہی کا احساس دلائے اور مجھ سے اس کے معاملے میں جو غلطیاں ہوئی ہیں اُنھیں معاف کر دے۔ میرا اٹل عقیدہ ہے کہ انسان خلقی طور پر ترقی کی طرف مائل ہے اِس لیے میں نے یہ آس نہیں چھوڑی ہے کہ وہ ایک دن خوابِ غفلت سے چونکے گا۔ ------------------------------

اِس طرح وہ بھی میرے اہنسا کے تجربے کا ایک موضوع ہے۔ مجھے کامیابی کب ہوگی؟ اگر ہوگی بھی یا نہیں، اِس کی مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ میرے اطمینان کے لئے یہی کافی ہے کہ میں اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتا۔ (۱۴۲)

میں نے اخبار کا تراشہ جو ایک صاحب نے بھیجا ہے پڑھا تو معلوم ہوا کہ ایک مندر بنایا گیا ہے جس میں میری مورتی پوجی جاتی ہے۔ میں اسے بُت پرستی کی بدترین شکل سمجھتا ہوں جس شخص نے یہ مندر بنایا ہے اُس نے اپنے روپے کا غلط استعمال کر کے اُسے ضائع کر دیا ہے۔ اِن گاؤں والوں کو جو وہاں جا رہے ہیں گمراہ کیا جا رہا ہے اور میری توہین ہو رہی ہے۔ اِس لیے کہ اِس مندر میں میری ساری زندگی کا مضحکہ اُڑایا گیا ہے۔ میں نے پوجا کے جو معنی سمجھائے اُن کو مسخ کیا گیا ہے۔ چرخے کی پوجا یہ ہے کہ اُسے روزی کمانے کے لیے یا سوراج کی خاطر قربانی دینے کیلئے چلایا جائے۔ گیتا کی پوجا اِس طرح نہیں ہوتی کہ توتے کی طرح اُس کا پاٹھ کیا جائے۔ بلکہ اُس کی تعلیم پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔ پاٹھ کی قدر و قیمت صرف یہ ہے کہ اُس سے ان اصولوں پر جو اس میں بیان کیے گئے ہیں عمل کرنے میں مدد ملے۔ اِسی طرح کسی شخص کی کسی طرح تعظیم و احترام کا طریقہ یہ ہے کہ اُس کی بُرائیوں کی نہیں بلکہ اچھائیوں کی پیروی کی جائے۔ ہندو دھرم کو کسی زندہ ہستی کی پرستش کی سطح پر لے آنا اُسے پست اور ذلیل کرنا ہے۔ کسی کے بارے

میں اُس کے مرنے سے پہلے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اچھا ہے۔ مرنے کے بعد بھی وہ اچھا صرف اِس شخص کے نزدیک ہے جسے یقین ہے کہ جو صفات مرحوم کی منسوب کی جاتی ہیں وہ واقعی اِس میں موجود تھیں۔ حقیقت میں انسان کے دل کا حال صرف خدا ہی جانتا ہے۔ اس لیے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ کسی شخص کی چاہے وہ زندہ ہو یا مر گیا ہو پرستش نہ کی جائے بلکہ صرف اِن صفاتِ کاملہ کی جن کی حامل خدا کی ذات ہے۔ جسے ہم حق کہتے ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا فوٹو رکھنا بھی ایک قسم کی پرستش نہیں ہے جس کا نہ دین میں کوئی ثواب ہے نہ دُنیا میں۔ میں تو اپنی تحریروں میں یہ بات پہلے ہی کہہ چکا ہوں، اِس کے باوجود میں اسے گوارا کرتا ہوں ــــ اِس لیے کہ یہ بے ضرر ہے اگرچہ قیمتی فیشن بن گیا ہے لیکن اِس معاملے میں جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔ اگر میں صراحتاً یا کنایتہً ذرا سی بھی ڈھیل دوں تو میری یہ رواداری مضحک اور مضر ہو گی اور مجھے بڑی خوشی ہو گی اور میرے دل کا بوجھ اُتر جائے گا۔ اگر مندر کا مالک مورتی کو ہٹا دے ـــــــــــــ اور اِس عمارت کو کتائی کا مرکز بنا دے جہاں غریب اُجرت پر اور دوسرے لوگ قربانی کے طور پر دھنائی اور کتائی کا کام کریں اور سب کے سب کھدّر پہننے لگیں۔ یہ گیتا کی تعلیم کا عملی مظاہرہ اُس کی اور میری سچی پرستش ہو گی۔ (۱۴۳)

میری خامیاں اور ناکامیاں اِسی طرح خدا کی دین ہیں جیسے میری کامیابیاں اور خوبیاں اور میں دونوں کو اُس پر نچھاور کرتا ہوں۔ آخر اُس نے مجھ جیسے ناقص آلۂ کار کو ایسے زبردست تجربے کے لیے کیوں چُنا؟ میں سمجھتا ہوں کہ اُس نے خاص کر کے ایسا کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ غریب، بے زبان، جاہل عوام کی خدمت کی جائے۔ اگر اُنھیں کسی کامل انسان سے سابقہ پڑتا تو اُن کی ہمت پست ہو جاتی۔ جب اُنھوں نے دیکھا کہ ایک شخص جس میں وہی سب کمزوریاں ہیں جو اِن میں ہیں، اہنسا کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ تو اُنھیں بھی اپنی صلاحیت پر بھروسا ہوا۔ اگر کوئی کامل انسان ہمارا

رہنما بن کر آتا تو ہم اُسے پہچان نہ سکتے اور شاید اُسے بھگا کر کسی غار میں پناہ لینے پر مجبور کرتے۔ ممکن ہے جو شخص میرے بعد آئے وہ مجھ سے زیادہ مکمل ہو اور تم اس کے پیام سے فائدہ اُٹھا سکو (۱۴۴)

جب میں نے یہ سُنا کہ ایک اٹم بم نے ہیروشیما کے شہر کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تو مجھ پر اضطراب کی کیفیت طاری نہیں ہوئی۔ بلکہ میں نے اپنے دل میں کہا۔ "اب اگر دُنیا نے عدم تشدد کو اختیار نہ کیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ نوعِ انسانی کا اپنے ہاتھوں تباہ ہونا یقینی ہے (۱۴۵)

دُنیا میں طرح طرح کی بُرائیاں ہیں۔ مگر ان پر نکتہ چینی نہیں کرتا۔ چونکہ مجھ میں بھی بہت سے نقص ہیں۔ اور مجھے خود عفو و کرم کی ضرورت ہے۔ اس لیے میں اہلِ دُنیا کی کوتاہیوں کو اس وقت تک نظر انداز کرتا ہوں جب تک میں اُن کو سمجھا بجھا کر راہِ راست پر لانے کا موقع نہ پاؤں یا نہ نکالوں۔ (۱۴۶)

جب وہ وقت آئے گا، چاہے ایک لمحہ ہی کیوں نہ ہو کہ مجھ میں بُرائی کرنے کی صلاحیت نہ رہے۔ اور میرے خیال کی دُنیا درشتی اور غرور سے بالکل پاک ہو، تبھی میری اہنسا ساری نوعِ انسانی کے دلوں کو متاثر کرے گی۔ اس سے پہلے نہیں۔ (۱۴۷)

اگر انسان اپنے آپ کو ذاتِ الٰہی میں محو کر دے تو اُسے یہ محسوس ہوگا کہ اس نے بھلائی بُرائی، کامیابی، ناکامی کو اس کی مشیت پر چھوڑ دیا ہے اور ہر فکر سے آزاد ہو گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ابھی اس منزل تک نہیں پہنچا، اس لیے میری سعی ناتمام ہے (۱۴۸)

زندگی میں ایک منزل ایسی آتی ہے کہ انسان کو اپنے خیالات عمل کو ذریعے ظاہر کرنا تو ایک طرف، اُنھیں زبان سے ادا کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ محض فکر عمل کی محرک ہوتی ہے، اس میں یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ تب انسان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا ترکِ عمل خود عمل ہے .... میری سعی کا

اُس منزل کی طرف رُخ ہے (۱۴۹)

میں بڑی خوشی سے ایک سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں جو دُنیا کے کئی حصوں سے مجھ سے پوچھا گیا ہے۔ وہ سوال یہ ہے:

آپ اِس بڑھتے ہوئے تشدّد کی کیا توجیہہ کریں گے جس سے خود آپ کی قوم میں سیاسی پارٹیاں سیاسی مقصد حاصل کرنے کے لیے کام لے رہی ہیں۔؟ کیا اِن کوششوں کا جو آپ تیس سال سے عدم تشدّد کے ذریعہ برطانوی راج کو ختم کرنے کے لیے کر رہے ہیں، یہی نتیجہ ہے ؟ کیا آپ اب بھی دُنیا کو عدم تشدّد کا پیام دیں گے ؟ میں نے اِن حضرات کے، جنہوں نے مجھے خط لکھے ہیں خیالات کا خلاصہ اپنے الفاظ میں دیدیا ہے۔ اِس کے جواب میں مجھے یہ اعتراف کرنا ہے کہ یہ ناکامی میری ہے، عدم تشدّد کے اصول کی نہیں۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ پچھلے تیس سال میں جس اہنسا کا مظاہرہ کیا گیا وہ کمزوروں کی اہنسا ہے۔ یہ جواب معقول ہے یا نہیں، اِس کا فیصلہ کرنا دوسروں کا کام ہے۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ اِس اہنسا کی بدلے ہوئے حالات میں کوئی گنجائش نہیں۔ ہندوستان کو طاقتوروں کی اہنسا کا کوئی تجربہ نہیں ہے، بار بار اِس بات کو دُہرانے سے کوئی فائدہ نہیں کہ طاقتوروں کی اہنسا دُنیا کی سب سے بڑی قوت ہے۔ سچائی کے لئے مسلسل اور بڑے پیمانے پر ثبوت درکار ہے۔ اس کی، اب میں انتہائی کوشش جو میرے امکان میں ہے کر رہا ہوں۔ اور اگر میری انتہائی کوشش ناکام ثابت ہوئی تو؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں ایک سراب کے پیچھے دوڑ رہا ہوں ؟ آج میں اِس سعی لاحاصل میں دوسروں کو اپنے پیچھے کیوں گھسیٹتا ہوں ؟ یہ سب سوالات برمحل ہیں۔ میرا جواب بالکل سیدھا سادہ ہے، میں کسی سے نہیں کہتا کہ میرے پیچھے چلے۔ ہر شخص کو اپنی اپنی ندائے باطن کی ہدایت پر عمل کرنا چاہیئے۔ اگر اُس کے کان اس آواز کو نہیں سُنتے تو جو راہ اُسے سب سے اچھی معلوم ہو۔ اُس پر چلے بہرحال کسی دوسرے کے پیچھے بھیڑیا چال نہیں چلنا چاہیے۔

ایک اور سوال بار بار پوچھا جاتا ہے : اگر آپ کو یقین ہے کہ ہندوستان غلط راہ پر چل رہا ہے تو آپ غلط کاروں سے واسطہ ہی کیوں رکھیں ؟ کیوں نہ سب سے الگ تھلگ چلیں اور یہ عقیدہ رکھیں کہ اگر آپ حق پر ہیں تو وہ لوگ جو پہلے آپ کے دوست اور پیرو تھے ایک دن خود ہی آپ کو ڈھونڈھ نکالیں گے ؟ میں اس اعتراض کو بالکل سچا سمجھتا ہوں اور اُس کی تردید کی کوشش نہیں کروں گا۔ صرف اتنا ہی کہوں گا کہ میرا عقیدہ اتنا ہی مضبوط ہے جتنا پہلے تھا۔ ممکن ہے میرے طرزِ عمل میں نقص ہو۔ ایسی مشکلوں میں انسان کی رہنمائی کے لیے پُرانی آزمائی ہوئی مثالیں موجود ہیں صرف اس کی ضرورت ہے کہ وہ اُن کی پیروی بے سمجھے بوجھے ایک مشین کی طرح نہ کرے، اس لیے میں ان سب حضرات سے جو مجھے مشورہ دیتے ہیں یہ عرض کرتا ہوں کہ میرے معاملے میں صبر سے کام لیں بلکہ میری طرح یقین رکھیں کہ اس دُکھیاری دُنیا کے لیے اہنسا کی سیدھی اور تنگ پگڈنڈی کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ ممکن ہے میری طرح کے کروڑوں آدمی اس حقیقت کو اپنی زندگی میں ثابت کرنے میں ناکام رہیں یہ اُن کی ناکامی ہوگی۔ اہنسا کے ابدی قانون کی ہرگز نہیں ہوگی۔ (۱۵۰)

دیس میری کوششوں کے باوجود بٹ گیا۔ اس سے مجھے دُکھ ہوا مگر کہیں زیادہ دُکھ ان حالات کی وجہ سے ہوا جن میں بٹوارہ کیا گیا۔ میں نے عہد کر لیا ہے کہ جو آگ لگی ہے۔ اُس کو بجھا کر رہوں گا۔ یا اس کوشش میں جان دے دوں گا۔ مجھے ساری دُنیا سے ویسی ہی محبت ہے جیسی اپنے دیس کے لوگوں سے اس لیے کہ خدا ہر انسان کے دل میں رہتا ہے اور میں انسان کی خدمت کے ذریعہ زندگی کی اعلیٰ قدروں کو حاصل کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ جو اہنسا ہم نے برتی وہ کمزوروں کی اہنسا تھی یعنی دراصل اہنسا تھی ہی نہیں۔ مگر میرا عذر یہ ہے کہ یہ وہ چیز نہیں ہے جو میں نے اپنے ہم وطنوں کے سامنے پیش کی تھی۔ میں نے اُنھیں

اہنسا کا جو ہتھیار دیا تھا، اس لیے نہیں دیا تھا کہ وہ کمزور ہیں اور فوجی ٹریننگ سے محروم ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ میں نے تاریخ کے مطالعے سے یہ سبق سیکھا ہے کہ نفرت اور تشدد سے خواہ وہ کتنے ہی اعلیٰ و برتر مقاصد کے لیے استعمال کیے جائیں خوف و تشدد ہی پیدا ہوتا ہے اور امن قائم ہونے کے بجائے خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ ہمارے قدیم سنتوں، عارفوں اور حکیموں کی روایات کے طفیل میں جو قابلِ فخر دولت ہندوستان نے پائی ہے اور جس میں وہ باقی دنیا کو اپنے ساتھ شریک کر سکتا ہے وہ عفو و کرم اور ایمان و عقیدت ہے۔ ہندوستان ان ہی ہتھیاروں سے مقابلہ کرے گا۔ اُس ہلاکت کے خطرے کا جس میں دنیا نے ایٹم بم کی ایجاد سے اپنے آپ کو مبتلا کر لیا ہے۔ ستیہ اور اہنسا کے ہتھیار کبھی خطا نہیں کرتے۔ خطا جو کچھ ہے وہ ہم لوگوں کی ہے جو ان اصولوں کے پرستار ہیں۔ اور اسی نے ہمیں خود کشی کی اس کشمکش میں ڈھکیل دیا ہے۔ (۱۵۱)

میں اپنی زندگی میں بارہا سخت سے سخت آزمائش سے گزرا ہوں۔ مگر یہ آزمائش غالباً سب سے کڑی ہے۔ مگر جس قدر اُس کی سختی بڑھتی جاتی ہے اتنا ہی میرا علاقہ ذاتِ الٰہی سے گہرا اور میرا ایمان اُس کی رحمتِ کاملہ پر پکا ہوتا جاتا ہے۔ جب بے سہارا باقی رہ جاتا ہے تب مجھے یقین ہے کہ میرا انجام بخیر ہے۔ (۱۵۲)

مجھے اعتراف ہے کہ اگر میں انسانِ کامل ہوتا تو مجھے اپنے ہمسایوں کی مصیبتوں سے یہ تکلیف نہ ہوتی۔ بلکہ میں اُن پر غور کرتا، اُن کو دور کرنے کی تدبیر بتاتا اور حق کی بے پناہ قوت سے جو میرے اندر ہوتی انھیں مجبور کرتا کہ اس پر عمل کریں۔ مگر ابھی تک میرا مشاہدہ دھندلا ہے۔ جیسے میں ایک شیشے میں سے دیکھ رہا ہوں اور اپنی بات بہت دھیرے دھیرے بڑی مشکل سے منوا سکتا ہوں اور اس پر بھی بعض اوقات مقصد کے حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہوں .... میری انسانیت پر بٹہ لگ جاتا اگر میں خواہ مخواہ کی مصیبت کو جس نے سارے ملک کو گھیر رکھا ہے، دیکھتا ....

اور میرا دل ہندوستان کے کروڑوں بے زبان غریبوں کے حالِ زار پر نہ کڑھتا۔(۱۵۲)
میں ساری دُنیا میں اعلان کرنا چاہتا ہوں۔ خواہ اُس کی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ ہو
اور خواہ مغربی ملکوں کے بہت سے لوگ میری عزت کرنا بلکہ مجھ پر بھی اعتماد کرنا بھی چھوڑ دیں
___ سرِ تسلیم خم ہے ___ مگر اُن کی دوستی اور محبت کی خاطر بھی میں اِس ندائے باطن
کو، اسے ضمیر کہیے یا میری فطرتِ اصلی کا تقاضا کہیے، دبا نہیں سکتا۔ میرے اندر سے
کوئی چیز مجھے مجبور کر رہی ہے کہ اپنے دردِ دل کو پکار کر کہوں۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ وہ
کیا چیز ہے وہ اندرونی آواز جس نے آج تک کبھی دھوکا نہیں دیا۔ مجھ سے کہہ رہی
ہے۔ ___ "تمھیں ساری دُنیا کا سامنا کرنا ہے۔ خواہ تن تنہا کرنا پڑے۔
تمہیں دُنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا ہے چاہے اُس کی آنکھوں میں خون اُتر
آیا ہو ڈرو نہیں۔ اِس چھوٹی سی چیز پر بھروسہ کرو۔ جو تمہارے دل میں ہے اور تمہیں یہ
ہدایت دے رہی ہے۔ دوستوں کو بیوی کو سب کو چھوڑ دو مگر اس امرِ حق کی شہادت
دیتے رہو۔ جس کے لیے تم جیتے ہو اور جس کے لیے تمہیں مرنا ہے۔" (۱۵۴)

میری روح کو کبھی چین نہیں آ سکتا۔ جب تک دُنیا میں ایک مصیبت، ایک
ظلم بھی باقی ہے اور اُسے بے بسی کی حالت میں دیکھنا پڑتا ہے۔ مگر مجھ جیسے نحیف
کمزور، حقیر مخلوق کے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہر ظلم و زیادتی کو ختم کر سکے یا جو ظلم و زیادتی
اُس کی آنکھوں کے سامنے ہو اُس کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو بچا سکے۔ روح مجھے ایک
طرف کھینچتی ہے اور جسم دوسری طرف کھینچتا ہے ان دونوں قوتوں کی کشمکش سے آزاد ہونا ممکن
تو ہے مگر اس میں بہت دیر لگتی ہے۔ اور بڑی سخت منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں اِس سے
نجات پانے کا یہ طریقہ نہیں کہ انسان بے سوچے سمجھے ترکِ عمل کر دے بلکہ یہ ہے کہ سمجھ
بوجھ کر بغیر حرص یا جذبے کی لاگ کے عمل کرے۔ اِس کشمکش میں در اصل جسم کو مسلسل
اذیت دینی پڑتی ہے تاکہ روح بالکل آزاد ہو جائے۔(۱۵۵)

میں دُنیا کے سب مذہبی رہنماؤں کے لائے ہوئے پیامِ حق پر ایمان رکھتا ہوں اور ہمیشہ یہ دُعا مانگتا رہتا ہوں کہ میرے دل میں ان لوگوں کے خلاف جو مجھے بُرا کہتے ہیں کبھی غصّے کا جذبہ نہ پیدا ہو۔ یہاں تک کہ اگر میں کسی قاتل کی گولی کا نشانہ بھی بنوں تو مرتے وقت میرے لب پر خدا کا نام ہو۔ آخری لمحے میں میری زبان سے اپنے قاتل کے لیے غصے یا ملامت کا ایک حرف بھی نکلے تو مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ اگر میرا نام جھوٹوں اور ریاکاروں کی فہرست میں لکھا جائے۔ (۱۵۶)

کیا میری اہنسا بہادروں کی اہنسا نہیں ہے؟ یہ تو میری موت ہی بتا سکے گی۔ اگر کوئی مجھے قتل کر دے اور میں قاتل کو دُعائیں دیتا اور خدا کو یاد کرتا، اُس کا دھیان دل میں لیے ہوئے جان دے دوں تبھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ میری اہنسا بہادروں کی اہنسا تھی۔ (۱۵۷)

مجھے اس طرح مرنا گوارا نہیں .... کہ میری جسمانی اور ذہنی قوتیں ماؤف ہونے لگیں اور میں زندگی سے ہار مان لوں، مجھے یہ بھی منظور ہے کہ کسی قاتل کی گولی سے ہلاک ہو جاؤں، مگر جی یہ چاہتا ہے کہ آخر دم تک اپنا فرض ادا کرتا رہوں اور زندگی کا چراغ دھیما ہوتے ہوتے بجھ جائے۔ (۱۵۸)

میں شہادت کی آرزو میں بے قرار نہیں ہوں لیکن مجھے اپنے سب سے بڑے فرض کے ادا کرنے اور اپنے عقیدے کی حمایت کرنے کے سلسلے میں شہادت نصیب ہو جائے ..... تو میں اس کا مستحق ہوں گا۔ (۱۵۹)

میری جان لینے کی کوششیں ہو چکی ہیں۔ مگر اب تک خدا نے میری حفاظت کی اور حملہ آور اپنی حرکت پر پچھتائے۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ سمجھ کر کہ وہ دُنیا کو ایک بدمعاش کے وجود سے پاک کر رہا ہے۔ مجھے گولی مار دے تو وہ اصلی گاندھی کو گولی نہیں مارے گا۔ بلکہ اُس شخص کو جو اُس کی نظر میں بدمعاش تھا۔ (۱۶۰)

اگر میں کسی بیماری میں، وہ ایک دانہ یا پھنسی ہی کیوں نہ ہو، گھٹ گھٹ کر جان دوں تو تمہارا فرض ہے کہ پکار پکار کر کہو، چاہے اس میں لوگوں سے ناراض ہو جانے کا خطرہ ہو کہ میرا با فدا ہونے کا دعویٰ غلط تھا۔ اس سے میری روح کو سکون ملے گا۔ یاد رکھو کہ اگر کوئی مجھے گولی مار دے جیسے ابھی چند روز پہلے بم سے مارنے کی کوشش کی گئی تھی ——— اور میں گولی کھا کر اف بھی نہ کروں۔ بس خدا کا نام لے کر دم توڑ دوں تب میرا یہ دعویٰ صحیح ہوگا۔ (۱۶۱) ؎۱

اگر میرے مرنے کے بعد لوگ میرا جنازہ نکالیں اور میرے جسد بے جان کو گویائی کی قوت مل جائے تو میں یقیناً ان سے کہوں گا کہ مجھ پر رحم کرو۔ اور جہاں میں مرا ہوں وہیں میری لاش کو جلادو۔ (۱۶۲)

میرے بعد تم میں سے کوئی شخص پوری طرح میری نمائندگی نہیں کر سکے گا۔ لیکن میرا تھوڑا تھوڑا سا جز تم میں سے بہتوں کے اندر موجود ہوگا۔ اگر ہر شخص نے مقصد کو اپنی ذات پر مقدم رکھا تو میری کمی بڑی حد تک پوری ہو جائے گی۔ (۱۶۳)

میں نہیں چاہتا کہ نیا جنم لوں۔ لیکن اگر لینا پڑا تو میری خدا سے دعا ہے کہ کسی اچھوت کے گھر میں پیدا ہوں اور ان کی تکلیفوں، مصیبتوں اور ذلتوں میں شریک رہوں تاکہ اپنے آپ کو اور ان کو اس حالتِ زار سے نجات دلا سکوں۔ (۱۶۴)

؎۱ یہ الفاظ ۲۹ جنوری ۱۹۴۸ء کی رات کو گولی سے شہید ہونے سے کچھ کم چوبیس گھنٹے پہلے کہے تھے۔

دوسرا باب

مذہب اور حق

مذہب سے میری مُراد رسمی یا مروجہ مذہب نہیں ہے، بلکہ وہ مذہب جو تمام مذاہب کی بنیاد ہے اور جس کی بدولت ہمیں اپنے خالق کی حضوری نصیب ہوتی ہے[1]۔

آیئے میں سمجھاؤں کہ مذہب سے میری کیا مُراد ہے۔ یہاں ہندو دھرم کا ذکر نہیں، ہرچند کہ میں، اُس کی اور سب مذہبوں سے زیادہ قدر کرتا ہوں۔ بلکہ اس مذہب کا جو ہندو دھرم سے بلند و برتر ہے، جو انسان کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے، اُسے اُس سچائی سے جو اُس کے اندر ہے اٹوٹ رشتے سے وابستہ کر کے اس کے قلب کی ساری آلائشوں کو دور کر دیتا ہے۔ یہ فطرتِ انسانی کا جوہر ہے جو ہر قیمت پر اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہتا ہے اور ہماری روح کو اُس وقت تک بے چین رکھتا ہے جب تک کہ وہ اپنے آپ کو اپنے خالق کو اور اُس کے ساتھ اپنی یگانگی کو نہ پہچان لے۔[2]

میں نے خدا کو نہ دیکھا ہے اور نہ پہچانا ہے۔ جس طرح اور سب اُس پر عقیدہ

رکھتے ہیں، میں بھی رکھتا ہوں۔ مگر چونکہ میرا یہ عقیدہ اٹل ہے اِس لیے میں اسے ذاتی واردات قلب کے برابر سمجھتا ہوں۔ اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ عقیدہ کو واردات قلب کہنا حق میں تحریف کرنا ہے۔ اِس لیے شاید یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ مجھے خدا پر جو عقیدہ ہے، اُس کی نوعیت کو ظاہر کرنے کے لئے میرے پاس کوئی مناسب لفظ نہیں (۳)

ایک پُراسرار قوت جس کی کوئی منطقی تعریف نہیں ہو سکتی ہر شے میں جاری و ساری ہے میں اُسے دیکھ نہیں سکتا۔ مگر محسوس کرتا ہوں۔ یہی قوت ہے جس کا احساس ہوتا ہے۔ مگر کوئی ثبوت نہیں دیا جا سکتا۔ اِس لیے وہ اِن سب چیزوں سے جن کا ادراک مجھے اپنے حواس کے ذریعے ہوتا ہے بالکل مختلف ہے۔ وہ سرحدِ ادراک سے پرے ہے۔ مگر عقلی استدلال سے خدا کی ہستی کا کچھ تھوڑا بہت ثبوت دیا جا سکتا ہے۔ (۴)

مجھے کچھ مبہم سا احساس ہے کہ گو اور سب چیزیں جو میرے آس پاس ہیں۔ ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ مٹتی رہتی ہیں مگر اِس سارے تغیر کی سطح کے نیچے ایک زندہ قوت ہے جو تغیر سے بری ہے۔ جو سب چیزوں کو تھامے اور ایک دوسرے سے باندھے ہوئے ہے۔ جو پیدا کرتی ہے، مٹاتی ہے اور پھر پیدا کرتی ہے۔ یہ قوت یا روح جو کائنات میں جاری و ساری ہے، خدا ہے اور چونکہ اِن چیزوں میں سے جن کا میں اپنے حواس کے ذریعے ادراک کرتا ہوں۔ کسی کو قیام نہیں۔ اس لیے صرف وہی ہے جو قائم و دائم ہے۔ (۵)

یہ قوت فیض رساں ہے یا مضرت رساں ؟ مجھے تو سراسر فیض رساں نظر آتی ہے۔ اِس لیے کہ میں دیکھتا ہوں موت کے درمیان زندگی قائم ہے۔ باطل کے درمیان حق قائم ہے۔ ظلمت کے درمیان نور قائم ہے۔ اِس سے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا زندگی ہے۔ حق ہے، نور ہے، وہی خدائے تعالیٰ ہے۔ (۶)

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب تک میں بُرائی سے ٹکر نہ لوں، چاہے اِس میں میری

جان چلی جائے، اُس وقت تک خدا کو ہرگز نہیں پہچان سکتا۔ میرا یہ عقیدہ اپنے حقیر اور محدود ذاتی تجربے کی بنا پر اور مضبوط ہو گیا ہے۔ جتنا میں اپنے نفس کو پاک صاف کرتا ہوں اتنا ہی خدا سے قرب کا احساس ہوتا ہے۔ میں اُس سے کتنا زیادہ قریب آ جاؤں اگر میرا عقیدہ محض برائے نام نہ ہو جیسا اب ہے بلکہ ہمالیہ کی طرح اٹل اور اُس کی چوٹی پر جمے برف کی طرح سفید اور چمکدار ہو جائے۔ (۷)

خدا کو ماننا عقیدے پر مبنی ہے جو عقل سے ماورا ہے، سچ پوچھیے تو اس چیز میں بھی جسے ہم معرفت کہتے ہیں عقیدے کا جزو شامل ہے، ورنہ وہ قائم نہ رہ سکتی۔ یہ تو بالکل قدرتی بات ہے۔ بھلا کوئی اپنی ہستی کے حدود سے کیوں کر آگے بڑھ سکتا ہے۔ میرے خیال میں اس زندگی میں جو جسم سے وابستہ ہے کامل معرفت ناممکن ہے۔ اور اس کی ضرورت بھی نہیں۔ انسان جس انتہائی بلندی پر پہنچ سکتا ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے صرف اٹل عقیدہ درکار ہے۔ خدا کوئی خارجی، جسمانی وجود نہیں رکھتا اس لیے خارجی شہادت سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہم حواس کے ذریعہ اس کا ادراک کرنے میں ہمیشہ ناکام رہیں گے اس لئے کہ خدا حواس کی پہنچ سے باہر ہے، جیسے ہی ہم حواس سے توجہ ہٹا لیں گے ہمیں اس کے وجود کا احساس ہوگا حقیقت کا راگ خود ہمارے اندر گونجتا رہتا ہے لیکن یہ لطیف اور نازک نغمہ جو ہمارے تمام ادراک سے بہتر اور برتر ہے حواس کے شور میں سنائی نہیں دیتا۔ (۸)

بھلا وہ بھی کیا خدا ہوا جس سے ہمیں صرف ذہنی تسکین حاصل ہو، خدا تو وہ ہے جو ہمارے دل پر حکومت کرے اور اس کی کایا پلٹ دے۔ اُس کا جلوہ اپنے بھگت کے چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی نظر آنا چاہیئے یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب انسان کو اس کی حقیقی معرفت حاصل ہو جائے جو حواس خمسہ کے ذریعہ ہرگز نہیں ہو سکتی۔ حواس کے ادراکات خواہ ہمیں کتنے ہی حقیقی کیوں نہ معلوم ہوں اکثر جھوٹے اور گمراہ کن ہوتے ہیں جو علم بغیر حواس کے واسطے کے حاصل ہو وہ خطا سے بری ہوتا ہے۔ اُس کا ثبوت کسی خارجی شہادت سے



نہیں بلکہ اس طرح ملتا ہے کہ جو لوگ سچ مچ اپنے اندر خدا کے وجود کو محسوس کرتے ہیں اُن کی سیرت اور کردار میں کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی شہادت سب ملکوں اور خطوں کے عارفوں اور پیمبروں کی جن کا سلسلہ کبھی نہیں ٹوٹا، وارداتِ قلب میں ملتی ہے۔ اس شہادت کا انکار کرنا ایسا ہے۔ جیسے اپنے وجود کا انکار کرنا (۹)

میرے نزدیک خدا، حق اور محبت ہے، اخلاق اور نیکی ہے۔ بے خوفی اور دلیری ہے۔ خدا روشنی اور زندگی کا سرچشمہ ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ ان سب چیزوں سے ماورا ہے۔ خدا ضمیر ہے۔ یہاں تک کہ وہی دہریوں کی دہریت ہے......... وہ عقل و فہم اور نطق و بیان سے بالاتر ہے....... اِن لوگوں کے لیے جو اُس کی حضوری کے طالب ہیں۔ وہ شخصی خدا ہے اور اُن کے لیے جنہیں اُسے چھونے کی طلب ہے، وہ مجسم ہے۔ وہ جوہر مجرد ہے۔ غرض عقیدت مندوں کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہے۔" وہ سب لوگوں کے لیے سب کچھ ہے۔ وہ ہمارے اندر بھی ہے اور ہمارے ماورا بھی......... وہ بڑا دُکھ جھیلنے والا ہے۔ مگر صابر ہونے کے ساتھ ساتھ قاہر بھی ہے......... اس کے سامنے جہالت کا عذر نہیں چلتا وہ بڑا بخشنے والا ہے اس لیے کہ ہمیں ہمیشہ توبہ کرنے کا موقع دیتا ہے۔ وہ دُنیا کا سب سے بڑا جمہوریت پسند ہے، اِس لیے کہ اُس نے ہمیں "بے قید" اختیار دیا ہے کہ نیکی اور بدی میں سے جو چاہیں چُن لیں۔ وہ سب سے بڑا استبداد پسند ہے، اِس لیے کہ اکثر نوالہ ہمارے منہ میں پہنچنے سے پہلے چھین لیتا ہے اور جو چیز اُس نے ہمیں اختیار کے نام سے دی ہے اِس میں اور جبر میں اتنا کم فرق ہے کہ وہ محض اُس کی تفریح کا سامان بن گیا ہے......... اسی لیے ہندو دھرم سارے سنسار کو بھگوان کی لیلا کہتا ہے۔ (۱۰)

حق وہ روحِ کل ہے جو ساری کائنات میں جاری و ساری ہے.........

انسان اُس کے جلوے کی تاب تبھی لا سکتا ہے جب وہ ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کو اپنی جان کے برابر عزیز رکھتا ہے۔ جسے اُس کا حوصلہ ہو وہ زندگی کے کسی شعبے سے بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ حق کی جستجو مجھے سیاست کے میدان میں کھینچ لائی ہے۔ میری ناچیز رائے میں جو لوگ کہتے ہیں کہ مذہب کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں وہ جانتے ہی نہیں کہ مذہب کا کیا مفہوم ہے۔ (۱۱)

ہر جاندار سے روحانی اتحاد کا احساس بغیر تزکیۂ نفس کے ممکن نہیں۔ جب تک نفس آلائشوں سے پاک نہ ہوجائے اہنسا کے قانون کی پابندی محض خیالِ خام ہے۔ جس کا دل پاک وصاف نہیں اُسے خدا کی معرفت کبھی حاصل نہیں ہوسکتی۔ تزکیۂ نفس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے کو آلائشوں سے پاک کیا جائے۔ پاکی میں سرایت کرنے کی بڑی تاثیر ہے۔ اس لیے تزکیۂ نفس کا سلسلہ ماحول کی پاکی اور صفائی سے جا ملتا ہے (۱۲)

مگر تزکیۂ نفس کی منزل بڑی کٹھن ہے۔ کامل عفت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان خیال، قول اور فعل میں جذبات کی غلامی سے آزاد ہوجائے، محبت اور عداوت، رغبت اور نفرت کی دوئی سے نجات حاصل کرے۔ مجھے معلوم ہے کہ مسلسل کوشش کے باوجود میں عفت کی یہ تینوں منزلیں طے نہیں کرسکا ہوں۔ اس لیے دُنیا میری جو تعریف کرتی ہے وہ مجھے اچھی نہیں معلوم ہوتی بلکہ اکثر میرے دل پر تیر کی طرح لگتی ہے۔ میرے نزدیک روحانی قوت سے چپکے چپکے دل میں گھر کرنے والے جذبات کو مغلوب کرنا اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے کہ جسمانی قوت سے دُنیا کو فتح کرلیا جائے۔ (۱۳)

میں بے چارہ بڑی کشمکش میں ہوں، میری آرزو ہے کہ میں پوری طرح نیک بن جاؤں ——— پوری طرح سچا اور خیال، قول اور عمل میں پوری طرح اہنسا کا پابند لیکن میری کوشش اِس نصب العین کو حاصل کرنے کی جسے میں صحیح سمجھتا ہوں

ہر مرتبہ ناکام رہتی ہے۔ یہ بڑی تکلیف دہ چڑھائی ہے۔ مگر جو تکلیف اِس میں ہوتی ہے۔ وہ میرے لیے عین راحت ہے۔ ہر قدم جو اوپر کی طرف اُٹھاتا ہوں اُس کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ میری قوت اور دوسرا قدم اُٹھانے کی صلاحیت پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ (۱۴)

میری کوشش یہ ہے کہ انسانوں کی خدمت کے ذریعہ خدا کی معرفت حاصل کروں اِس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ خدا نہ آسمان پر ہے اور نہ زمین پر بلکہ ہر انسان کے اندر ہے۔ (۱۵)

سچ پوچھیے تو مذہب کو ہمارے ہر فعل کا محرک ہونا چاہیے۔ یہاں مذہب سے مُراد کسی خاص فرقے کا مذہب نہیں ہے۔ اِس سے مُراد یہ عقیدہ ہے کہ دُنیا میں اخلاقی قوت کی حکمرانی ہے۔ وہ نظر نہیں آتی۔ مگر اُس سے اس کی حقیقت میں کمی نہیں ہوتی۔ یہ مذہب ہندو دھرم، اسلام، عیسائیت سے بالاتر ہے۔ یہ اُنہیں منسوخ نہیں کرتا بلکہ اُن میں ہم آہنگی اور معنویت پیدا کرتا ہے۔ (۱۶)

مذہب کے مختلف راستے ہیں۔ جو ایک نقطے پر جا کر مل جاتے ہیں۔ اگر ہم ایک ہی منزل پر پہنچ جائیں تو اِس میں کیا ہرج ہے کہ الگ الگ راستوں سے پہنچیں سچ پوچھیے۔ تو دُنیا میں جتنے افراد ہیں۔ اتنے ہی مذاہب ہیں۔ (۱۷)

اگر کوئی شخص اپنے مذہب کی حقیقت کو پا جائے تو وہ سبھی مذہبوں کی حقیقتوں کو پا جائے گا۔ (۱۸)

جب تک الگ الگ مذہب موجود ہیں۔ ہر ایک کو ایک مخصوص نشان کی ضرورت ہے۔ لیکن جب انسان کو دیوتا بنا کر پوجا جائے اور اس کے ذریعے سے اپنے مذہب کی فوقیت دوسرے مذاہب پر ثابت کی جائے تو وہ اس قابل ہے کہ اسے ترک کر دیا جائے۔ (۱۹)

مدت کے مطالعے اور تجربوں کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ:

۱۔ سب مذہب سچے ہیں۔
۲۔ سب مذہبوں میں کچھ نہ کچھ خامی ہے۔
۳۔ مجھے سب انسانوں سے اسی طرح محبت ہے جتنی اپنے قریب ترین عزیزوں سے۔ میں اور مذہبوں کا وہی احترام کرتا ہوں' جو اپنے مذہب کا اس لیے مجھے یہ خیال بھی نہیں آسکتا کہ کسی کو تبدیلیِ مذہب پر آمادہ کروں۔ (۲۰)

مختلف مذاہب اور اُن کے پیرو سب خدا کے بنائے ہوئے ہیں اس لیے میں اس خیال کو پوشیدہ طور پر بھی اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتا۔ کہ میرے ہمسایہ کا عقیدہ میرے عقیدے سے فروتر ہے اور یہ خواہش نہیں کر سکتا کہ وہ اپنا عقیدہ چھوڑ کر میرا اختیار کرے۔ سچے اور وفادار دوست کی حیثیت سے میں صرف یہی دعا کر سکتا ہوں کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہے اور اسی میں ایمان کامل حاصل کرے خدا کے ہاں بہت سی حویلیاں ہیں اور سبھی یکساں طور پر پاک اور مقدس ہیں۔ (۲۱)

کسی شخص کو ایک لمحے کے لئے بھی یہ اندیشہ نہیں ہونا چاہیے کہ اگر وہ ادب و احترام کے ساتھ دوسرے مذہبوں کا مطالعہ کرے تو اُس کا اپنا عقیدہ کمزور اور ڈانواں ڈول ہو جائے گا۔ ہندو فلسفہ یہ سمجھتا ہے کہ سبھی مذہبوں میں بنیادی سچائی موجود ہے اور تاکید کرتا ہے کہ سب کو ادب و احترام کی نظر سے دیکھنا چاہیے' ظاہر ہے' یہ تو پہلے ہی سے فرض کر لیا گیا ہے کہ ہر شخص اپنے مذہب کا ادب و احترام کرتا ہے کوئی وجہ نہیں کہ اس احترام میں دوسرے مذہبوں کا مطالعہ اور اُن کی قدر کرنے سے کسی قسم کی کمی ہو صرف اس کی ضرورت ہے کہ اس احترام کے دائرے کو وسیع کر کے اس میں دوسرے مذہبوں کو بھی شامل کر لیا جائے۔ (۲۲)

بہتر یہ ہے کہ ہم الفاظ کے بجائے اپنی زندگی کو اپنا ترجمان بنائیں خدا نے صرف ۱۹۰۰ سال پہلے صلیب کا بوجھ نہیں اُٹھایا تھا۔ بلکہ اب بھی اُٹھا رہا ہے وہ روز شہادت پاتا ہے۔ اور پھر جی اُٹھتا ہے۔ اگر دُنیا اس تاریخی خدا کے بھروسہ پر بیٹھی رہے۔ جو دو ہزار سال پہلے شہید ہوا تھا تو اُسے کیا تسکین ہوگی۔ اِس لیے آپ تاریخ کے خدا کا وعظ نہ کہیے بلکہ اپنے عمل سے دکھائیے کہ آج خدا آپ کے اندر کس طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ (۲۳)

میں اُس کا قائل نہیں ہوں کہ لوگ دوسروں کے سامنے اپنے عقائد بیان کریں خصوصاً اس غرض سے کہ انھیں تبدیلِ مذہب پر آمادہ کریں۔ عقیدہ بیان میں آنے والی چیز نہیں۔ وہ تو عمل میں ظاہر ہوتا ہے اور اپنا پرچار آپ کرتا ہے۔(۲۴) علمِ معرفت کتابوں سے اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تو خود اپنے اندر سے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ کتابیں زیادہ سے زیادہ کچھ مدد دے سکتی ہیں۔ ورنہ اکثر رُکاوٹ ڈالتی ہیں۔ (۲۵)

میں سب بڑے مذہبوں کی بُنیادی سچائی کا قائل ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ سب خدا کی طرف سے ہیں اور جن لوگوں پر نازل کیے گئے تھے، اُن کے لیے ضروری تھے میرا یہ بھی خیال ہے کہ اگر ہم مختلف مذاہب کی مقدس کتابوں کا مطالعہ اُن کے پیروؤں کے نقطۂ نظر سے کریں تو یہ معلوم ہوگا کہ وہ سب اصلاً بنیادی طور پر ایک ہیں اور ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ (۲۶)

خدا کا عقیدہ سب مذہبوں کا مرکزی نقطہ ہے۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ کوئی زمانہ ایسا آئے گا۔ جب عملی طور پر دُنیا میں صرف ایک ہی مذہب ہوگا۔ نظری حیثیت سے تو چونکہ خدا ایک ہے اس لیے مذہب بھی صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ مگر عملاً میں نے کوئی دو آدمی بھی ایسے نہیں پائے جن کے ذہن میں خدا کا تصور بالکل

ایک ہو۔ اِس لیے غالباً دُنیا میں ہمیشہ طبیعت و مزاج اور آب و ہوا کے اختلاف کی رعایت سے مختلف مذہب رہیں گے۔ (۲۷)

میں سمجھتا ہوں کہ دُنیا کے سب بڑے مذہب کم و بیش سچے ہیں۔ کم و بیش میں نے اِس لیے کہا کہ چونکہ انسان خود ناقص ہے۔ اِس لیے جس چیز کو انسان کا ہاتھ لگ جائے اُس میں بھی نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ کمال خدا کی صفت ہے، جس میں کوئی اُس کا شریک نہیں، میں یہ مانتا ہوں کہ انسان بھی خدا کی طرح کمال حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن جب یہ سعادت حاصل ہو جائے تو اس کی تشریح اور تعریف ناممکن ہے۔ اِس لیے میری ناچیز رائے میں وید، قرآن، بائبل (کے جو تصورات ہم رکھتے ہیں وہ بھی) ناقص ہیں۔ ہم جیسے ناقص الخلقت جو جذبات کے تھپیڑوں میں ڈولتے رہتے ہیں، اپنے آپ کو کلام الٰہی کا مفہوم سمجھنے سے قاصر پاتے ہیں۔ (۲۸)

میں صرف ویدوں کو کلام الٰہی نہیں مانتا۔ میرا عقیدہ ہے کہ بائبل، قرآن زنداوستا بھی اسی طرح الہامی ہیں جیسے وید۔ ہندو دھرم کی کتابوں پر میرا عقیدہ مجھ سے یہ تقاضا نہیں کرتا کہ میں اُن کے ہر شبد اور ہر اشلوک کو الہامی مانوں .... میں اپنے آپ کو کسی ایسی تعبیر کے ماننے کا پابند نہیں سمجھتا جو عقل کے یا اخلاقی حس کے منافی ہو۔ (۲۹)

مندر ہوں یا مسجدیں یا گرجے .... میں خانۂ خدا کی ان مختلف شکلوں میں کوئی تفریق نہیں کرتا۔ یہ شکلیں وہی ہیں جو ہمارے عقیدوں نے بنائی ہیں۔ انسان کے دل میں ان دیکھے خدا تک پہنچنے کی جو آرزو ہے۔ یہ اسی کے مظاہر ہیں۔ (۳۰)

پرارتھنا نے مجھے بچا لیا۔ (۳۱) کے بغیر میں کب کا مجنون ہو گیا ہوتا۔ مجھے نجی اور عمومی زندگی میں بڑے بڑے تلخ تجربے ہوئے۔ اُن سے میں عارضی طور پر مایوسی کا شکار ہو گیا۔ جس چیز کی بدولت میں نے مایوسی سے نجات پائی وہ پرارتھنا تھی۔ یہ اُس طرح میری زندگی کا جز نہیں بنی جیسے سچائی۔ یہ تو مجھے ضرورت سے مجبور ہو کر اختیار کرنی پڑی

کیوں کہ میں نے اپنے آپ کو ایسی مصیبت میں پایا جس میں مجھے اُس کے بغیر تسکین ہو
ہی نہیں سکتی تھی، رفتہ رفتہ خدا پر میرا عقیدہ مضبوط ہوتا گیا۔ اور پرارتھنا کی لگن بڑھتی
گئی۔ زندگی اُس کے بغیر خالی اور سنسان معلوم ہوتی تھی۔ میں جنوبی افریقہ میں عیسائیوں
کی عبادت میں حاضر ہوا تھا مگر وہ میرے دل کو نہیں لگی۔ اِس لیے میں اُن کے ساتھ
شریک نہیں ہو سکا۔ وہ خدا سے عجز و نیاز سے التجا کرتے تھے۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکا۔
مجھے بُری طرح ناکامی ہوئی، شروع میں مجھے خدا پر اور عبادت پر عقیدہ ہی نہیں تھا۔
مجھے اپنی زندگی میں خلا کا احساس عمر کی اِس منزل میں نہیں بلکہ بہت بعد میں ہوا۔ اُس
وقت مجھے یہ محسوس ہوا کہ جیسے غذا جسم کے لیے ناگزیر ہے۔ اُسی طرح عبادت روح
کے لیے ناگزیر ہے ______ ۔ بلکہ دراصل جسم
کے لیے غذا کی اتنی ضرورت نہیں جتنی روح کے لیے عبادت کی ہے۔ اِس لیے کہ
اکثر جسمانی صحت کیلئے فاقے کی ضرورت پڑتی ہے، مگر عبادت کا فاقہ نہیں ہوا
کرتا۔ اِس لیے کہ دعا میں بے اعتدالی ہو ہی نہیں سکتی۔ دُنیا میں تین سب سے بڑے
مذہبی رہنماؤں بُدھ، مسیحؑ اور محمدؐ کی مستند شہادت موجود ہے کہ اُنہیں عبادت
سے انشراحِ قلب حاصل ہوا اور وہ اِس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ کروڑوں
ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں میں تسکین کا واحد ذریعہ عبادت ہے۔ آپ انھیں
"جھوٹا" کہیے یا خود فریبی کا شکار کہیے، میں تو یہ جانتا ہوں کہ اگر مجھے زندگی کا یہ
سب سے بڑا سہارا جس کے بغیر میں دم بھر زندہ نہیں رہ سکتا جھوٹ کے ذریعہ
ملا ہے تو یہ جھوٹ میرے جیسے طالبِ حق کے لیے بڑی کشش رکھتا ہے۔ باوجود اس کے
کہ سیاسی افق پر مایوسی ہی مایوسی نظر آتی تھی۔ میرے سکونِ قلب میں خلل نہیں پڑا۔
بلکہ میں نے دیکھا ہے کہ لوگ میرے سکونِ قلب پر رشک کرتے ہیں۔ یہ سکونِ قلب
عبادت سے حاصل ہوا ہے۔ میں عالم نہیں ہوں مگر مجھے یہ عاجزانہ دعویٰ ہے کہ

میں عابد ہوں۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ عبادت کی شکل کیا ہو۔ اِس معاملے میں ہر شخص مختار ہے۔ مگر اس کی بعض معین راہیں موجود ہیں اور محفوظ طریقہ یہی ہے کہ انسان گھسی پٹی پگڈنڈیوں پر چلے جن پر بڑے نے مذہبی راہنما چلتے تھے۔ ہر شخص کو کوشش کرکے یہ تجربہ حاصل کرنا چاہیے کہ روزمرہ عبادت سے اُس کی زندگی میں ایک نئی قدر کا اضافہ ہوتا ہے۔ (۳۱)

انسان کا اصل مقصد خدا کی معرفت ہے اور اس کی ساری سماجی، سیاسی اور مذہبی جدوجہد اِس آخری مقصد یعنی مشاہدۂ حق کو مدنظر رکھ کر ہونی چاہیے۔ سب انسانوں کی خدمت اِس جدوجہد کا لازمی جز بن جاتی ہے۔ اِس لیے کہ خدا کو پانے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ہم اس کا جلوہ اس کی مخلوق میں دیکھیں اور اِس مخلوق کے ساتھ گھُل مل کر ایک ہو جائیں، یہ صرف کل نوعِ انسانی کی خدمت ہی کے ذریعہ سے ممکن ہے اور یہ خدمت بجز اپنے ملک کے واسطے کے اور کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ میں کل کا ایک جزو ہوں اور خدا کو باقی نوعِ انسانی سے الگ نہیں پا سکتا۔ میرے ہم وطن، میرے سب سے قریبی ہمسائے ہیں۔ وہ اِس قدر بے بس، لاچار اور بے حس و حرکت ہو گئے ہیں کہ مجھے اپنی ساری توجہ اُن کی خدمت میں لگانی ہے۔ اگر میں اپنے آپ کو یہ یقین دلا سکتا کہ خدا ہمالیہ کے کسی غار میں ملے گا تو میں فوراً اُدھر چل کھڑا ہوتا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ میں اُسے انسانوں سے الگ نہیں پا سکتا۔ (۳۲)

یہ بڑی افسوسناک بات ہے کہ آج کل ہمارے نزدیک مذہب کے معنی اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ ہم کھانے پینے پر بندشیں لگائیں اور اونچ نیچ کے فرق کو قائم رکھیں۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ اِس سے بڑھ کر جہالت نہیں ہو سکتی۔ نسب کے فرق اور رسموں کی پابندی سے اونچ نیچ کا تعین نہیں ہوتا۔ اِن کا معیار صرف سیرت ہے۔ خدا نے اونچ نیچ کے امتیازی نشان کے ساتھ انسان کو پیدا نہیں کیا۔

بن جائیں تو ہم اپنی خوشی سے اپنے اختیار سے دست بردار ہوجاتے ہیں۔ اور پھر ہمیں تکان یا فرسودگی سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔(۳۸)

بے شک بعض مسائل ایسے ہیں جن میں ہم کو عقل سے زیادہ مدد نہیں ملتی اور عقیدے سے کام لینا پڑتا ہے۔ ایسے موقعوں پر عقیدہ عقل کے منافی نہیں بلکہ اسکے ماورا ہوتا ہے۔ عقیدہ ایک قسم کی غیر معمولی حس ہے اور اُس کی کارفرمائی اِس میدان میں ہوتی ہے جو عقل کی رسائی سے باہر ہے۔ یہ تین معیار ہیں جن پر مذہب کے دعوے آسانی سے جانچے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ دعویٰ کہ حضرت عیسےٰؑ خدا کے اکلوتے اور حقیقی بیٹے ہیں، مجھے خلاف عقل معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ خدا شادی کر کے اولاد پیدا نہیں کرسکتا۔ یہاں "بیٹے" کا لفظ صرف مجازی معنی میں استعمال ہوسکتا ہے۔ اِس معنی میں ہر شخص کو جو حضرت عیسیٰ کی جگہ ہو خدا کا حقیقی بیٹا کہا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی شخص روحانی اعتبار سے ہم سے کوسوں آگے ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یوں تو ہم سبھی خدا کے بیٹے ہیں مگر وہ ایک خاص معنی میں خدا کا بیٹا ہے۔ ہم تو اپنی زندگی اور کردار سے اِس رشتے کو جھٹلاتے ہیں مگر اُس کی زندگی اس رشتے کی شہادت دیتی ہے۔(۳۹)

خدا کسی شخص کا نام نہیں .... وہ تو قوت ہے۔ وہ زندگی کا جوہر ہے خالص اور منزہ شعور ہے۔ وہ ازلی اور ابدی ہے۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ سب لوگ اُس محیطِ کل حی وقیوم ہستی سے نہ فیض حاصل کرسکتے ہیں اور نہ اس کے سایۂ عاطفت میں پناہ لے سکتے ہیں۔

بجلی ایک زبردست قوت ہے۔ مگر ہر شخص اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ وہ چند قوانین پر عمل کیے بغیر پیدا نہیں کی جاسکتی۔ وہ ایک بے جان قوت ہے۔ انسان اگر کافی محنت کر کے اُس کے قوانین کا علم حاصل کرے تو اُس سے کام لے سکتا ہے۔

وہ جیتی جاگتی قوت بھی جسے ہم خدا کہتے ہیں اسی طرح دریافت کی جا سکتی ہے کہ ہم
اس کے قانون کو جانیں اور اس پر عمل کریں۔ (۴۰)

خدا کی تلاش میں نہ یاترا کی ضرورت ہے نہ بھگوان کی مورتی کے آگے چراغ جلانے
اور خوشبوئیں سلگانے کی، نہ اسے تیل چپڑنے اور سیندور لگانے کی۔ اگر ہم اپنے مادی جسم
کے احساس کو بالکل مٹا دیں تو اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے پائیں گے۔ (۴۱)

جب تک ہم کچھ مفروضات نہ قائم کرلیں کسی چیز کی تلاش ناممکن ہے۔ اگر ہم کچھ
فرض نہ کریں تو کچھ پا نہیں سکتے۔ دنیا کے لوگ جن میں دانشمند اور نادان سبھی شامل ہیں
شروع سے اس مفروضے کی بنا پر سوچتے رہتے ہیں کہ اگر ہم ہیں تو خدا بھی ہے اور اگر
خدا نہیں تو ہم بھی نہیں اور پھر چونکہ خدا کا عقیدہ نوعِ انسانی کی ہست و بود سے وابستہ
ہے اس لیے خدا کے وجود کو سورج کے وجود سے زیادہ واضح حقیقت سمجھا گیا ہے
اس جیتے جاگتے عقیدے سے زندگی کے بہت سے مسئلے حل ہوئے ہیں۔ اس سے
آلام ہستی میں بہت کمی ہوئی ہے۔ یہ زندگی میں ہمارا سہارا اور موت میں ہماری تسکین
کا باعث ہے۔ -

- -

- - - - - - اسی عقیدے کی بدولت حق کی تلاش دلچسپ اور کارآمد
بن جاتی ہے یہی حق کی تلاش خدا کی تلاش ہے۔ خدا حق ہے، خدا موجود ہے۔ اس لیے
کہ حق موجود ہے۔ ہم کو تلاش کا حوصلہ اسی لیے ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں حق موجود ہے اور
ہم اُسے پا سکتے ہیں۔ بہ شرطے کہ ہم اس کی جستجو میں محنت کریں اور ان مشہور اور
آزمائے ہوئے قاعدوں کی پابندی کریں جو اس جستجو کے لیے مقرر ہیں۔ تاریخ میں اس کی
مثال نہیں ملتی کہ یہ جستجو ناکام رہی ہو۔ یہاں تک کہ دہریے بھی جو خدا کے منکر
بنتے ہیں حق کے قائل ہیں اُن کی چال یہ ہے کہ اُنھوں نے خدا کا ایک اور نام رکھ لیا ہے

اور وہ بھی کوئی نیا نام نہیں۔ اِس کے نام بے شمار ہیں۔ حق اُن سب کا سرتاج ہے۔(۴۲)

یہی بات جو ہم نے خدا کے لیے کہی ایک حد تک اِس مفروضے پر بھی صادق آتی ہے کہ اخلاقی اصول سچے ہیں۔ سچ پوچھیے تو خدا کا یا حق کا عقیدہ بجائے خود ان اصولوں پر دلالت کرتا ہے جن لوگوں نے ان اصولوں سے انحراف کیا ہے۔ اُنھوں نے بے انتہا مصیبتیں اُٹھائی ہیں۔ اگر کسی چیز پر عمل کرنا مشکل ہو۔ تو اُسے محال نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہمالیہ پر چڑھنے کی مہم کا کامیاب ہونا بھی کچھ شرطوں پر موقوف ہے۔ اگر ان شرطوں کا پورا کرنا مشکل ہو تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اس مہم کی کامیابی ناممکن ہے۔ اِس سے تو جستجو میں دلچسپی اور ذوق وشوق بڑھ جاتا ہے۔ اب آپ یہ سمجھ لیجیے کہ خدا اور حق کی تلاش کی مہم ان بے شمار مہموں سے جو ہمالیہ پر بھیجی جاتی ہیں بدرجہا زیادہ مشکل اور اسی لیے زیادہ دلچسپ ہے۔ اگر ہمیں اس سے کوئی ذوق نہیں تو اس کا سبب یہی ہے کہ ہمارا عقیدہ کمزور ہے۔ جو چیزیں ہم ان جسمانی آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہ ہمیں اس ہستی سے زیادہ حقیقی معلوم ہوتی ہیں جس کے سوا کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ظاہری روپ ہمیں دھوکا دیتے ہیں پھر بھی ہم بے حقیقت چیزوں کو حقیقی سمجھ لیتے ہیں۔ اگر ہم پر ان کا بے حقیقت ہونا کھل جائے تو گویا آدھی مہم سر ہو گئی۔ بلکہ خدا کی اور حق کی تلاش میں آدھے سے زیادہ راستہ طے ہو گیا۔ جب تک ہم ان بے حقیقت چیزوں سے قطع تعلق نہ کریں ہمیں اِس اہم ترین جستجو کی فرصت ہی نہیں ملے گی۔ کیا یہ ایسا کام ہے جو فرصت کی گھڑیوں کے لیے اُٹھا رکھا جائے۔(۴۳)

خدا کی شانیں بے شمار ہیں اِس لیے کہ اِس کے جلوے بے شمار ہیں۔ اُنھیں دیکھ کر مجھ پر حیرت اور ہیبت طاری ہو جاتی ہے اور ایک لمحے کے لیے دم بخود رہ جاتا ہوں۔ مگر میں خدا کی پرستش صرف حق کی حیثیت سے کرتا ہوں۔ میں نے ابھی تک اسے پایا نہیں ہے۔ مگر اس کی تلاش میں لگا ہوا ہوں۔ اِس جستجو کی راہ میں ان چیزوں کو جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہیں قربان کرنے کو تیار رہوں۔ اگر جان کی قربانی بھی مانگی جائے تو مجھے

امید ہے کہ مجھے اُس میں بھی تامل نہ ہوگا۔ مگر جب تک مجھے حقِ مطلق کی معرفت حاصل نہ ہو۔ میں اِسی اضافی حق پر قائم رہوں گا۔ جو میرے تصور میں ہے۔ (۴۴)

• راہِ طلب میں اکثر مجھے حقِ محض یعنی خدا ئے برحق کی جھلک نظر آئی اور روز بروز یقین ہوتا جاتا ہے کہ صرف وہی حقیقی وجود رکھتا ہے اور سب چیزیں غیر حقیقی ہیں۔ جس کا جی چاہے اگر دیکھے کہ مجھے یہ یقین کیوں کر حاصل ہوا۔ میرے تجربوں میں اور اگر ممکن ہو تو میرے یقین میں بھی شریک ہو۔ اِس کے علاوہ مجھے یہ بھی یقین ہوتا چلا جاتا ہے کہ جو چیز میرے لیے ممکن ہے وہ ایک ذرا سے بچے کے لیے بھی ممکن ہے اور میں جو کہتا ہوں اِس کی میرے پاس معقول وجوہ ہیں۔ تلاشِ حق کی راہیں مشکل بھی ہیں اور آسان بھی ہو سکتا ہے کہ ایک مغرور آدمی کے لیے اُن پر چلنا ناممکن ہو اور ایک معصوم بچے کے لیے ممکن ہو۔ طالبِ حق کو خاک راہ سے بھی زیادہ خاکسار ہونا چاہیے۔ (۴۵)

اگر ہم کو حق کی کامل معرفت حاصل ہو جائے تو ہم محض طالب نہیں رہیں گے بلکہ خدا سے واصل ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ حق خدا ہے۔ مگر چونکہ ہم صرف طالب ہیں اس لیے تلاش میں لگے ہوئے ہیں اور اپنے ناقص ہونے کا شعور رکھتے ہیں اور اگر ہم خود ناقص ہیں تو ہمارا مذہب کا تصور بھی ناقص ہوگا۔ ہم مذہب کی کما حقہ معرفت حاصل نہیں کر سکتے اسی طرح خدا کی معرفت سے قاصر ہیں۔ ہمارا مذہب کا تصور چونکہ ناقص ہے اِس لیے ہمیشہ معرضِ ارتقا میں رہتا ہے اور اگر سب مذہبوں کا تصور جو انسانوں کے ذہن میں ہے۔ ناقص ہے تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان میں سے کون کس سے بہتر ہے۔

• سب مذاہب حقیقت کا آئینہ ہیں مگر سب ناقص اور سب میں خطا کا امکان ہے۔ دوسرے مذہبوں کا احترام کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہم اُن کی خامیوں کو نہ دیکھیں اسی طرح ہمیں اپنے مذہب کی خامیوں کا بھی اچھی طرح احساس ہونا چاہیے۔ مگر ان کی بنا پر اپنے مذہب کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ بلکہ اِن خامیوں کو دور کرنے کی کوشش

کرنا چاہیے جب ہم سب مذہبوں کو ایک آنکھ سے دیکھیں گے تو ہمیں اس میں تامل نہیں ہوگا۔ بلکہ اُسے اپنا فرض سمجھیں گے کہ دوسرے مذہبوں کی اچھی بات کو اپنے مذہب میں سمولیں۔

جس طرح درخت میں تنہ صرف ایک ہوتا ہے لیکن شاخیں اور پتیاں بہت سی ہوتی ہیں، اسی طرح سچا اور کامل مذہب ایک ہے۔ مگر انسانوں میں پہنچ کر ایک مذہب کے کئی مذہب ہو جاتے ہیں؛ وہ ایک مذہب نطق و بیان سے بالاتر ہے۔ ناقص انسان اپنی بساط کے مطابق اسے الفاظ کا عملی جامہ پہناتے ہیں اور دوسرے انسان جو اسی طرح ناقص ہیں ان الفاظ کی تعبیر کرتے ہیں۔ اب کس کی تعبیر کو صحیح سمجھا جائے۔ ہر شخص اپنے نقطۂ نظر سے حق پر ہے۔ مگر ممکن ہے کہ در اصل ہر شخص غلطی پر ہو۔ اسی لیے رواداری کی ضرورت ہے۔ رواداری اپنے مذہب سے بے پروائی کا نام نہیں بلکہ اس کے ساتھ زیادہ معقولیت اور خلوص سے محبت کرنے کا۔ رواداری سے ہمیں روحانی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ اِس میں اور مذہبی جنون میں بعد المشرقین ہے۔ مذہب کا سچا علم ان دیواروں کو جو ایک مذہب اور دوسرے مذہب کے بیچ میں حائل ہیں ڈھا دیتا ہے۔ (۴۵)

میرا عقیدہ ہے کہ اگر ہم انسان کا خوف دل سے نکال دیں اور صرف خدا لگتی سچائی کی تلاش میں رہیں، تو ہم سب خدا کے پیامبر بن سکتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ میں صرف خدا لگتی سچائی کی تلاش میں ہوں اور میں نے انسان کے خوف کو دل سے بالکل نکال دیا ہے۔ (۴۶)

مجھ پر مشیت الٰہی کا کوئی خاص انکشاف نہیں ہوتا۔ میرا پکا عقیدہ ہے کہ خدا روز ہی اپنے آپ کو ہر انسان پر ظاہر کرتا رہتا ہے۔ مگر ہم اس "دھیمی بے صدا آواز" کی طرف جو ہمارے اندر ہے اپنے کان، اور اِس "آتشیں مینار" کی طرف سے

جو ہمارے سامنے ہے اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ (۴۷)

مجھے آگے بڑھنا ہے ...... فقط خدا کو اپنا رہنما بنا کر۔ وہ ایک غیور حاکم ہے۔ اپنی حکومت میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔ اس لیے انسان کو اپنی ساری کمزوری کے ساتھ خالی ہاتھ اُس کے سامنے جا کر سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ وہ اُسے قوت بخشتا ہے کہ اکیلا ساری دُنیا کا سامنا کرے اور اُسے ہر مضرت سے محفوظ رکھتا ہے۔ (۴۸)

اگر میں خدا ئے حاضر کو اپنے اندر محسوس نہ کرتا تو یاس و مصیبت کے بے شمار منظر جو روز میری آنکھوں سے گزرتے ہیں مجھے سراسر دیوانہ بنا دیتے اور میرا ٹھکانا دریائے ہوگلی کی تہہ میں ہوتا۔ (۴۹)

خالص علمی نقطہ نظر سے دیکھیے تو نیکی اور بدی دونوں کی تہہ میں خدا کی قدرت ہے۔ وہی قاتل کے خنجر کو بھی حرکت میں لاتی ہے۔ اور سرجن کے چاقو کو بھی۔ اس کے باوجود نیکی اور بدی انسان کے لیے ایک دوسرے سے الگ الگ اور ایک دوسرے کے منافی ہیں۔ کیونکہ ایک نور کی نشانی ہے۔ دوسری ظلمت کی' ایک خدا کی دوسری شیطان کی۔ (۵۰)

مجھے خدا کے وجود کا اس سے زیادہ یقین ہے جتنا اِس بات کا کہ آپ اور ہم اِس کمرے میں بیٹھے ہیں اور میں اِس کی بھی شہادت دیتا ہوں کہ میں ہوا اور پانی کے بغیر زندہ رہ سکتا ہوں۔ مگر اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ میری آنکھیں نکال لیجیے۔ اِس سے میں مرنے کا نہیں۔ لیکن مجھ سے خدا کا عقیدہ چھین لیجیے تو میرا خاتمہ ہے۔ آپ اسے وہم کہیے مگر مجھے اعتراف ہے کہ یہ ایسا وہم ہے جس کا میں اِسی طرح سہارا لیتا ہوں جیسے بچپن میں خوف یا خطرے کی حالت میں رام نام کا سہارا لیتا تھا۔ یہ میں نے اپنی بوڑھی دائی سے سیکھا تھا۔

جب تک کہ ہم اپنے آپ کو فنا نہ کر دیں۔ اِس بدی پر جو ہمارے اندر ہے فتح نہیں پا سکتے خدا سچی آزادی کی قیمت یہی مانگتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیں اور جب کوئی شخص اپنے آپ کو مٹا دے تو وہ خود بخود ساری مخلوق کا خدمت گزار بن جاتا ہے۔ خدمت

ہی اُس کے لئے تفریح و مسرت کا سامان بن جاتی ہے وہ خود کو ایک نیا انسان پاتا ہے۔
جو خلقِ خدا کی خدمت سے کبھی نہیں تھکتا۔ (۵۲)

آپ کی زندگی میں کچھ ایسے لمحے آتے ہیں جب آپ کو بہرحال عملی قدم اٹھانا پڑتا ہے خواہ آپ کے سب سے قریبی دوست بھی آپ کا ساتھ نہ دیں اور جب کبھی ایک فرض دوسرے فرض سے ٹکراتا ہو تو آخری فیصلہ ہمیشہ اِس "دھیمی بے صدا آواز" کا ہونا چاہیئے جو آپ کے اندر ہے۔ (۵۳)

میں مذہب کے بغیر دم بھر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میرے بہت سے سیاسی دوست مجھ سے اِس وجہ سے مایوس ہیں کہ میری سیاست بھی مذہب سے ماخوذ ہے۔ اور اُن کا خیال صحیح ہے۔ میری سیاست بلکہ ساری جد وجہد کا سرچشمہ میرا مذہب ہے۔ بلکہ میں تو ایک اور قدم آگے جا کر یہ کہوں گا کہ ہر مذہبی آدمی کی ساری جد وجہد اُس کے مذہب سے ماخوذ ہونی چاہیئے اِس لیے کہ مذہب کے معنی ہیں۔ خدا سے وابستگی یعنی ہر سانس کا خدا کے حکم کے تابع ہونا۔ (۵۴)

میرے نزدیک سیاست جو مذہب کی روح سے خالی ہو گندی چیز ہے۔ جس سے ہمیشہ دور رہنا چاہیئے۔ سیاست کا تعلق قوم سے ہے اور جو شخص مذہبی رجحان رکھتا ہے یا دوسرے الفاظ میں خدا کا اور حق کا طالب ہے اُسے ہر چیز سے جو قومی فلاح سے تعلق رکھتی ہے سروکار ہونا چاہیئے۔ میرے نزدیک خدا اور حق مترادف الفاظ ہیں۔ اگر کوئی مجھ سے کہے کہ خدا باطل کا یا ظلم کا خدا ہے تو میں اُس کی پرستش سے انکار کر دونگا اس لیے سیاست میں بھی ہمیں "آسمانی سلطنت" قائم کرنی ہے۔ (۵۵)

میرا مذہبی زندگی بسر کرنا اِس کے بغیر ممکن نہیں کہ سب انسانوں میں گھل مل کر رہوں اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک سیاست میں حصّہ نہ لوں۔ آج انسان کی ساری جد وجہد ایک کُل ہے ـــــ ناقابلِ تقسیم! آپ سماجی، معاشی، سیاسی،

اور خالص مذہبی عمل کو الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹ سکتے۔ میں نہیں جانتا کہ مذہب انسانی جدوجہد سے الگ کیا چیز ہے۔ دراصل وہی تو انسان کے ہر عمل کی اخلاقی بنیاد ہے۔ اس کے بغیر زندگی "بے معنی شور و شر" کی بھول بھلیاں بن کر رہ جائے گی۔ (۵۶)

عقیدہ ہی ہماری کشتی کو طوفان میں کھیتا ہے، عقیدہ ہی پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتا ہے عقیدہ ہی سمندر کو پھاند کر اس پار پہنچ جاتا ہے اور یہ عقیدہ کیا ہے؟ اس بات کا جیتا جاگتا شعور کہ خدا ہمارے اندر موجود ہے۔ جس شخص کو یہ عقیدہ حاصل ہو جائے اُسے کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کا جسم بیمار ہو مگر اُس کی روح صحت مند ہوتی ہے۔ وہ مادی دولت سے محروم ہو مگر روحانی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔ (۵۷)

خارجی پیکر بہت ہیں۔ مگر روح اُن سب میں ایک ہی ہے۔ اور جب اس ظاہری کثرت کی تہہ میں بنیادی ہمہ گیر وحدت موجود ہے تو پھر اونچ نیچ سے فرق کی گنجائش کہاں؟ یہ ایک حقیقتِ واقعی ہے جو روزمرہ زندگی میں ہر قدم پر آپ کے سامنے آتی ہے۔ سب مذہبوں کا مقصد یہی ہے کہ اس بنیادی وحدت کا عرفان حاصل ہو

مجھے بچپن میں اِن شبدوں کی مالا جپنا سکھایا گیا تھا۔ جو ہندو دھرم کی مذہبی کتابوں میں خدا کے ہزار نام کہلاتے ہیں مگر ان ہزار ناموں سے اسمائے الٰہی کا شمار پورا نہیں ہوتا۔ ہمارا عقیدہ ہے اور میرے خیال میں بالکل صحیح ہے کہ خدا کے اتنے ہی نام ہیں جتنے اُسکے مخلوق ہیں۔ اس لیے ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا بے نام ہے اور چونکہ اُس کی بے شمار شکلیں ہیں اس لیے اُسے بے صورت کہتے ہیں۔ وہ بہت سی زبانوں میں کلام کرتا ہے۔ اس لیے اُسے بے کلام کہتے ہیں۔ اسی طرح یہ سلسلہ آگے چلتا ہے۔ جب میں نے اسلام کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ اسلام میں بھی متعدد اسمائے الٰہی ہیں

ان لوگوں کے ساتھ جو کہتے ہیں کہ خدا محبت ہے۔ میں بھی کہا کرتا تھا کہ خدا محبت ہے مگر میں اپنے دل کی گہرائی میں سوچتا تھا کہ گو خدا محبت بھی ہے، مگر سب سے زیادہ اہم

بات یہ ہے کہ وہ حق ہے اگر انسان کی زبان خدا کی مکمل تعریف کر سکتی تو میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں
(وہ تعریف یہ ہوتی) خدا حق ہے۔ دو سال ہوئے میں نے ایک قدم اور بڑھ کر کہا کہ حق خدا
ہے۔ آپ سمجھ جائیں گے کہ ان دو باتوں میں یعنی "خدا حق ہے اور حق خدا ہے"۔ ایک نازک
فرق ہے۔ میں اس نتیجے پر پچاس برس کی مسلسل اور ان تھک تلاشِ حق کے بعد پہنچا۔ تبھی مجھ
پر یہ حقیقت کھلی کہ حق تک پہنچنے کیلئے سب سے قریب کی راہ محبت ہے۔ مگر اسی کے ساتھ میں نے
دیکھا کہ محبت کے کئی معنی ہیں اور انسان کی محبت (خواہش نفس کے معنی میں) بعض اوقات اخلاقی
پستی میں بھی مبتلا کر سکتی ہے۔ محبت کے معنی اہنسا سمجھ کر اس کی پرستش کرنے والے بہت کم
لوگ ہیں۔ مگر حق کے معنی میں میں نے کوئی ابہام نہیں پایا۔ یہاں تک کہ دہریوں کو بھی اس میں کوئی
کلام نہیں کہ حق کی قوت کو ماننا ضروری ہے۔ البتہ دہریوں نے تلاشِ حق کی دھن میں خدا کے وجود
ہی سے انکار کر دیا اور ان کے نقطۂ نظر سے یہ ٹھیک بھی تھا۔ ان ہی باتوں کو مدِنظر رکھ کر میں نے
سوچا یہ کہنے کی بجائے کہ خدا حق ہے میں یہ کہوں کہ حق خدا ہے۔ پھر یہ مشکل بھی تھی کہ کروڑوں
آدمیوں نے خدا کے نام پر طرح طرح کے ظلم کئے ہیں (گو سائنس والوں نے بھی حق کے نام پر ظلم
کئے ہیں) اس کے علاوہ ہندو فلسفے میں ایک اور چیز ہے کہ صرف خدا کا وجود ہے، اور کسی چیز کا
نہیں۔ اسی پر اسلام کے کلمہ میں بھی زور دیا گیا ہے اور صاف طور پر یہ کہا گیا ہے۔ خدا کے
سوا کوئی چیز وجود نہیں رکھتی۔[ط] دراصل سنسکرت میں حق کے لئے جو لفظ ہے (ست) اس کے
معنی ہی وجود حقیقی کے ہیں۔ یہ اور بہت سی دوسری وجوہ تھیں جن کی بنا پر میں اس نتیجے پر
پہنچا کہ معبود حقیقی کی یہ تعریف "حق خدا ہے" میرے لئے سب سے زیادہ تسلی بخش ہے۔ اور
چونکہ میرا عقیدہ ہے کہ ذرائع اور مقاصد مترادف الفاظ ہیں۔ اس لئے مجھے یہ کہنے میں

ط اس میں کچھ غلط فہمی ہے۔ معروف کلمۂ توحید کے معنی یہ نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بہت
سے صوفیہ لا موجود الا اللہ کہتے ہیں۔ مگر اسے مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ نہیں کہہ سکتے۔

کوئی تامل نہیں کہ خدا محبت ہے۔ (۵۹)

حق محض کے نقطۂ نظر سے جسم بھی املاک میں داخل ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ لذت کی خواہش روح کیلئے جسم پیدا کردیتی ہے۔ جب خواہش نہ رہے تو جسم کی ضرورت نہیں رہتی اور انسان پیدائش اور موت کے چکر سے چھوٹ جاتا ہے۔ روح تو جوہر بسیط ہے کیا ضرورت ہے کہ وہ جسم کے پنجرے میں مقید ہو اور اس پنجرے کی خاطر بُرے کام کرے یہاں تک کہ قتل کی مرتکب ہو؟ اس طرح ہم ترکِ علائق کے مکمل نصب العین تک پہنچ جاتے ہیں اور یہ سبق حاصل کرتے ہیں کہ جسم جب تک ہے اُسے دوسروں کی خدمت میں کھپا دینا چاہیئے۔ یہاں تک کہ ہمارے جینے کا سہارا خدمت ہو۔ روٹی نہ ہو۔ ہمارا کھانا' پینا' سونا جاگنا محض خدمت کیلئے ہو۔ اسی انداز فکر سے ایک دن ہمیں حقیقی مسرت اور شاہدِ حقیقی کا دیدار حاصل ہوگا۔ (۶۰)

حق کیا ہے؟ یہ ایک مشکل سوال ہے مگر میں نے اُسے اپنی ذات کے لیے اس طرح حل کر لیا ہے۔ حق وہی ہے جو تمہاری ندائے باطن تم سے کہے اگر کوئی پوچھے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ لوگ حق کے مختلف اور متضاد تصور رکھتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسانی ذہن بے شمار افراد میں کارفرما ہے۔ اور ان سب کی ذہنی نشو ونما یکساں نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے جو ایک کے نزدیک حق ہے دوسرے کے نزدیک باطل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ تجربے کیے ہیں وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان تجربوں کے لئے بعض شرطوں کی پابندی ضروری ہے .... چونکہ آج کل ہر شخص بغیر کسی قسم کی ریاضت یا تربیت کے آزادئ ضمیر کے حق کا دعویدار ہے۔ لہٰذا دُنیا کے سامنے باطل کے اس قدر انبار لگائے جا رہے ہیں کہ وہ بچاری حیران ہے میں سچے عجز وانکسار کے ساتھ یہی عرض کرسکتا ہوں کہ حق کی معرفت اُس شخص کو حاصل نہیں ہو سکتی جسے انتہائی عاجزی کا احساس نہ ہو۔ اگر آپ حق کے سمندر کے آغوش میں تیرنا چاہتے ہیں تو اپنے آپ کو اتنا گھٹائیے کہ صفر رہ جائیں۔ (۶۱)

حق ہر انسان کے دل میں ہوتا ہے اُس کو چاہیئے کہ اپنے دل کو اچھی طرح ٹٹولے اور اس

طرح حق کا جو تصور اُس کے ذہن میں قائم ہو اُس کی ہدایت پر عمل کرے مگر یہ حق کسی کو نہیں کہ اپنے تصورِ حق کو دوسروں پر ٹھونسے اور اُنھیں اس کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کرے۔ (۶۲)

زندگی ایک سلسلہ ہے ترقی کا۔ اِس کی منزل تکمیل نفس یعنی معرفت نفس ہے۔ ہمیں اپنی کمزوریوں یا خامیوں کی وجہ سے اپنے نصب العین کو پست نہ ہونے دینا چاہیئے۔ مجھے اپنے اندر کمزوریوں اور خامیوں کا احساس ہے اور اس سے بڑا دُکھ ہے۔ روز حق کے حضور میں التجا کرتا ہوں کہ مجھے اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو دور کرنے کی توفیق دے۔ (۶۳)

میری تحریروں میں جھوٹ کی گنجائش نہیں۔ اِس لیے کہ میرا اٹل عقیدہ ہے کہ سچائی کے سوا اور کوئی مذہب نہیں اور میں ہر چیز کو حق کے لیے سچائی کی قربانی دینی پڑے ٹھکرا سکتا ہوں۔ کسی شخص سے نفرت کی میری تحریروں میں جھلک بھی نہیں آسکتی اِس لیے کہ مجھے دل سے یقین ہے کہ محبت ہی کے سہارے زمین قائم ہے۔ زندگی وہیں ہوتی ہے۔ جہاں محبت ہو۔ محبت کے بغیر زندگی موت ہے۔ محبت اور حق ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ میرا پکا عقیدہ ہے .... کہ ہم ساری دُنیا کو محبت اور سچائی سے تسخیر کر سکتے ہیں۔ (۶۴)

میں حق کے سوا کسی کا بندہ نہیں اور اس کے سوا کسی کی اطاعت مجھ پر فرض نہیں۔ (۶۵)

پہلے حق کو حاصل کرو۔ پھر حُسن اور خیر خود ہی حاصل ہو جائیں گے۔ در اصل مسیح نے اپنے پہاڑی وعظ میں یہی تلقین کی تھی۔ میرے نزدیک حضرت عیسیٰ سب سے بڑے فن کار تھے اِس لیے کہ انہوں نے حق کا مظاہرہ کیا۔ یہی بات حضرت محمدؐ پر صادق آتی ہے۔ قرآن عربی ادب کا شاہکار ہے۔ کم سے کم ماہرین کا یہی خیال ہے۔ چونکہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ حق کے طالب تھے۔ اِس لیے اُن میں حسنِ ادا خود بخود پیدا ہو گیا۔ حالانکہ دونوں میں سے کسی کا موضوع آرٹ نہ تھا۔ یہی حق اور حُسن ہے جس کی مجھے آرزو ہے، اِسی کے لیے میں جیتا ہوں اور اِسی کے لیے مروں گا۔ (۶۶)

خدا کی تعریف کرنا مشکل ہے۔ مگر حق کی تعریف ہر شخص کے دل پر نقش ہے۔ حق وہ ہے

جو اس وقت آپ کو حق معلوم ہو وہی آپ کا خدا ہے۔ اگر آپ اِس اضافی حق کی پرستش کرتے رہیں تو یقیناً ایک دن آپ کو مطلق کی معرفت حاصل ہو جائے گی۔ (۶۷)

میں راہ سے واقف ہوں۔ وہ سیدھی اور باریک ہے۔ تلوار کی دھار کی طرح، مجھے اِس پر چلنے میں لطف آتا ہے۔ جب میرا قدم ڈگمگاتا ہے تو میں روتا ہوں۔ خدا نے کہا ہے۔ "جو سعی کرتا ہے۔ وہ کبھی ہلاک نہیں ہوگا۔" مجھے اِس وعدے پر کامل یقین ہے۔ اگر میں اپنی کوتاہی کی وجہ سے ہزار بار ناکام رہا، پھر بھی بددل نہیں ہوں گا اور یہ اُمید کرتا رہوں گا کہ جب مجھے اپنے جسم پر پورا قابو حاصل ہو جائے گا۔ اور کبھی نہ کبھی دن ضرور ہوگا۔ اُس وقت مجھے حق کی روشنی نظر آنے لگے گی۔ (۶۸)

میں محض ایک طالبِ حق ہوں۔ میرا دعویٰ ہے کہ میں نے اِس منزل تک پہنچنے کی راہ ڈھونڈ لی ہے۔ اور برابر اِس راہ پر چل رہا ہوں۔ مگر ابھی منزل تک نہیں پہنچا ہوں۔ حق کی کامل معرفت حاصل ہو جانا دراصل اپنے آپ کو اور اپنے مقصد کو پالینا یعنی انسانِ کامل بن جانا ہے مجھے بڑے دُکھ کے ساتھ اپنی کوتاہیوں کا شعور ہے اور یہی میری ساری طاقت ہے۔ اِس لیے کہ انسان کو اپنی خامیوں کا علم ہونا ایک نادر چیز ہے۔ (۶۹)

میں دُنیا میں "ظلمت سے گھیرے میں" نور کو ڈھونڈھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں اکثر بھٹک جاتا ہوں اور میرے اندازے غلط نکلتے ہیں...... میرا بھروسا تمامتر خدا پر ہے انسانوں پر مجھے صرف اس لیے اعتماد ہے کہ خدا پر بھروسا ہے۔ اگر مجھے خدا کا آسرا نہ ہوتا تو میں ہرمَن کی طرح اپنے بنی نوع سے نفرت کرنے لگتا۔ (۷۰)

میں "سنت کے بھیس میں مدبر" نہیں ہوں مگر چونکہ سچائی سب سے بڑی حکمت ہے اِس لیے کبھی کبھی میرے عمل میں اعلیٰ درجہ کا تدبر پایا جاتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ میری کوئی پالیسی سوا سچائی اور اہنسا کے نہیں ہے میں سچائی اور اہنسا کو اپنے ملک یا مذہب کو بچانے کی خاطر بھی قربان نہیں کر سکتا۔ اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ اِس طرح کی قربانی دے کر ملک اور مذہب کی حفاظت ممکن ہی نہیں۔ (۷۱)

میرا خیال ہے کہ میں حق کے اصول کو اہنسا کے اصول سے زیادہ جانتا اور سمجھتا ہوں اور تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ اگر میں حق کا دامن چھوڑ دوں تو اہنسا کے معمے کو کبھی حل نہ کر سکوں گا .... شاید اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے سیدھی راہ چھوڑ کر پھیر کا راستہ اختیار کیا ہے۔ مگر اصل میں دونوں کا مطلب ایک ہی ہے اس لیے کہ شک ایمان نہ ہونے یا کمزور ہونے کی علامت ہے اس لیے میری دن رات یہی دعا ہے "میرے مالک مجھے ایمان عطا کر۔" (۷۲)

میں اس ذلت اور نام نہاد شکست اور طوفان و ہیجان کی زندگی کے درمیان اپنا سکون قلب اسی وجہ سے قائم رکھ سکتا ہوں کہ مجھے خدا پر یعنی حق پر ایمان ہے۔ ہم خدا کی بے شمار تعریفیں کر سکتے ہیں۔ مگر میں نے تو اپنے لئے یہی الفاظ چن لیے ہیں۔ "حق خدا ہے۔" (۷۳)

میرا یہ دعویٰ نہیں کہ مجھے کوئی ایسی ہدایت ہوتی ہے یا الہام ہوتا ہے جس میں خطا کا امکان نہیں۔ جہاں تک میرا تجربہ ہے، اگر کوئی انسان خطا سے بری ہونے کا دعویٰ کرے تو یہ قابل قبول نہیں۔ اس لیے کہ خطا سے بری وہ ہو سکتا ہے جو متضاد محرکات کے اثر سے آزاد ہو اور اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ ایک خاص موقع پر کوئی شخص متضاد محرکات کے اثر سے آزاد ہے۔ اس لیے خطا سے بری ہونے کا دعویٰ بہر حال ایک خطرناک دعویٰ ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان کو کہیں سے ہدایت مل ہی نہیں سکتی۔ دنیا بھر کے عارفوں کے تجربات کا خزانہ ہماری ہدایت کے لئے موجود ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کے علاوہ بنیادی حقیقتیں زیادہ نہیں ہیں۔ صرف ایک ہی بنیادی حقیقت ہے اور وہ حق ہے جسے اہنسا بھی کہتے ہیں۔ محدود انسان کو حق اور محبت کی جو نامحدود ہیں کامل معرفت کبھی حاصل نہیں ہوگی۔ مگر اتنی ضرور حاصل ہے جو ہمارے مقصد کیلئے کافی ہو۔ ان اصولوں کو برتنے میں ہم سے غلطی ہوگی اور ہم کبھی کبھی بہت سخت ٹھوکر کھائیں گے۔ مگر انسان ایک ایسا مخلوق ہے جسے حکومت خود اختیاری حاصل ہے۔ خود اختیاری میں یہ طاقت بھی شامل ہے کہ انسان غلطی کرے اور یہ بھی کہ جب غلطی ہو تو اس کی اصلاح کرلے۔ (۷۴)

ممکن ہے کہ میں ایک حقیر ہستی ہوں۔ مگر حق میری زبان سے بولتا ہے تو دنیا کی

کوئی طاقت مجھے مغلوب نہیں کر سکتی ۔ (۷۵)

مجھ سے کبھی اِس جرم کا ارتکاب نہیں ہوا کہ ظاہرداری کی باتیں کروں۔ میری تو فطرت یہ ہے کہ ایسی بات کہوں جو سیدھی دل میں اُتر جائے ۔ اگر وقتی طور پر مجھے اِس میں کامیابی نہ بھی ہو تب بھی میں یہ جانتا ہوں کہ سچّی بات آخرکار سنی جائے گی ۔ اور اثر کرے گی ۔ جیسا کہ مجھے بارہا تجربہ ہو چکا ہے ۔ (۷۶)

میں ایک ادنیٰ مگر سچا طالب حق ہوں اور جو لوگ راہِ طلب میں میرے ہم سفر ہیں اُنہیں پوری طرح اپنا ہم راز بنا لیتا ہوں تاکہ اُنہیں میری غلطیوں کا علم ہو جائے اور وہ اُن کی اصلاح کر سکیں ۔ مجھے اعتراف ہے کہ اکثر میرے اندازے غلط نکلے ۔ مگر ہر مرتبہ غلط قدم اُٹھانے کے بعد میں پیچھے لوٹ گیا ۔ اس لیے کوئی مستقل خرابی نہیں پیدا ہوئی ۔ بلکہ اہنسا کی بنیادی سچائی پہلے سے کہیں زیادہ واضح ہو گئی اور ملک کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ۔ (۷۷)

میں حق کے اندر اور حق کے ذریعے حسن کا مشاہدہ کرتا ہوں ۔ ساری سچائیاں یعنی صرف سچے خیالات ہی نہیں بلکہ نہ چہرے اور تصویریں، وہ گیت جن سے سچّائی جھلکتی ہو ۔ بہت حسین ہوتے ہیں ۔ عام طور پر لوگوں کو حق میں حُسن نظر نہیں آتا ۔ ایک معمولی آدمی اُس حسن سے بھاگتا ہے اور اُس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے ۔ سچا آرٹ تبھی پیدا ہوگا جب لوگ حق میں حسن دیکھنے لگیں گے ۔ (۷۸)

سچے فن کار کی نظر میں صرف وہ چہرا خوبصورت ہوتا ہے جس میں ظاہر سے قطع نظر روح کے حُسن باطن کا نور جھلکتا ہے ۔ حق سے الگ حُسن کا .... کوئی وجود نہیں ۔ البتہ حُسن اپنے آپ کو ایسی شکلوں میں بھی ظاہر کر سکتا ہے جو دیکھنے میں حسین نہ معلوم ہوں ۔ کہا جاتا ہے کہ سقراط اپنے زمانے میں سب سے سچا آدمی تھا مگر سارے یونان میں اس سے زیادہ بدصورت کوئی نہ تھا ۔ میرے خیال تو وہ حسین تھا ۔ اِس لیے کہ اُس کی ساری زندگی تلاشِ حق

گزری۔ اور آپ کو یاد ہوگا کہ اِس ظاہری بدصورتی کے باوجود فیڈیاس کو اس کے اندر سچائی میں حُسن نظر آیا۔ گویا ایک فن کار کی حیثیت سے فیڈیاس کو حُسن کے ظاہری خدوخال میں دیکھنے کی عادت تھی۔ (۷۹)

جب تک ہم اِس پیکرِ فانی میں اسیر ہیں۔ ہمیں حقِ کامل کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم صرف اس کا تصور کر سکتے ہیں۔ اِس عارضی جسم میں رہتے ہوئے ہم حق کا، جو ابدی ہے۔ مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ اِس لیے آخر میں انسان کو عقیدے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ (۸۰)

مجھ میں کوئی ایسی ملکوتی صفت نہیں ہے جو دوسروں میں نہ ہو۔ مجھے پیمبری کا دعوٰے نہیں ہے۔ میں تو صرف ایک ناچیز طالب حق ہوں جو اس کی جستجو کے در پے ہے۔ میں خدا کا دیدار حاصل کرنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کو بھی کم سمجھتا ہوں۔ میری ساری جدوجہد خواہ اسے سماجی کہیے، یا سیاسی، یا اخلاقی، یا انسان دوستی پر مبنی، اِسی مقصد کے لیے ہے اور چونکہ میں جانتا ہوں کہ خدا کا جلوہ اربابِ قوت و اقتدار سے زیادہ غریبوں اور بے کسوں میں نظر آتا ہے۔ اِس لیے میں اُن کے طبقے میں شامل ہونے کی کوشش کر رہا ہوں اور یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اُن کی خدمت کروں۔ اِسی وجہ سے مجھے پست طبقوں کی خدمت سے شغف ہے اِس کے لیے سیاست میں داخل ہونا ضروری ہے لہٰذا میں سیاست میں داخل ہو گیا ہوں۔ میں کوئی گرو نہیں۔ میں تو ہندوستان کا اور ہندوستان کے ذریعے ساری انسانیت کا ناچیز خادم ہوں۔ جو سچی طلب کی راہ میں ٹھوکریں کھاتا بڑھتا چلا جاتا ہے۔ (۸۱)

سچائی اور نیک کرداری سے برتر کوئی مذہب نہیں ہے۔ (۸۲)

سچا مذہب اور سچا اخلاق ایک دوسرے سے اِس طرح وابستہ ہیں کہ الگ نہیں کیے جا سکتے۔ مذہب کو اخلاق سے وہ نسبت ہے۔ جو پانی کو زمین میں بوئے

جاننے والے بیج سے ہے۔ (۸۳)

میں ہر مذہبی عقیدے کو جو عقل میں نہ آئے اور اخلاق کے منافی ہو رد کر دیتا ہوں ہاں اگر کوئی مذہبی جذبہ عقل کے خلاف ہو مگر منافی اخلاق نہ ہو تو اُسے برداشت کر لیتا ہوں۔ (۸۴)

جیسے ہی ہم نے اخلاق کی بنیاد کو چھوڑا ہماری مذہبیت بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ مذہب کبھی اخلاق کے تقاضوں کو رد نہیں کر سکتا۔ مثلاً کوئی انسان جو جھوٹا، یا ظالم یا بدکار ہو، یہ دعوےٰ نہیں کر سکتا کہ وہ باخدا ہے۔

ہماری خواہشات و محرکات دو قسموں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں ـــــــ خود غرضانہ اور بے غرض۔ کل خود غرضانہ خواہشات منافی اخلاق ہیں۔ مگر یہ خواہش کہ ہم اپنی اصلاح و ترقی کی کوشش کریں۔ تاکہ دوسروں کی بھلائی کر سکیں سراسر اخلاقی ہے۔ سب سے برتر قانون اخلاق یہی ہے کہ ہمیں نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے لگاتار کوشش کرنی چاہیئے۔ (۸۶)

اگر میرا کوئی فعل جسے میں روحانی کہوں عملاً غیر مفید ثابت ہو تو اُسے ناکام سمجھنا چاہیے۔ مجھے دل سے یقین ہے کہ سب سے زیادہ روحانی فعل وہی ہے جو سچے معنی میں مفید و کارآمد ہو۔ (۸۷)

مقدس کتابیں عقل و فہم سے بالاتر نہیں ہو سکتیں، اُن کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ عقل کا تزکیہ اور حق کی توضیح کریں۔ (۸۸)

غلط بات اِس وجہ سے کہ بہت پھیل گئی ہے سچ نہیں بن جاتی۔ اِسی طرح سچی بات اِس بنا پر کہ اُسے کوئی نہیں مانتا، غلط نہیں ہو جاتی۔ (۹۰)

جو چیز غلط ہے اُس کی تائید میں دُنیا بھر کی مقدس کتابوں کے حوالے پیش کیے جا سکیں تب بھی وہ تنقید سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی۔ (۸۹)

میں اس کا قائل نہیں کہ کوئی قدیم چیز محض قدامت کی بنا پر اچھی ہے اس لئے

میں لوگوں سے یہ نہیں کہتا کہ قدیم روایات کے سامنے اپنی عقلِ خداداد کو معطل ہو جانے دیں۔ روایات خواہ کتنی ہی قدیم ہوں۔ اگر اخلاق کے منافی ہوں تو اُنہیں دیس نکالا دے دینا چاہیئے۔ چھوت چھات چاہے وہ قدیم روایت ہو۔ کمسن بیوادی کو بیوہ رکھنا۔ اور بچپن میں شادی کر دینا، چاہے وہ پراچین رسم ہو اور بہت سے پرانے ہولناک عقائد اور توہم پرستانہ اعمال، میرا بس چلے تو ان سب کو صفحہ ہستی سے مٹا دوں۔ (۹۱)

میں مورتی پوجا کا منکر نہیں ہوں۔ میرے دل میں کسی مورتی کو دیکھ کر پرستش کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ مگر میرا خیال ہے کہ مورتی پوجا انسانی فطرت کا ایک جزء ہے۔ ہم سب کے دل میں اشاریت کی طلب ہوتی ہے۔ (۹۲)

میں پرارتھنا میں مورتیوں سے کام لینے کو منع نہیں کرتا، مگر میں نرنکار کی پوجا کو ترجیح دیتا ہوں۔ شاید یہ درست نہیں۔ ایک شخص کے لیے ایک چیز مناسب ہوتی ہے دوسرے کے لئے دوسری چیز۔ اُن میں انصاف سے ساتھ مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔ (۹۳)

مجھے یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ انسانوں کی طرح الفاظ کی معنویت میں بھی درجہ بدرجہ ارتقا ہوتا ہے۔ مثلاً سب سے زیادہ پُرمعنی لفظ — خدا — کا مفہوم ہم سب کے لیے یکساں نہیں ہے۔ ہر شخص کے ذہن میں اُس کا مفہوم اُس کے ذاتی تجربے کے لحاظ سے الگ الگ ہوتا ہے۔ (۹۴)

مجھے اپنی زندگی میں نہ تضاد نظر آتا ہے نہ جنون کی کیفیت۔ یہ سچ ہے کہ جس طرح انسان اپنی پشت کو نہیں دیکھ سکتا۔ اسی طرح اُسے اپنی غلطی یا اپنے جنون کا احساس نہیں ہوتا مگر عارفوں نے اکثر مذہبی آدمی کو مجنوں سے تشبیہہ دی ہے۔ اس لیے میں اس خیال سے خوش ہو لیتا ہوں کہ شاید میں صحیح العقل نہ ہوں اور سچا مذہبی آدمی ہوں۔ میں ان دونوں میں سے کیا ہوں اور کیا نہیں ہوں، اس کا فیصلہ میرے مرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ (۹۵)

جب میں کسی خطا کار کو دیکھتا ہوں تو دل میں کہتا ہوں، مجھ سے بھی خطائیں سرزد

ہوتی ہیں۔ جب میں کسی شہوت پرست کو دیکھتا ہوں تو دل میں کہتا ہوں، میں بھی ایک زمانے میں ایسا ہی تھا۔ اس طرح مجھے دنیا میں ہر شخص سے اپنا پن کا احساس ہوتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ جب تک دُنیا میں ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کو بھی راحت و مسرت نصیب نہ ہو، مجھے چین نصیب نہیں ہو سکتا۔ (۹۶)

اگر کسی شخص کو اس کے استحقاق سے کم دوں تو مجھے اپنے خالق کے سامنے جواب دینا پڑے گا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر وہ دیکھے گا کہ میں نے کسی کو اس کے حق سے زیادہ دے دیا تو وہ خوش ہوگا اور مجھ پر اپنی برکت نازل کرے گا۔ (۹۷)

میری زندگی جو مسلسل مشغولیت میں گزرتی ہے، خوشی سے معمور ہے۔ کیونکہ مجھے اس کا کھٹکا نہیں کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ اس لیے میں انسان ہوا کی طرح آزاد اور بے فکر ہوں۔ ...... اس لیے کہ میں سچے دل سے نفسانی خواہشات کے ضبط کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے بڑی تقویت ہوتی ہے۔ (۹۸)

میں اپنے ہی نوع کی خامیوں سے بخوبی واقف ہوں اس لیے مجھے کسی شخص پر طیش نہیں آتا۔ میرے پاس یہ علاج ہے کہ جہاں کہیں برائی نظر آتی ہے اس سے نپٹ لیتا ہوں۔ مگر برا کام کرنے والے کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ جس طرح میں اپنے لیے چاہتا ہوں کہ جو بری حرکتیں مجھ سے برابر ہوتی رہتی ہیں، اُن کی وجہ سے مجھے نقصان نہ پہنچے۔ (۹۹)

میں امید کا دامن نہیں چھوڑتا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ میرے پاس اس کا کوئی ثبوت موجود ہے کہ نیکی پھلے پھولے گی بلکہ یہ ہے کہ میرا اٹل عقیدہ ہے کہ آخرکار نیکی کا بول بالا ہونا ہے۔ (۱۰۰)

انسان کی صلاحیت کی ایک حد ہوتی ہے۔ جہاں انسان کو یہ زعم ہوا کہ وہ دنیا بھر کے سارے کام کر سکتا ہے۔ وہیں خدا اس کے غرور کا سر نیچا کر دیتا ہے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے۔ مجھ میں عجز و انکسار کی صفت اس حد تک ہے کہ میں دودھ پیتے بچوں سے بھی مدد لینے کو تیار ہوں۔ (۱۰۱)

سمندر کے ایک قطرے میں سمندر کی عظمت موجود ہے گو اُسے اُس کا شعور نہیں مگر جیسے ہی وہ سمندر سے الگ ہو کر ایک وجودِ مستقل بننا چاہتا ہے سوکھ کر رہ جاتا ہے۔ اِس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ع

زندگی بلبلا ہے پانی کا (۱۰۲)

میں اِس قدر اُمید سے بھرپور رہوں کہ کبھی مایوس نہیں ہو سکتا۔ بظاہر یہ شیخی معلوم ہوتی ہے مگر میں نہایت عجز و انکسار کے ساتھ یہ بات کہہ رہا ہوں۔ میں خدا کو قادرِ مطلق جانتا ہوں اور حق پر ایمان رکھتا ہوں۔ اِس لیے مجھے اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اِس ملک کا اور انسانیت کا مستقبل روشن ہے۔ (۱۰۳)

میرا مذہب کوئی بند کوٹھڑی نہیں ہے۔ اِس میں خدا کی ادنیٰ ترین مخلوق کے لیے گنجایش ہے مگر نک چڑھے پن اور نسل، رنگ اور عقیدے کے گھمنڈ کا گزر نہیں۔ (۱۰۴)

میرا یہ عقیدہ ہے کہ خیال، قول اور عمل میں عفت کی زندگی بسر کرنا روحانی کمال کی لازمی شرط ہے۔ جس قوم میں ایسے آدمی نہ ہوں وہ تہی مایہ ہے۔ (۱۰۶)

میں اِس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ دُنیا کے مذہب مل کر ایک ہو سکتے ہیں یا ہو جائیں گے۔ اِس لیے میں کوشش کر رہا ہوں کہ اِن میں قدرِ مشترک ڈھونڈھوں اور ایک کو دوسرے کے ساتھ رواداری برتنے پر آمادہ کروں۔ (۱۰۵)

خدا کے آگے گنہگار اور ولی سب برابر ہیں۔ سب کے ساتھ یکساں انصاف ہوگا۔ اور ترقی یا تنزل کا یکساں موقع ملے گا۔ دونوں اُس کی اولاد ہیں، اُس کی مخلوق ہیں جو ولی اپنے آپ کو کسی گنہگار سے بدتر سمجھے گا وہ اِس ولایت سے محروم ہو کر گنہگار سے بھی بدتر ہو جائے گا۔ اس لیے کہ برخلاف مغرور ولی کے گنہگار جو کچھ کرتا ہے بے سمجھے بوجھے کرتا ہے۔ (۱۰۷)

ہم اکثر روحانی علم کو روحانی کمال سمجھ لیتے ہیں۔ روحانیت مقدس کتابوں کے مطالعے یا فلسفیانہ بحث مباحثے سے نہیں بلکہ تصفیہ قلب سے حاصل ہوتی ہے اور بے اندازہ قوت بخشتی ہے۔ بے خوف ہونا روحانیت کی پہلی شرط ہے۔ بزدلوں کے عمل میں کبھی اخلاقی عمل کی شان نہیں ہو سکتی۔ (۱۰۸)

انسان کو چاہیے کہ دل و جان سے ساری مخلوقِ خدا کا بھلا چاہے اور یہ دعا کرے کہ اُسے سب کے ساتھ بھلائی کرنے کی قوت عطا ہو۔ سب کا بھلا چاہنے میں خود اُس کا بھلا ہے۔ جو شخص اپنی یا صرف اپنے فرقہ کی فلاح چاہتا ہے وہ خود غرض ہے اور اُس کا کبھی بھلا نہیں ہوگا۔......... انسان کیلئے بہت ضروری ہے کہ اُس چیز میں جسے وہ اپنے خیال میں اپنے لئے اچھا سمجھتا ہو اور اُس میں جو واقعی اُس کے لیے اچھی ہو فرق کر سکے (۱۰۹)

میں خدا کی وحدتِ مطلق پر ایمان رکھتا ہوں۔ اور اِسی لیے وحدتِ انسانی کا قائل ہوں۔ ہمارے جسم بہت سے ہیں تو کیا۔ روح تو ایک ہی ہے۔ سورج کی شعاعیں بکھر کر بہت سی ہو جاتی ہیں۔ مگر اُن کی اصل ایک ہے۔ اِس لئے نہ میں اپنے آپ کو بدترین انسان سے الگ سمجھ سکتا ہوں اور نہ نیک ترین انسان سے الگ سمجھا جا سکتا ہوں۔ (۱۱۰)

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور سیاست کو الگ الگ رکھتا۔ میں مذہب کا کلمہ پڑھتا ہوں اور اُس کی خاطر جان دینے کو تیار ہوں مگر یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ ریاست کا اِس سے کوئی تعلق نہیں۔ ریاست دُنیوی فلاح، صحت، خبر رسانی، بیرونی ملکوں سے تعلقات اور سکے وغیرہ کا انتظام کرے، نہ کہ میرے اور آپ کے مذہب کا۔ یہ ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔ (۱۱۱)

میں چاروں طرف مبالغے اور جھوٹ سے گھرا ہوا ہوں۔ انتہائی کوشش کے باوجود مجھے پتہ نہیں چلتا کہ سچائی کہاں ہے۔ مگر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں خدا سے

اور حق سے قریب تر پہنچ گیا ہوں۔ اس کی مجھے یہ قیمت دینی پڑی کہ میرے پرانے دوست مجھ سے چھوٹ گئے۔ مگر مجھے اس کا افسوس نہیں۔ میں تو اسے خدا سے قریب ہونے کی نشانی سمجھتا ہوں۔ کہ میں شدید مخالفت کا سامنا کرتے ہوئے اس نازک مسئلے کے بارے میں ہر شخص پر بغیر کسی خوف کے اپنی رائے تحریر و تقریر میں، صاف صاف ظاہر کر سکتا ہوں اور ان گیارہ باتوں پر جن کا میں نے عہد کر لیا ہے پورے اطمینان سے عمل کر سکتا ہوں۔ ساٹھ برس کی جد و جہد کے بعد آخر کار میں سچائی اور عفت کے اس نصب العین تک جو میں نے اپنے سامنے رکھا تھا پہنچنے کے قابل ہو گیا۔ (۱۱۲)

ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ انسان اپنا فرض ادا کر دے اور نتیجہ خدا پر چھوڑ دے انسان اپنی قسمت کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ بات جزوی طور پر صحیح ہے۔ وہ اپنی قسمت کی تعمیر اس حد تک کر سکتا ہے، جہاں تک وہ برتر قوت جو ہمارے سارے ارادوں اور منصوبوں پر پانی پھیر کر اپنا منصوبہ چلاتی ہے۔ ہمیں کرنے دے۔ میں اس قوت کو اللہ، خدا یا گاڈ نہیں کہتا، بلکہ حق کہتا ہوں۔ ساری سچائیاں صرف اسی برتر قوت کے دل میں سمائی ہیں جسے حق کہتے ہیں۔ (۱۱۳)

میرے نزدیک کوئی گناہ اس سے بڑھ کر نہیں کہ خدا کے نام پر بے گناہوں کو ستایا جائے۔ (۱۱۴)

جب ایک طرف اپنی کمتری اور کوتاہی کو دیکھتا ہوں اور دوسری طرف ان توقعات کو جو مجھ سے وابستہ کر لی گئی ہیں تو دم بھر کے لیے چکرا جاتا ہوں۔ مگر پھر یہ سوچ کر سنبھل جاتا ہوں کہ یہ خراج عقیدت مجھ ناچیز کے لیے جو نیکی اور بدی کا ایک طرفہ معجون ہے، نہیں ہے۔ بلکہ ستیہ اور اہنسا کے اس ناقص، مگر مقابلتہً عظیم پرتو کے لیے جو میرے اندر ہے۔ (۱۱۵)

میں دنیا کی ہر شے کو اپنے ملک کی خاطر چھوڑنے کو تیار ہوں۔ سوا دو چیزوں

ستیہ اور اہنسا کے اور ان دو چیزوں کو میں ساری دُنیا کے لیے بھی قربان نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ میرے لیے حق خدا ہے اور حق کو پانے کا اہنسا کے سوا کوئی وسیلہ نہیں۔ میں ہندوستان کی خدمت حق اور اہنسا کو قربان کر کے نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ میں جانتا ہوں جو شخص حق سے بے وفائی کرے وہ اپنے ملک سے اور اپنے پیاروں سے بھی بے وفائی کر سکتا ہے۔ (۱۱۶)

تیسرا باب

وسیلہ اور مقصد

وسیلہ اور مقصد میرے فلسفۂ زندگی میں مترادف الفاظ ہیں۔ (۱)

لوگ کہتے ہیں وسیلہ آخر وسیلہ ہی ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ وسیلہ ہی تو سب کچھ ہے جیسا وسیلہ ہوگا۔ ویسا ہی مقصد بھی ہوگا۔ وسیلے اور مقصد کے بیچ میں کوئی حدِ فاصل نہیں سچ پوچھیے تو خالقِ کائنات نے ہمیں وسیلوں پر تھوڑا بہت اختیار دیا ہے، مقصد پر بالکل نہیں۔ مقصد اور وسیلے میں تناسب حقیقی ہے۔ یہ وہ کلیہ ہے جس میں کوئی استثنا نہیں۔ (۲)

اہنسا اور ستیہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گتھے ہوئے ہیں کہ انھیں الگ کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ انھیں ایک سکے کے دو رخ بلکہ دھات کی ایک سادی چکنی ٹکلی کے دو رخ سمجھنا چاہیے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کون سا رخ سیدھا ہے اور کون سا الٹا؟ تاہم اہنسا وسیلہ ہے اور مقصد۔ وسیلہ وہی کہلائے گا۔ جو ہماری دسترس میں ہو۔ اس لیے اہنسا ہمارا اولین حق ہے۔ اگر ہم وسیلہ کی فکر کرتے رہیں تو

مقصد کبھی نہ کبھی حاصل ہو کر رہے گا۔ ایک بار ہم اس بات کو اچھی طرح سمجھ جائیں پھر ہماری فتح یقینی ہے۔ چاہے جتنی ناکامیاں ہمیں اُٹھانی پڑیں ہم حق کی تلاش کو نہیں چھوڑ سکتے۔ کیونکہ وہی وجود حقیقی ہے۔ وہی خدا ہے۔ (۳)

میں اس کا قائل نہیں کہ ہم تشدد کے چھوٹے سے راستے سے کامیابی کی منزل تک پہنچ جائیں...... چاہے کسی کام کے کرنے والے کی نیت میرے نزدیک کتنی ہی ہمدردی اور تعریف کے قابل ہو۔ میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقصد کے لیے بھی تشدد کے طریقے استعمال کرنے کا شدید مخالف ہوں۔ اس لیے تشدد کے حامیوں میں اور مجھ میں کبھی سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔ مگر میرا اہنسا کا عقیدہ نہ صرف اس میں مانع نہیں ہوتا بلکہ اس پر مجبور کرتا ہے کہ انارکسٹوں اور تشدد کے حامیوں سے بھی ملتا رہوں۔ مگر ان سے ملنے کی ہمیشہ صرف ایک ہی غرض ہوتی ہے اور وہ یہ کہ میں انھیں اس چیز سے جسے میں اُن کی غلطی سمجھتا ہوں باز رکھوں۔ اس لیے کہ تجربے نے مجھے یقین دلایا ہے کہ جھوٹ اور تشدد سے کبھی کوئی مستقل فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر میرا یہ عقیدہ فریب خیال ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ بڑا دل کش فریب خیال ہے (۴)

آپ کا یہ خیال کرنا کہ وسیلے اور مقصد میں کوئی تعلق نہیں، بہت بڑی غلطی ہے۔ اس غلطی کا شکار ہو کر ان حضرات نے بھی جو مذہبی سمجھے جاتے ہیں، زبردست جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ آپ کا استدلال ایسا ہے جیسے کوئی کہے کہ ہم گوکھرو بو کر اس سے گلاب کا پھول پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر میں سمندر کو عبور کرنا چاہوں تو صرف کشتی ہی میں کر سکتا ہوں، بیل گاڑی کا استعمال کروں تو دم بھر میں گاڑی اور میں دونوں سمندر کی تہہ میں جا پہنچیں گے۔ جیسا خدا ویسا ہی اُس کا پرستار، ایک ایسا قول ہے جس پر غور کرنا چاہیے۔ اس کے معنی کو توڑ مروڑ کر کچھ سے کچھ کر دینے سے بہت سے لوگ گمراہ ہو گئے۔ وسیلہ کو بیج سے تشبیہ دی جا سکتی ہے اور مقصد کو درخت سے ...... وسیلہ اور مقصد میں ویسا ہی اٹوٹ رشتہ ہے جیسا

نیچ اور درخت میں اگر میں شیطان کو سجدہ کر لوں تو اس سے وہ نتیجہ نہیں نکلے گا جو خدا کی عبادت کرنے
سے۔ اس لیے اگر کوئی یہ کہے "مجھے تو خدا کی عبادت کرنی ہے۔ اس میں کیا حرج ہے اگر میں شیطان
کے وسیلے سے کروں۔" تو یہ اُس کی جہالت اور حماقت ہوگی۔ ہم وہی کاٹتے ہیں جو بوتے ہیں۔(۵۵)

سوشلزم بڑا خوبصورت لفظ ہے اور جہاں تک میں جانتا ہوں سوشلزم میں سماج
کے سبھی ارکان برابر ہوتے ہیں، اونچ نیچ کا فرق نہیں ہوتا۔ انسان کے جسم میں سر سب سے
اوپر ہونے کی وجہ سے اونچا اور پاؤں کے تلوے زمین کو چھونے کی وجہ سے نیچے نہیں ہو جاتے
جس طرح جسم کے سب اعضاء برابر ہیں اسی طرح سماج کے سب ارکان برابر ہیں۔ یہی سوشلزم
ہے۔

اس میں راجا اور کسان، غریب اور امیر، مالک اور مزدور سب ایک ہی سطح پر ہوتے
ہیں۔ مذہبی اصطلاح میں یوں کہیے کہ سوشلزم میں دوئی نہیں ہوتی۔ دنیا بھر میں سماج پر نظر
ڈالیے تو دوئی یا کثرت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وحدت کا کہیں نام نہیں.........
میرا تصور وحدت یہ ہے کہ نقوش کی کثرت میں تصویر کی کامل وحدت ہو۔ ایسی سماج بنانے
کے لیے اس سے کام نہیں چلے گا کہ ہم فلسفیانہ بے تعلقی کے ساتھ حالات کا مشاہدہ کرتے
رہیں اور یہ کہتے رہیں کہ جب تک سب لوگ سوشلزم کے قائل نہ ہو جائیں ہم کوئی قدم نہیں
اُٹھا سکتے۔ بغیر اپنی زندگی کو بدلے ہوئے ہم تقریریں کرتے رہیں۔ پارٹیاں بناتے رہیں اور باز
کی طرح انتظار میں رہیں کہ جب شکار ادھر آئے گا تو پکڑ لیں گے۔ یہ کبھی کوئی سوشلزم ہے!
جتنا زیادہ ہم سوشلزم کو شکار سمجھ کر اس کی تاک میں رہیں گے۔ اتنا ہی وہ ہم سے دور ہوتا جائیگا۔
سوشلزم تو اسی وقت شروع ہو جاتا ہے جب پہلا آدمی اسے اختیار کرے۔ اگر ایک
شخص بھی ایسا موجود ہو تو آپ اس پر صفر لگاتے چلے جائیے۔ پہلے صفر سے ایک کے دس
بن جائیں گے اور ہر صفر کے ساتھ تعداد دس گنی بڑھتی جائے گی لیکن اگر آغاز صفر سے ہو یعنی کوئی شخص
ابتدا ہی نہ کرے تو کتنے ہی صفر لگائیے نتیجہ صفر ہوگا۔ کاغذ پر صفر ہی صفر لکھنے سے کاغذ بھی

ضائع ہوگا اور وقت بھی۔

سوشلزم بلور کی طرح شفاف ہے اس لیے اُسے حاصل کرنے کے وسائل کو بھی بلور کی طرح ہونا چاہیے۔ ناپاک ذریعہ سے جو نتیجہ حاصل ہوگا وہ بھی ناپاک ہوگا۔ اس لیے راجا کا سر کاٹ لینے سے راجہ اور کسان برابر نہیں ہو جائیں گے۔ اسی طرح سر کاٹنے کے عمل سے مالک اور مزدور میں برابری نہیں پیدا کی جا سکتی۔ حق کو ہم باطل کے ذریعے سے نہیں پا سکتے۔ سچائی پر مبنی کردار ہی کے ذریعہ سے ہم سچائی تک پہنچ سکتے ہیں۔ کیا حق اور اہنسا جڑواں نہیں ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ تو ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ اسی لیے یہ کہا گیا ہے کہ اہنسا اور ستیہ ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ انھیں ایک دوسرے سے جدا کرنا ناممکن ہے۔ سکوں کو دونوں طرف سے پڑھیے لفظوں کے حروف مختلف ہوں گے مگر رقم وہی ہوگی۔ سعادت بغیر کامل عفت کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ جہاں آپ نے نفس میں یا جسم میں ناپاکی کو جگہ دی فوراً جھوٹ اور تشدد بھی داخل ہو جائیں گے۔

اِس لیے وہی سوشلسٹ جو قول کے سچے، اہنسا کے پابند اور پاکباز ہوں۔ ہندوستان میں اور دُنیا میں سوشلسٹ سماج قائم کر سکتے ہیں۔ (۶)

تزکیۂ نفس کا روحانی ہتھیار اگرچہ غیر محسوس چیز ہے لیکن یہی اپنے ماحول میں انقلاب لانے کا اور بیرونی زنجیروں کو کاٹنے کا سب سے قوی اور موثر ذریعہ ہے۔ اُس کا کام چپکے چپکے ہوتا ہے۔ نظر نہیں آتا۔ بہ ظاہر یہ عمل لمبا اور اُکتا دینے والا ہے۔ لیکن اِس میں بڑا زور اور بڑی قوت ہے۔ یہی آزادی کا سب سے سیدھا، سب سے زیادہ قابلِ اعتماد اور جلد سے جلد منزل تک پہنچا دینے والا راستہ ہے اِس کا رہرو سخت سے سخت سعی کو سہل سمجھتا ہے۔ اِس کے لیے جو چیز ضروری ہے وہ عقیدہ ہے ——— اٹل پہاڑ کی طرح مستحکم عقیدہ جو ہلائے نہ ہلے۔ (۷)

مجھے اپنی قوم کو تکلیف اور مصیبت سے بچانے کی جتنی فکر ہے اُس سے زیادہ

اس کی ہے کہ انسانی فطرت کو بہیمانہ فطرت نہ بننے دوں۔ میں جانتا ہوں کہ جو لوگ اپنی خوشی سے تکلیفیں اٹھاتے ہیں وہ اپنے آپ کو اور ساری انسانیت کو بلند کرتے ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جو لوگ اپنے مخالفوں پر فتح پانے کی یا کمزور قوموں کا استحصال کرنے کی اندھا دھند کوشش میں بہیمیت کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ وہ نہ صرف خود پستی کے گڑھے میں گرتے ہیں بلکہ اپنے ساتھ نوعِ انسانی کو بھی گراتے ہیں۔ اور اس سے مجھ کو یا کسی شخص کو بھی خوشی نہیں ہو سکتی کہ انسانی فطرت کو کیچڑ میں لتھڑا ہوا دیکھے۔ اگر ہم سب ایک ہی خدا کی مخلوق ہیں اور ہمارے اندر ایک ہی روحِ ایزدی سمائی ہے تو ہم ہر شخص کے خواہ وہ اپنی قوم کا ہو یا غیر قوم کا گناہ میں شریک ہیں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مجھے کسی انسان کے دل میں خصوصاً انگریزوں کے اندر جن میں میرے بہت سے دوست ہیں، بہیمانہ جذبات کو اکسانے سے کس قدر کراہت ہوگی (۸)

مقاومت مجہول کا طریقہ سب سے واضح اور سب سے محفوظ طریقہ ہے۔ اس لیے کہ اگر مقصد صحیح نہ ہو تو صرف مقاومت کرنے والوں ہی کو نقصان پہنچتا ہے اور کسی کو نہیں۔(۹)

چوتھا باب

اہنسا یا عدم تشدد کا راستہ

اہنسا نوعِ انسانی کے ہاتھ میں سب سے بڑی قوت ہے۔ اس میں اس سے زیادہ طاقت ہے جتنی انسانی ذہن کے ایجاد کیے ہوئے مہلک ترین ہتھیاروں میں ہو سکتی ہے۔ تخریب و ہلاکت نوعِ انسانی کا قانون نہیں ہے۔ انسان کو آزادی کی زندگی بسر کرنے کے لیے اس پر تیار رہنا چاہیے کہ دوسرے کے ہاتھ سے مارا جائے۔ مگر دوسروں کو مار کر اُسے کبھی یہ زندگی میسر نہیں آ سکتی کسی کو قتل کرنا یا گزند پہنچانا خواہ کسی وجہ سے کیوں نہ ہو۔ جرم ہے کسی ایک شخص کے خلاف نہیں بلکہ پورے عالمِ انسانیت کے خلاف (۱)

اہنسا کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہر شعبۂ زندگی میں انصاف ہو۔ ممکن ہے کہ انسانی فطرت سے یہ توقع کرنا بیجا سمجھا جائے۔ مگر میرا یہ خیال نہیں ہے۔ کسی شخص کو اس بارے میں کہ انسان میں بلندی یا پستی کی کتنی صلاحیت ہے۔ من مانی بات نہیں کہنی چاہیئے۔ (۲)

جس طرح انسان کو ہنسا کی ٹریننگ میں مارنے کا فن سیکھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح سے

اہنسا کی ٹریننگ میں مرنے کا فن سیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہنسا کے ذریعہ سے ہمیں خوف سے نجات نہیں ملتی بلکہ یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ خوف کے اسباب کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ بہ خلاف اس کے اہنسا میں خوف کا کوئی سبب ہی، باقی نہیں رہتا۔ اہنسا کے پرستار کو خوف سے نجات پانے کیلئے اپنے اندر اعلےٰ درجہ کی قربانی کی صلاحیت پیدا کرنی پڑتی ہے اُسے اس کی پروا نہیں رہتی کہ اپنی زمین سے، اپنی دولت سے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ جس شخص نے خوف پر پوری طرح قابو نہ پالیا ہو وہ اہنسا پر عمل نہیں کر سکتا۔ اُس کے دل میں تو بس ایک ہی خوف ہوتا ہے، یعنی خدا کا خوف۔ جو شخص خدا کی پناہ میں آنا چاہتا ہے، اُسے ایک جھلک آتما کی جو جسم کے اندر ہے، ضرور دیکھنی چاہیئے۔ اور جہاں اُس نے لافانی آتما کی ایک جھلک دیکھی جسم فانی کی محبت اُس کے دل سے خود بہ خود دور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اہنسا کی ٹریننگ ہنسا کی ٹریننگ کے بالکل برعکس ہے۔ ہنسا کی ضرورت خارجی چیزوں کی حفاظت کے لیے پڑتی ہے۔ اہنسا کی ضرورت انسان کو آتما کی حفاظت کے لیے اپنی عزت نفس کی حفاظت کے لیئے ہے"[3]

اہنسا کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم صرف اُن لوگوں سے محبت کریں جو ہم سے محبت کرتے ہیں۔ اہنسا تو یہ ہے کہ ہم اُن سے بھی محبت کریں جو ہم سے نفرت کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ محبت کے شاندار قانون پر عمل کرنا کس قدر مشکل ہے ....

.... سب سے زیادہ مشکل نفرت کرنے والے سے محبت کرنا ہے۔ مگر خدا کے فضل سے مشکل سے مشکل کام بھی اگر ہم اسے کرنا چاہیں، آسان ہو جاتا ہے۔[4]

میں نے دیکھا ہے کہ ہلاکت کے درمیان زندگی قائم ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ قانون ہلاکت سے برتر کوئی قانون دُنیا میں کارفرما ہے۔ صرف ایسے ہی قانون کے ماتحت ایک منظم سماج کا تصور کیا جا سکتا ہے اور زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکتی ہے۔ اور اگر قانونِ حیات

یہ ہے تو ہمیں اس کو اپنی روزمرہ زندگی میں برتنا چاہیے۔ جب کبھی جھگڑا ہو۔ جب کسی مخالفت
کا سامنا کرنا ہو، اُس پر محبت سے فتح پاؤ۔ یہ موٹا سا طریقہ ہے جو میں نے اس قانون کو اپنی
زندگی میں برتنے کے لیے اختیار کیا ہے۔ یہ تو نہیں کہ میری ساری مشکلیں حل ہوگئی ہوں مگر اتنا
ضرور ہے کہ جتنی کامیابی اِس قانونِ محبت سے ہوئی ہے قانونِ ہلاکت سے کبھی حاصل نہیں
ہو سکی۔

مثلاً یہ بات نہیں کہ مجھے غصہ آتا ہی نہ ہو۔ مگر قریب قریب ہر موقعے پر میں اپنے
جذبات پر قابو رکھنے میں کامیاب ہوتا ہوں۔ نتیجہ جو کچھ بھی ہو میں اپنی طرف سے برابر شعوری
جد و جہد کرتا رہتا ہوں کہ اہنسا کے قانون پر عمل کروں۔ اِس جد و جہد سے انسان کی قوت
بڑھتی ہے۔ جتنا میں اِس قانون کو برتنے کی کوشش کرتا ہوں، اتنا ہی میں اپنی زندگی سے
اور نظامِ کائنات سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ اِس سے مجھے جو سکونِ قلب اور اسرارِ
فطرت میں جو بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ اُسے بیان کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔ (۵)

مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ افراد کی طرح قوموں کی زندگی بھی صلیب کی اذیت، اُٹھا کر
بنتی ہے۔ خوشی دوسروں کو دُکھ پہنچا کر نہیں بلکہ خود اپنی مرضی سے دُکھ اُٹھا کر حاصل ہوتی ہے۔ (۶)

اگر ہم اُس وقت سے لے کر جب تاریخ لکھی جانی شروع ہوئی، آج تک کے زمانے
پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ انسان برابر اہنسا کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہمارے مورث
آدم خور تھے۔ پھر ایک وقت آیا جب وہ آدمی کا گوشت کھانے سے اُکتا گئے۔ اور جانوروں
کے شکار پر بسر کرنے لگے۔ اِس کے بعد وہ منزل آئی جب انسان کو آوارہ گرد شکاری کی
زندگی سے شرم آنے لگی۔ اُس نے کھیتی شروع کر دی اور زیادہ تر اپنی غذا کے لئے دھرتی
ماتا پر بھروسا کرنے لگا۔ اِس طرح خانہ بدوشی چھوڑ کر اُس نے مہذب حضری زندگی اختیار
کی۔ گاؤں اور شہر بسائے۔ اور ایک خاندان کے فرد سے وہ ایک جماعت اور قوم کا رکن
بن گیا۔ یہ سب اُس کی نشانیاں تھیں کہ اہنسا بڑھ رہی ہے اور ہنسا گھٹ رہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا

تو نوعِ انسانی کبھی اب تک معدوم ہو چکی ہوتی۔ اُسی طرح سے جیسے ادنیٰ حیوانات کی بہت سی انواع صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔

پیمبروں اور اوتاروں نے بھی کم و بیش اہنسا کا سبق سکھایا۔ اور کیسے نہ سکھاتے! اہنسا کے لیے سکھانے کی ضرورت نہیں۔ انسان بہ حیثیت حیوان کے تشدد پسند ہے۔ مگر روح کی حیثیت سے تشدد سے بری ہے۔ جیسے ہی اُسے اپنے اندر روح کا شعور ہو۔ وہ تشدد پسند نہیں رہ سکتا۔ یا تو وہ اہنسا کی طرف قدم بڑھائے گا۔ یا فنا ہو جائے گا۔ اسی لیے پیمبروں اور اوتاروں نے سچائی، ہم آہنگی، برادری، انصاف وغیرہ کی تلقین کی ہے۔ اور یہ سب اہنسا کی صفات ہیں۔ (۲)

میرا یہ دعویٰ ہے کہ آج بھی گو سماجی نظام اہنسا سے شعوری حیثیت سے قبول کرنے پر مبنی نہیں ہے۔ ساری دنیا میں بنی نوعِ انسان اِسی لیے زندہ ہیں اور لوگوں کا اپنی املاک پر قبضہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو جینے دیتے ہیں اور اپنی اپنی چیزوں پر قبضہ رکھنے دیتے ہیں ورنہ صرف چند آدمی جو سب سے زیادہ خونخوار ہوتے، بچ رہتے۔ مگر ایسا نہیں ہے، خاندان کے ارکان آپس میں محبت کے رشتے سے وابستہ ہیں اور یہی رشتہ اس سماج میں جو مہذب کہلاتا ہے، قوموں کے اندر مختلف جماعتوں کو ایک دوسرے سے وابستہ رکھتا ہے۔ البتہ انھیں اُس کا شعور نہیں ہے کہ اُن پر اہنسا کے قانون کی حکمرانی ہے۔ اب تک یوں کہنا چاہیے کہ محض ذہنی کاہلی کی وجہ سے ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ کامل اہنسا صرف ان ہی لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے ترکِ املاک کا اور اِسی قسم کی دوسری چیزوں سے ترک کرنے کا عہد کیا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ صرف اہنسا کے یہ پرستار ہی علمی تحقیق سے کام لے کر وقتاً فوقتاً اُس قانونِ ابدی کے جو نوعِ انسان کے لیے بنا ہے نئے نئے امکانات بیان کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر یہ قانون سب ترکے لیے قابلِ عمل ہونا چاہیے۔ جو ناکامیاں ہم دیکھتے ہیں وہ قانون کی نہیں، بلکہ اُس پر عمل کرنے والوں کی ہیں۔ ان میں سے بہتوں کو اس کی خبر تک

نہیں کہ وہ چار ناچار اسی قانون کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب ماں اپنے بچے کے لیے جان دیتی ہے تو بغیر جانے ہوئے اسی قانون پر عمل کرتی ہے۔ میں پچھلے پچاس برس سے یہی تلقین کر رہا ہوں کہ لوگ اس قانون کو شعوری طور پر قبول کر کے اس پر عمل کرنے کی پُرجوش کوشش کریں اور ناکامیوں کی پروا نہ کریں۔ اس پچاس برس کی محنت کے حیرت انگیز نتائج ظاہر ہوئے ہیں اور انہوں نے میرے عقیدے کو اور مضبوط کر دیا ہے۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ مسلسل کوشش سے ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے کہ ہر شخص اپنی خوشی سے دوسروں کی جائز املاک کا احترام کرے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ املاک ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہوگی اور عدم مساوات کا وہ عیاں نمونہ نہیں پیش کرے گی جو آج کل ہمیں اپنے آس پاس ہر طرف نظر آتا ہے۔ اب رہا آخر املاک کا مسئلہ جو خلاف انصاف ناجائز طریقے سے حاصل کی گئی ہو تو اہنسا کے پیرو کو اس سے ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس کے ہاتھ میں ستیہ گرہ اور ترکِ تعاون کا بے تشدد ہتھیار موجود ہے جس کے بارے میں اب تک تجربے سے ثابت ہو گیا ہے کہ اگر اس سے دیانت داری کے ساتھ اور پوری طرح کام لیا جائے تو وہ ہنسا کا نعم البدل ہے۔ میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں اہنسا کو ایک مکمل علم کی حیثیت سے پیش کر رہا ہوں۔ اسے اس طرح پیش کرنا ممکن نہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں میں کسی سائنسدان کو لیڈر یا سنی جیسے علم صحیح کو بھی اس طرح پیش نہیں کر سکتا میں تو محض ایک طالب علم ہوں۔ (۸)

ستیاگرہ کے عملی تجربوں ہی میں مجھے ابتدائی منزلوں ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ حق کی جستجو میں اس کی گنجائش نہیں کہ ہم اپنے مخالف کے ساتھ تشدد برتیں۔ بلکہ صبر اور ہمدردی کے ساتھ اُسے غلطی راستے سے ہٹانا ہے۔ اس لیے کہ جو بات ایک شخص کے نزدیک صحیح ہے وہ دوسرے کو غلط معلوم ہوتی ہے اور صبر سے مراد ہے خود تکلیف اُٹھانا۔ اس طرح اس اصول کا مطلب یہ ہوا کہ حق کی حمایت اپنے مخالف کو دکھ دے کر نہیں بلکہ اپنے اوپر دکھ لے کر کرنی ہے (۹)

حیرت انگیز واقعات کے اِس دور میں کوئی شخص کسی چیز یا خیال کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ یہ نیا ہے اِس لیے مہمل ہے۔ وہ چیزیں جو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھیں روزانہ دیکھنے میں آرہی ہیں جو ناممکن تھیں۔ وہ برابر ممکن بنتی جاتی ہیں، تشدد کے میدان میں آج کل ایسی عجیب و غریب چیزیں دریافت ہو رہی ہیں کہ ہم حیرت میں رہ جاتے ہیں۔ مگر میرا یہ دعویٰ ہے کہ اہنسا کے میدان میں اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب اور بہ ظاہر ناممکن چیزیں دریافت ہوں گی۔ (۱۰)

انسان اور اُس کا فعل دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ کسی نظام کی مزاحمت کرنا یا اُس پر حملہ کرنا بالکل درست ہے۔ لیکن اُس کے بنانے والے کی مزاحمت کرنا یا اس پر حملہ کرنا ایسا ہے۔ جیسے خود اپنی مزاحمت کرنا یا اپنے آپ پر حملہ کرنا۔ اِس لیے کہ ہم ایک ہی نقاش کے بنائے ہوئے ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں اور اِس طرح ہمارے اندر لامحدود ربانی قوتیں ہیں۔ ایک فرد واحد کی توہین در اصل ان ربانی قوتوں کی توہین ہے اور اُس سے نہ صرف اس شخص کو بلکہ ساری دُنیا کو نقصان پہنچتا ہے۔ (۱۱)

اہنسا ایک عالمگیر اصول ہے اور ماحول سے ناساز گار ہونے کا اُس کی عملدرآمد پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ در اصل اس کے کارگر ہونے کا امتحان اسی وقت ہوتا ہے جب وہ مخالفت کے درمیان اور اُس کے باوجود عمل میں آئے۔ ہماری اہنسا محض کھوکھلی اور نکمی ہوتی۔ اگر اُس کی کامیابی کا انحصار حکام کی ہمدردی پر ہوتا۔ (۱۲)

اس قوت کے کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کے لیے یہ شرط ہے کہ ہم اِس بات کو سمجھ لیں کہ روح جسم سے الگ وجود رکھتی ہے اور اُسے بقا حاصل ہے۔ اور ہمارا یہ سمجھنا محض ذہنی ادراک نہیں بلکہ جیتا جاگتا عقیدہ ہے۔ (۱۳)

بعض لوگوں نے مجھ سے کہا کہ ستیہ اور اہنسا کی سیاست میں اور دُنیوی معاملات میں کوئی گنجائش نہیں۔ میں اُن سے متفق نہیں ہوں اگر یہ محض انفرادی نجات کے وسائل ہیں

تو میرے لئے بے کار ہیں تو عمر بھر انہیں روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرنے کا تجربہ کرتا رہا ہوں۔ (۱۴)

اگر کوئی شخص اہنسا پر عامل ہو تو یہ ممکن نہیں کہ سماجی بے انصافی خواہ کہیں بھی ہو، دیکھے اور اس کے مقابلہ کے لیے نہ اٹھ کھڑا ہو۔ (۱۵)

انفعالی مقاومت ایک طریقہ ہے اپنے اوپر دکھ اٹھا کر حقوق حاصل کرنے کا یہ ہتھیار کے ذریعہ مزاحمت کرنے کے برعکس ہے۔ جب میں کسی کام کو جو میرے ضمیر کے خلاف ہو کرنے سے انکار کرتا ہوں تو روح کی قوت سے کام لیتا ہوں۔ مثلاً حکومت وقت نے کوئی قانون پاس کیا ہے جس کا نفاذ مجھ پر ہو سکتا ہے۔ اور میں اسے پسند نہیں کرتا۔ اگر میں تشدد کے ذریعہ حکومت کو اس قانون کے منسوخ کرنے پر مجبور کردوں تو میں جسم کی قوت استعمال کرتا ہوں۔ اگر اس قانون کی تعمیل نہ کروں اور خلاف ورزی کی سزا بھگتوں تو روح کی قوت سے کام لیتا ہوں۔ اس میں اپنے آپ کو قربان کرنے کا سوال ہے۔

اس کو ہر شخص تسلیم کرے گا کہ اپنے کو قربان کرنا دوسرے کو قربان کرنے سے برتر فعل ہے۔ اس کے علاوہ اگر اس طرح روح کی قوت کو کسی ایسے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے جو غیر منصفانہ ہے تو صرف استعمال کرنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے اس کی غلطی کا خمیازہ دوسروں کو نہیں بھگتنا پڑتا۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں کہ لوگوں نے ایسے کام کیے جو آگے چل کر غلط ثابت ہوئے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا۔ وہ قطعی طور پر حق بہ جانب ہے یا کوئی کام محض اس لیے برا ہے کہ وہ اسے برا سمجھتا ہے لیکن اگر اس نے اچھی سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے تو اس کے نقطۂ نظر سے وہ فرد برا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے یہی مناسب ہے کہ جس چیز کو برا سمجھتا ہے، اس کے کرنے سے انکار کردے اور اس کا نتیجہ بھگتے۔ یہ روح کی قوت کے استعمال کا بنیادی

اصول ہے۔ (۱۶)

اہنسا کا پرستار زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ فلاح کے افادی ضابطے کو قبول نہیں کر سکتا۔ وہ تو سب لوگوں کی زیادہ سے زیادہ فلاح کی کوشش کرےگا اور اس نصب العین کو حاصل کرنے کیلئے جان کی بازی لگا دے گا۔ چنانچہ وہ اس کے لیے تیار ہوگا کہ خود مر جائے تاکہ دوسرے جیتے رہیں۔ اپنی جان دے کر وہ دوسروں کی خدمت کے ساتھ ساتھ اپنی بھی خدمت کرے گا۔ سب لوگوں کی زیادہ سے زیادہ فلاح میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی فلاح شامل ہے، اس لیے وہ اور افادی نظریے کا پیرو اپنی عملی زندگی میں اکثر موقعوں پر متفق ہوں گے لیکن ایک وقت آتا ہے جب ان دونوں کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں بلکہ ایک دوسرے کے مخالف سمتیں اختیار کر لیتی ہیں۔ افادیت پسند اگر اپنے نظریے کے منطقی نتیجے پر عمل کرے گا تو کبھی اپنے آپ کو قربان نہیں کرے گا۔ سب کی فلاح چاہنے والا اپنے آپ کو قربان کرنے میں کبھی تامل نہیں کرے گا۔ (۱۷)

بے شک آپ کہہ سکتے ہیں کہ انقلاب بے تشدد کبھی نہیں ہوگا اور ہمارے علم میں تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ خیر میرا یہ حوصلہ ہے کہ میں اس کی مثال پیش کردوں اور میرا ملک اپنی آزادی، عدم تشدد کے ذریعہ حاصل کرے اور دنیا کے سامنے برابر یہ اعلان کرتا رہوں گا کہ میں عدم تشدد کو چھوڑنے کی قیمت پر اپنے ملک کی آزادی خریدنے کو تیار نہیں ہوں۔ عدم تشدد سے میری وابستگی اس قدر قطعی اور لازمی ہے کہ مجھے خودکشی کرنا گوارا ہے۔ مگر اپنے موقف سے ہٹنا گوارا نہیں کیا میں نے یہاں حق کا ذکر نہیں کیا۔ اس لیے کہ اہنسا خود ہی حق کا واحد مظہر ہے۔ (۱۸)

پچھلے تیس سال کے جن میں سے پہلے آٹھ سال جنوبی افریقہ میں گزرے، مجموعی تجربے سے میرے دل میں بڑی امید پیدا ہو گئی ہے کہ اہنسا کو اختیار کرنے میں

نبٹ سکتے ہیں جو اُن پر کئے جا رہے ہیں۔ مجھے نوجوانی کے زمانہ سے یقین ہے کہ اہنسا کوئی عمل خانقاہی نہیں جو فرد کو اپنے سکون قلب اور نجات اُخروی کے لیے کرتا ہے، بلکہ ایک دستور العمل ہے پوری سماج کیلئے اگر وہ انسانی وقار کے ساتھ زندگی بسر کرنا اور امن کی طرف، جس کی اُسے مدتوں سے آرزو ہے۔ قدم بڑھانا چاہتی ہے۔ (۱۹)

سنہ ۱۹۰۲ء میں میں محض عقل سے خطاب کرنے پر بھروسا کرتا تھا۔ میں بڑی محنت سے اصلاحی کام کرتا تھا اور (عرضیاں، یادداشتیں وغیرہ) لکھنے میں مہارت رکھتا تھا۔ اس لیے کہ مجھے واقعات کی سوجھ بوجھ تھی اور اس کا یہ نتیجہ تھا کہ میں ذرا ذرا سی جزئیات میں بھی سچائی کا پورا لحاظ رکھتا تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ جب جنوبی افریقہ میں بحران کا وقت آیا تو عقلی استدلال نے کچھ اثر نہیں کیا۔ میرے ہم قوم بڑے جوش میں تھے (کمزور سے کمزور بھی تنگ آمد بجنگ آمد کا مصداق بن جاتا ہے) اور بدلہ لینے کا چرچا تھا۔ اب مجھے دو راہوں میں سے ایک اختیار کرنی تھی۔ یا تو تشدد کا ساتھ دیتا یا اس بحران سے نبٹنے اور بگڑتے ہوئے حالات کو سنبھالنے کا کوئی طریقہ سوچتا۔ اس وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ہم اُس قانون کی جو ہمارے لئے ذلت کا باعث تھا، تعمیل سے انکار کر دیں۔ چاہے حکومت ہمیں جیل میں ڈال دے، اس طرح جنگ کا اخلاقی بدل وجود میں آیا۔ میں ان دنوں برطانوی سلطنت کا وفادار تھا۔ اس لئے کہ میں سمجھتا تھا کہ اس سلطنت کی کارروائیاں مجموعی طور پر ہندوستان کے اور دنیا کے لیے مفید ہیں۔ چنانچہ جنگ چھڑنے کے تھوڑے ہی دن بعد جب میں انگلستان پہنچا تو جنگ سے متعلق سرگرمیوں میں شریک ہوگیا۔ اور مجھے ذات الجنب میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ہندوستان جانا پڑا تو میں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر رنگروٹ بھرتی کرنے کی مہم شروع کر دی جس سے میرے بعض دوستوں کو سخت دھچکا لگا۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں جب منحوس رولٹ ایکٹ پاس ہوا اور حکومت

جس نے ہندوستانیوں کو شہریت کے بعض بنیادی حقوق سے محروم کردیا۔

نے ان مظالم کی (جو اِس سلسلہ میں عوام پر کیے گئے تھے اور) جن کا ثبوت موجود تھا معمولی تلافی کرنے سے انکار کر دیا تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ اور ۱۹۲۰ء میں میں نے بغاوت پر کمر باندھ لی۔ اُس کے بعد سے مجھے رفتہ رفتہ یقین ہوتا جاتا ہے کہ وہ چیزیں جو لوگوں کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہیں محض عقل کے ذریعہ حاصل نہیں ہو سکتیں بلکہ انسان کو ان کی قیمت اپنے اوپر دُکھ اُٹھا کر چکانی پڑتی ہے۔ دُکھ اُٹھانا نوعِ انسانی کا قانون ہے جنگ و جدل جنگل کا قانون ہے۔ مگر اپنے اوپر دُکھ اُٹھانے میں جنگل کے قانون سے کہیں زیادہ اتنی طاقت ہے کہ ہم مخالف کو اپنا ہم خیال بنا لیں اور اُس کے کان کھول دیں تا کہ وہ عقل کی آواز کو جواب تک نہیں سنتا تھا سن سکے۔ شاید ہی کسی شخص نے اتنی عرضیاں لکھی ہوں اور بیکسوں، مظلوموں کے معاملات کی اتنی پیروی کی ہو، جتنی پیروی میں نے کی ہے۔ اور میں اس اہم نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر آپ سچ مچ کوئی بڑا کام کرانا چاہتے ہیں تو لوگوں کو صرف عقلی طور پر قائل کرنا کافی نہیں اُن کے دل پر بھی اثر ڈالنا چاہیے۔ عقلی استدلال کا خطاب زیادہ تر دماغ سے ہوتا ہے دل میں راہ پانے کے لئے دُکھ اُٹھانا پڑتا ہے۔ اِس سے انسان کے باطنی ادراک کی کھڑکیاں کھل جاتی ہیں۔ نوعِ انسانی کا امتیازی نشان دُکھ اُٹھانا ہے۔ تلوار اُٹھانا نہیں۔ (۲۰)

اہنسا وہ طاقت ہے جس کو سبھی یکساں استعمال کر سکتے ہیں — چاہے بچے ہوں یا نوجوان لڑکے لڑکیاں یا بڑی عمر کے لوگ۔ بشرطیکہ وہ خدا پر جو مہر و محبت کا خدا ہے جیتا جاگتا عقیدہ رکھتے ہوں اور اُس کی وجہ سے ساری نوعِ انسانی سے یکساں محبت کرتے ہوں۔ جب اہنسا کو قانونِ زندگی کی حیثیت سے قبول کر لیا جائے تو اُسے صرف متفرق افعال میں برتنا کافی نہیں بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ وہ ساری زندگی پر چھا جائے۔ (۲۱)

اگر ہمیں اہنسا کو اختیار کرنا ہے تو دُنیا میں کسی ایسی چیز کی خواہش نہیں کرنی چاہیے

جو ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کو حاصل نہ ہو۔ (۲۲)

اہنسا کے اصول کا یہ تقاضا ہے کہ ہر قسم کے استحصال سے باز رہیں (۲۳)
میں جنگ کی مزاحمت کرتا ہوں مگر اس حد تک نہیں کہ جو لوگ اس میں حصہ لینا
چاہتے ہیں، اُن کے راستے میں رکاوٹ ڈالوں۔ میں اُنھیں سمجھاتا بجھاتا ہوں، ایسا طریقہ
بتاتا ہوں جو جنگ سے بہتر ہے اور پھر اُن پر چھوڑ دیتا ہوں کہ دونوں میں سے جسے چاہیں
اختیار کریں۔ (۲۴)

میں اپنے نقادوں سے یہ کہوں گا کہ وہ میرے ساتھ آئیں اور نہ صرف ہندوستان
کے لوگوں کی، بلکہ ساری دُنیا کے لوگوں کی، خواہ وہ جنگ میں شریک ہوں یا نہ ہوں، تکلیفوں
اور مصیبتوں کو دیکھیں، مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اس قتل و خونریزی کا چپ چاپ تماشا دیکھتا
رہوں۔ میرا اٹل عقیدہ ہے کہ اس طرح ایک دوسرے کا گلا کاٹنا انسان کی شان وقار
سے فروتر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کو روکنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور ہے۔ (۲۵)
کامل اہنسا اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہمارا وجود جسمانی باقی ہے۔
اس لیے کہ ہمیں اور کچھ نہیں تو کم از کم تھوڑی سی فضائے مکانی چاہیئے جسے ہمارا جسم پُر
کر سکے۔ جب تک ہم قید جسم میں ہیں۔ کامل اہنسا، اقلیدس کے نقطے یا خطِ مستقیم کی طرح
محض ایک نظری تصور ہے مگر ہمیں اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں اُسے حاصل کرنے کی سعی کرنی
ہے۔ (۲۶)

بعض صورتوں میں کسی جاندار کی جان لینا ایک طرح کا فرض ہے۔ چنانچہ غذا حاصل کرنے
کے لیے ہم نباتات اور حیوانات کی جان لیتے ہیں۔ حفظانِ صحت کے خیال سے جراثیم کش
دواؤں سے یا کسی اور طریقے سے مچھر وغیرہ مارتے ہیں۔ اور اُسے مذہبی احکام کی خلاف
ورزی نہیں سمجھتے .... اپنے بنی نوع کے فائدے کے لیے ہم گوشت خور جانوروں
کو ہلاک کرتے ہیں .... بعض صورتوں میں انسان تک کو قتل کرنا ضروری

ہوجاتا ہے۔ فرض کیجیے ایک شخص کے سر پر خون سوار ہو جاتا ہے، وہ جوشِ غضب میں تلوار ہاتھ میں لیے گھومتا ہے۔ اور جو سامنے آجائے اُسے مار ڈالتا ہے۔ اور کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ اُسے زندہ گرفتار کرلے۔ اب جو شخص اِس مجنون کا خاتمہ کر دے گا۔ وہ سماج کے شکریے کا مستحق ہوگا۔ اور محسن سمجھا جائے گا۔(۲۷)

میں دیکھتا ہوں کہ چاہے کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں لوگوں کو جانداروں کے مارنے سے جبلی طور پر کراہت ہوتی ہے۔ چنانچہ باؤلے کتوں کو فوراً مار ڈالنے کے بجائے یہ تجویز کی گئی ہے کہ اُنہیں خاص جگہ بند کر دیا جائے۔ جہاں وہ دھیرے دھیرے دم توڑ دیں۔ مگر میرے ذہن میں ہمدردی کا جو تصور ہے اُس کی بنا پر مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ کہ کتا اور کتے ہی پر کیا موقوف ہے، کوئی جاندار کبھی بے بسی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرے۔ انسان ایسی حالت میں ہو تو میں اُسے نہیں ماردوں گا۔ کیونکہ اُس کے لیے کوئی بہتر تدبیر ممکن ہے۔ مگر کتے کو اس حالت میں مار ڈالوں گا۔ کیونکہ اسکے لئے میرے پاس کوئی علاج نہیں۔ اگر میرا بچہ کتے کے کاٹنے سے پاگل ہوجائے اور اُس کی شدید تکلیف کو دور کرنے کی کوئی صورت نہ ہو تو میں اُس کی جان لینا اپنا فرض سمجھوں گا۔ تقدیر کی کچھ حدود ہیں۔ معاملات کو تقدیر پہ اُس وقت چھوڑا جاسکتا ہے، جب ساری تدبیریں ختم ہو جائیں۔ جو بچہ سخت کرب میں مبتلا ہے، اُس کی تکلیف کو دور کرنے کی ایک تدبیر اور آخری تدبیر یہ ہے کہ اُس کی جان لے لی جائے۔(۲۸)

اہنسا اپنی مثبت شکل میں انتہائی محبت، انتہائی ہمدردی ہے۔ اگر میں اہنسا کا پیرو ہوں تو مجھ پر لازم ہے کہ اپنے دشمن سے محبت کروں۔ مجھے اِس خطاکار کے ساتھ جو میرا دشمن ہے یا میرے لئے اجنبی ہے وہی قاعدہ برتنا چاہیئے جو اپنے خطاکار باپ یا بیٹے کے ساتھ۔ عملی اہنسا میں سچائی اور بے خوفی بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ جس طرح انسان اپنے پیاروں کو کبھی دھوکا نہیں دیتا، اسی طرح ان سے ڈرتا یا اُن کو دھمکاتا بھی نہیں۔ جان بخش دینا

سب سے بڑا تحفہ ہے۔ ایک شخص سچ مچ دشمن کی جان بخش دے تو ساری دشمنی دور ہوجاتی ہے اور مصالحت کیلئے راستہ ہموار ہوجاتا ہے مگر کوئی شخص جو خود ہی ڈرتا ہو یہ تحفہ کبھی نہیں دے سکتا۔ اس لیے اسے خود بے خوف ہونا چاہیئے۔ اہنسا اور بزدلی یہ دونوں چیزیں ایک ہی شخص میں جمع نہیں ہوسکتیں۔ اہنسا کے لئے انتہائی بہادری درکار ہے۔(۲۹)

جب میں تلوار کو ہاتھ سے پھینک چکا تو اب میرے پاس اپنے مخالفوں کے لئے محبت کا پیالہ رہ گیا ہے جسے مجھے اُمید ہے کہ اس کی کشش کھینچ کر انھیں میرے قریب لے آئے گی۔ میں ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان دائمی دشمنی کا تصور ہی نہیں کرسکتا۔ میں تو آواگون کا قائل ہوں اور اس اُمید پر جیتا ہوں کہ کسی اگلے جنم میں سبھی انسانوں کو آغوشِ محبت میں لے کر گلے لگا سکوں گا۔(۳۰)

محبت دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے مگر اسی کے ساتھ اس میں اتنا عجز و نیاز ہوتا ہے کہ اُس سے بڑھ کر تصور میں نہیں آسکتا۔(۳۱)

وہ دکھ جس میں غصہ اور کپٹ نہ ہو ایک چڑھتا سورج ہے جس سے انتہائی سنگدلی اور جہالت کا کہر بھی چھینٹ جاتا ہے۔(۳۲)

اہنسا کے معنی "بدی کے خلاف کسی قسم کی حقیقی لڑائی سے ہاتھ اٹھا لینا" نہیں ہیں۔ اس کے برعکس میرا اہنسا کا تصور تو ایسی لڑائی لڑتا ہے جو انتقام سے زیادہ حقیقی اور موثر ہے انتقام کی تو فطرت ہی یہ ہے کہ بدی کو اور بڑھائے۔ میں اخلاقی برائیوں کے خلاف ذہنی اور اخلاقی جنگ کی فکر میں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مخالف کی تلوار کو کند کردوں۔ اس طرح سے نہیں کہ میں اور بھی تیز ہتھیار سے کام لوں۔ بلکہ اس طرح کہ اس کی یہ توقع کہ میں جسمانی قوت سے مزاحمت کروں گا مایوسی سے بدل جائے۔ روحانی مزاحمت جو میری طرف سے ہوگی اُسکی گرفت ہی میں نہ آئے گی، پہلے تو وہ اسے چکر میں ڈال دے گی۔ اور پھر ایک دن اُس سے اپنی قوت کا اعتراف کرالے گی۔ ایسا اعتراف جس سے اُس کو ذلت نفس کا نہیں علوئے نفس

کا احساس ہوگا۔ شاید کوئی یہ کہے کہ یہ تو ایک مثالی حالت کا تصوّر ہے، بے شک یہی بات ہے۔ (۴۳)

اہنسا ایک جامع اصول ہے۔ ہم بے بس خاکی انسان ہنسا کی آگ کی لپیٹ میں گھرے ہوئے ہیں۔ یہ کہاوت کہ زندگی، زندگی کو کھا کر جیتی ہے۔ بڑی گہری حقیقت رکھتی ہے۔ انسان ایک لمحہ بھی اس سے بغیر جی نہیں سکتا کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہنسا کا مرتکب ہو۔ اس کا جینا ــــ کھانا پینا ــــ چلنا پھرنا ــــ بجائے خود ہنسا یا اتلافِ جان سے، چاہے وہ کتنا ہی خفیف کیوں نہ ہو، وابستہ ہے۔ اس لئے اہنسا کا پرستار اپنے عقیدے کا پابند صرف اسی حد تک ہو سکتا ہے کہ اس کے ہر فعل کا محرک ہمدردی کا جذبہ ہو، وہ اپنے امکان بھر ننھے سے ننھے جاندار کو ہلاک نہ کرے بلکہ اس کی جان بچانے کی کوشش کرے۔ اور اس طرح ہنسا کے زبردست پنجے سے چھوٹنے کی مسلسل جد و جہد کرتا رہے، اس کے ضبطِ نفس اور ہمدردی کے جذبے میں برابر ترقی ہوتی رہے گی۔ وہ خارجی ہنسا سے پوری طرح کبھی پاک نہیں ہو سکتا۔

چونکہ اس کے علاوہ اہنسا کی تہہ میں زندگی کی وحدت ہے اس لیے ایک شخص کی خطا کا اثر سب انسانوں پر پڑنا ناگزیر ہے، جب تک وہ سماجی مخلوق ہے اس ہنسا میں شریک ہونے سے نہیں بچ سکتا۔ جو خود زندگی کا لازمی جزو ہے۔ جب دو قوموں میں جنگ ہو تو اہنسا کے پرستار کا فرض ہے کہ جنگ کو روکے۔ جو شخص اس فرض کے ادا کرنے سے قاصر ہے، جنگ کو روکنے کی قوت یا اہلیت نہیں رکھتا وہ یہ کر سکتا ہے کہ لڑائی میں حصہ لے اور اس کے باوجود یہ کوشش کرتا رہے کہ اپنی قوم کو اور ساری دنیا کو جنگ کی لعنت سے پاک کر دے۔ (۴۴)

ہنسا کے نقطۂ نظر سے میں ان لوگوں میں جو لڑائی میں شریک ہیں۔ یہ فرق نہیں کرتا کہ کون لڑنے والے اور کون نہ لڑنے والے ہیں جو شخص اپنے آپ کو ڈاکوؤں کی

خدمت کے لیے پیش کرے، چاہے وہ ان کا سامان لاتا لے جاتا ہو، یا جب وہ اپنے کام میں مصروف ہوں، پہرہ دیتا ہو۔ یا جب وہ زخمی ہوں اُن کی دیکھ بھال کرتا ہو، وہ اِسی حد تک ڈکیتی کا مجرم ہے جس حد تک خود وہ ڈاکو ہیں، اِسی طرح وہ لوگ بھی جو جنگ میں صرف زخمیوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ جنگ کے جرم سے بری نہیں قرار دئے جا سکتے۔ (۳۵)

یہ سوال نازک ہے۔ اِس میں اختلاف رائے کی بہت گنجائش ہے۔ اِس لئے میں نے اُن لوگوں کے سامنے جو اہنسا کے قائل ہیں اور سنجیدگی سے ہر شعبۂ زندگی میں اُس پر عمل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اپنے دلائل جس قدر وضاحت سے ممکن تھا پیش کر دئے ہیں۔ حق کا پرستار کوئی کام محض رسم و رواج کی خاطر نہیں کر سکتا۔ اُسے ہمیشہ اپنی خامیوں کی اصلاح کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اور جب اُسے اپنی کسی غلطی کا علم ہو تو ہر قیمت پر اپنی غلطی کا اعتراف اور اُس کی تلافی کرنی چاہیے۔

اہنسا ایک موثر قوت اُسی وقت ہو سکتی ہے۔ جب اُس کا آغاز نفس کے اندر ہو۔ محض جسمانی اہنسا جس کے ساتھ نفس کا تعاون نہ ہو، کمزوروں اور بزدلوں کی اہنسا ہے اِس لیے کہ اُس میں کوئی قوت اور تاثیر نہیں ہوتی۔ اگر ہمارے دل میں بغض و نفرت ہو اور ظاہر یہ کریں کہ بدلہ لینا نہیں چاہتے تو یہ آگ ہماری طرف پلٹ کر ہمیں جلانا شروع کر دے گی اور ایک دن بھسم کر ڈالے گی۔ جسمانی تشدد سے باز رہنے سے جو نقصان پہنچ سکتا ہے، اُس سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اگر ہم اپنے دل میں سچ مچ محبت نہ پیدا کر سکیں تو کم سے کم نفرت تو نہ رکھیں۔ (۳۷)

وہ شخص اہنسا کا ہرگز پیرو نہیں جسے اُس میں ذرا بھی تامل نہ ہو کہ کسی شخص کو کاروبار میں دھوکہ دے کر دھیرے دھیرے مار ڈالے یا ہتھیار کی قوت سے گائے کو بچا لے اور قصائی کا کام تمام کر دے یا اپنے ملک کے مفروضہ فائدے کے لیے چند سرکاری افسروں کو ٹھکانے لگا دے، اِن سب افعال کے محرک نفرت، بزدلی اور خوف کے جذبات

ہیں۔(۳۸)

مجھے تشدد پر یہ اعتراض ہے کہ جب وہ بظاہر مفید معلوم ہوتا ہے تو یہ فائدہ محض عارضی ہوتا ہے لیکن جو نقصان اس سے پہنچتا ہے وہ دائمی ہوتا ہے۔ میں اسے نہیں مانتا کہ ہم ایک ایک انگریز کو چن چن کر مار ڈالیں تو اس سے ہندوستان کو خفیف سا بھی فائدہ نہ پہنچے گا۔ اگر کوئی شخص ایسی تدبیر کرے کہ کل سب انگریز مار ڈالے جائیں تو ملک کے کروڑوں آدمیوں کی حالت ویسی ہی ابتر رہے گی جیسی آج ہے۔ موجودہ حالات کی ذمہ داری انگریزوں سے زیادہ خود ہم پر ہے۔ اگر ہم اپنی طرف سے بھلائی کریں تو انگریزوں میں برائی کرنے کی طاقت ہی نہ رہے گی۔(۳۹)

تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جن لوگوں نے یقیناً نیک نیتی کے ساتھ حریفوں کو تشدد کے ذریعہ شکست دے کر ہٹایا ان میں خود ہی وہ بیماری پیدا ہو گئی جو ان مفتوحوں میں تھی۔(۴۰)

بدیشی حاکموں کے خلاف تشدد کے استعمال سے خود اپنے ہم قوموں پر جنھیں ہم ملک کی ترقی میں حائل سمجھتے ہیں تشدد کرنے میں صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے، جو آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔ اگر ہم اس سے قطع نظر کر لیں کہ دوسرے ملکوں میں تشدد آمیز کارروائی سے کیا نتیجہ نکلا اور اہنسا کے فلسفے کو بھی نظر انداز کر دیں تب بھی اس کا اندازہ کرنے کے لیے کچھ زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں کہ اگر ہم بہت سی خرابیوں کو جو ہماری آزادی کی راہ میں رکاوٹ ڈالتی ہیں دور کرنے کے لئے تشدد سے کام لیں تو ہماری مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا اور آزادی حاصل کرنے میں دیر لگے گی، جو لوگ سیاسی اصلاحات کے لیے تیار نہیں ہیں اس لیے کہ انھیں وہ غیر ضروری سمجھتے ہیں، ہمارے جبر و تشدد کی وجہ سے غصہ کے مارے آپے سے باہر ہو جائیں گے اور ہم سے بدلہ لینے کے لیے بدیسیوں سے مدد مانگیں گے۔ کیا پچھلے زمانے میں اس قسم کے واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں گزرے جن کی تکلیف دہ یاد ابھی تک ہمارے دل میں تازہ ہے؟(۴۱)

میں نہ حکومت کے منظم تشدد سے کوئی تعلق رکھوں گا، نہ عوام کے غیر منظم تشدد سے۔ اس سے تو میں بہتر سمجھوں گا کہ چکی کے ان دو پاٹوں کے بیچ میں پس کر رہ جاؤں۔(۴۲)

پچاس برس سے زیادہ عرصے سے میں مسلسل سائنٹفک صحت اور باریکی کے ساتھ اہنسا پر عمل کر رہا ہوں۔ میں نے اس سے ہر شعبۂ زندگی میں خواہ وہ خانگی ہو یا اجتماعی سیاسی ہو یا معاشی، کام لیا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ کسی ایک بار بھی یہ تجربہ ناکام رہا ہو۔ اگر کبھی بظاہر ناکامی بھی ہوئی تو اس کا ذمہ دار میں نے اپنی خامیوں کو ٹھہرایا۔ مجھے اس کا دعویٰ نہیں کہ میں کامل ہوں۔ البتہ یہ دعویٰ ضرور ہے کہ میں خلوص اور جوش کے ساتھ حق کی، جو خدا کا دوسرا نام ہے جستجو میں لگا ہوا ہوں، اس جستجو کے دوران میں مجھ پر اہنسا کا انکشاف ہوا۔ اس کا پھیلانا میری زندگی کا مشن ہے۔ مجھے زندہ رہنے میں اس کے سوا کوئی دلچسپی نہیں کہ اپنے مشن کو پورا کر دوں۔(۴۳)

میرے لیے یہ دائمی اطمینان کا باعث ہے کہ اُن لوگوں کو جن کی پالیسیوں کی میں مخالفت کرتا ہوں۔ اب بھی مجھ سے محبت اور مجھ پر بھروسا ہے۔ جنوبی افریقہ کے لوگوں نے ذاتی طور پر مجھ پر بھروسا اور میرے ساتھ دوستانہ سلوک کیا۔ برطانوی پالیسی اور نظام کو بُرا کہنے کے باوجود مجھے ہزاروں انگریز مردوں اور عورتوں کی محبت حاصل ہے۔ جدید مادی تہذیب کو ایک سرے سے مردود قرار دینے کے باوجود یورپ اور امریکہ میں میرے دوستوں کا حلقہ برابر بڑھ رہا ہے۔ یہ بھی اہنسا کی فتح ہے۔(۴۴)

میرا تجربہ جسے روز بروز تقویت اور توسیع ہو رہی ہے، یہ ہے کہ افراد اور قوموں کو امن نصیب ہونے کی کوئی اور صورت بجز اس کے نہیں کہ وہ ستیہ اور اہنسا پر زیادہ سے زیادہ عمل جتنا ایک انسان کے لیے ممکن ہے کریں۔ انتقام کی پالیسی کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔(۴۵)

مجھے اہنسا سے جو محبت ہے، وہ ہر شے سے خواہ وہ ارضی ہو یا ماورائی برتر ہے اس کی برابری اگر کوئی چیز کر سکتی ہے تو وہ محبت ہے جو مجھے حق سے ہے۔ جس کو میں اہنسا کا مترادف

سمجھتا ہوں۔ میرے زندگی کے نقشے میں جہاں ہندوستان کے مختلف مذاہب کے لوگوں میں کسی نشتم کا امتیاز نہیں، وہاں مختلف نسلوں میں کبھی کوئی بھید بھاؤ نہیں۔ میرے نزدیک انسان بہرحال انسان ہے۔" (۴۶)

میں محض ایک کمزور طالب ہوں۔ بار بار ناکام ہوتا ہوں اور پھر نئے سرے سے کوشش شروع کر دیتا ہوں۔ ناکامیوں سے میں اور چوکس ہو جاتا ہوں۔ اور میرا عقیدہ اور گہرا ہو جاتا ہے۔ میں اپنے عقیدے کی آنکھ سے دیکھ سکتا ہوں کہ اہنسا میں بڑے بڑے امکانات ہیں جن کا ابھی تک محض ادھورا تصور رہا ہے۔ (۴۷)

میں اس قدر اُمید پرور ہوں کہ کوئی چیز مجھے مایوس کر ہی نہیں سکتی۔ میری رجائیت اس پر مبنی ہے کہ میرے خیال میں انسان کے اندر اہنسا کو ترقی دینے کے نامحدود امکانات ہیں۔ جتنا زیادہ کوئی شخص اسے اپنی ذات میں فروغ دے، اتنا ہی وہ دوسروں میں پھیلے گا یہاں تک کہ اُس کے ماحول پر اور رفتہ رفتہ ساری دُنیا پر چھا جائے۔ (۴۸)

میرے نزدیک اہنسا کسی طرح بھی انفعالیت نہیں ہے۔ وہ اہنسا جس کا میں تصور کرتا ہوں دُنیا میں سب سے زیادہ فعّال قوت ہے...... اہنسا ایک عالمگیر قانون ہے۔ میرے نصف صدی کے تجربے میں کوئی ایسا موقع نہیں آیا جب مجھے یہ کہنا پڑا ہو کہ میں بےبس ہوں۔ اور میری مشکل کا کوئی حل نہیں نکل سکتا۔ (۴۹)

اہنسا کی اصل کسوٹی یہ ہے کہ اہنسا کی لڑائی کے بعد دل میں کینہ باقی نہیں رہتا اور دشمن دوست بن جاتے ہیں۔ یہ تجربہ مجھے جنوبی افریقہ میں جنرل اسمٹس کے معاملے میں ہوا وہ شروع میں میرے سخت مخالف اور کڑے نقاد تھے اور آج وہ میرے گہرے دوست ہیں۔ (۵۰)

اپنی حفاظت کیلئے دوسروں کو مارنے کی طاقت ضروری نہیں۔ آدمی میں یہ طاقت ہونی چاہیئے کہ خود جان دیدے۔ جب انسان مرنے پر پوری طرح تیار ہو تو

اُسے تشدد کا خیال کبھی نہ آئے گا۔ دراصل میں ایک بدیہی قضیئے کے طور پر کہہ سکتا ہوں کہ مارنے کی خواہش اور خود جان دیدینے کی خواہش میں تناسبِ معکوس ہوتا ہے۔ تاریخ ایسے لوگوں کی مثالوں سے بھری پڑی ہے جنہوں نے اِس طرح جان دے کر کہ اُنکے لب پر آخر تک ہمت اور ہمدردی کے کلمے رہے۔ اپنے شدید مخالفوں کے دلوں کو جیت لیا۔ (۵۱)

میں محض ایک ادنیٰ سا آدمی ہوں، جو اہنسا کے علم کی کھوج میں ہے، اُس کی چھپی ہوئی گہرائیاں دیکھ کر کبھی کبھی میں بھی اُن لوگوں کی طرح جو میرے ساتھ کام کرتے ہیں۔ چکرا جاتا ہوں۔ (۵۲)

آجکل یہ کہنے کا فیشن ہو گیا ہے کہ سماج کی تنظیم اہنسا کی بنا پر نہیں ہو سکتی۔ مجھے اِس سے اختلاف ہے خاندان میں جب باپ اپنے بیٹے کو تھپڑ مارتا ہے تو بچے کے دل میں بدلہ لینے کا خیال نہیں آتا۔ اب جو وہ اپنے باپ کی حکم کی تعمیل کرتا ہے تو اِس لیے نہیں کہ اس تھپڑ کا اثر اُسے عدولِ حکمی سے باز رکھتا ہے بلکہ اِس وجہ سے کہ اس کے پیچھے اُسے چوٹ کھائی ہوئی محبت کی گرمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ میرے خیال میں نچوڑ ہے اُس دستور العمل کا جس کے مطابق سماج کا کام چلتا ہے یا چلنا چاہیئے۔ جو بات خاندان پر صادق آتی ہے، وہی سماج پر صادق آنی چاہیئے۔ جو دراصل ایک بڑا سا خاندان ہے۔

میری خواہش تو یہ ہے کہ زندگی کی خاطر ایک سانپ تک کو قربان نہ کروں۔ اِس کو مارنے کے بجائے یہ کرنے دوں کہ مجھے کاٹے اور مار ڈالے۔ اگر خدا نے مجھے اِس آزمائش میں ڈالا۔ اور سانپ نے مجھ پر چوٹ کی نوبت ممکن ہے مجھے مرنے کی ہمت نہ ہو۔ وہ بہیمیت جو میرے اندر ہے مجھ پر غالب آجائے اور میں اِس جسمِ فانی کو بچانے کے لیے سانپ کو مار ڈالوں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرا عقیدہ ابھی اتنا راسخ نہیں ہوا کہ میں وثوق سے کہہ سکوں کہ میں سانپوں سے بالکل نہیں ڈرتا۔ اور میں اُن سے وہ دوستانہ

سلوک جس کی مجھے خواہش ہے کر سکتا ہوں۔ (۵۲)

میں سائنس کی ترقی کو بجائے خود بُرا نہیں سمجھتا اور اس کا مخالف نہیں ہوں بلکہ مغرب کے سائنٹفک اندازِ فکر کا معترف ہوں۔ لیکن اگر میری تعریف و تحسین غیر مشروط نہیں تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی سائنسداں خدا کی ادنیٰ مخلوق کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ مجھے چیر پھاڑ سے قلبی نفرت ہے، بے چارے بے قصور جانداروں کو سائنس اور انسانیت کے نام پر ہلاک کرنا مجھے زہر لگتا ہے۔ اور میرے نزدیک ناقابل معافی جرم ہے۔ اِن تمام سائنٹفک انکشافات کی جو بے گناہوں کے خون سے آلودہ ہیں۔ میری نظر میں کوئی وقعت نہیں۔ اگر دورانِ خون کا نظریہ بغیر چیر پھاڑ کے دریافت نہیں کیا جا سکتا تھا تو بہتر تھا کہ نوعِ انسانی اس کے بغیر ہی کام چلاتی۔ مجھے وہ دن صاف دکھائی دے رہا ہے جب مغرب کا دیانت دار سائنسداں خود علمی تحقیقات کے موجودہ طریقوں پر پابندیاں لگائے گا۔ (۵۵)

اہنسا کا سمجھنا آسان نہیں اور اُس پر عمل کرنا تو ہم جیسے کمزوروں کے لیے بہت ہی دشوار ہے۔ ہمیں چاہیے کہ عجز و نیاز سے کام لیں۔ خدا سے برابر دعا کرتے رہیں کہ ہماری چشم بصیرت کھول دے اور جو نورِ ہدایت ہمیں روز نصیب ہو اس کے مطابق عمل کریں۔ اِس لیے ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو امن سے محبت کرتا ہے اور اُسے فروغ دینا چاہتا ہے۔ آج کل میرا یہ کام ہے کہ حصولِ آزادی کی مہم میں اہنسا پر مضبوطی سے قائم رہوں اور اگر ہندوستان اپنی کھوئی ہوئی آزادی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو یہ امنِ عالم کی سب سے بڑی خدمت ہو گی۔ (۵۶)

انفعالی مقاومت ایک ایسی تلوار ہے جو ہر حال میں استعمال ہو سکتی ہے۔ اِس میں یہ کمال ہے کہ جو چلائے اُس کا بھی بھلا۔ اور جس پر چلائے اُس کا بھی بھلا۔ بغیر ایک قطرہ خون بہائے، یہ بہت کچھ کر دکھاتی ہے۔ نہ اِس میں کبھی زنگ لگتا ہے۔ اور نہ چرائی

جا سکتی ہے۔ (۵۷)

نافرمانی سول اُس وقت کہلاتی ہے۔ جب خلوص، ادب اور ضبط و اعتدال کے ساتھ کی جائے۔ اس میں ہیکڑای ہرگز نہ ہو، اس کی بنا کسی اصول پر ہو محض طبیعت کی لہر پر نہ ہو۔ اور سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ اس کے پیچھے عداوت یا نفرت نہ ہو۔ (۵۸)

حضرت مسیح، حضرت دانیال، اور سقراط الفعالی مقاومت یا روح کی قوت کی خالص ترین شکل کے نمائندے تھے۔ یہ سب رہنما اپنی روحوں کے مقابلے میں اپنے جسموں کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتے تھے۔ ٹالسٹائے عہد جدید میں اس نظریے کا سب سے بہتر اور روشن دماغ شارح تھا۔ اُس نے نہ صرف اس کی تشریح کی بلکہ اس کے مطابق زندگی بسر کی۔ یورپ میں اُس کا رواج ہونے سے بہت پہلے ہندوستان میں لوگ اس کو سمجھتے تھے اور اُس پر عمل کرتے تھے عام طور پر یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ روح کی قوت جسم کی قوت سے کہیں بہتر ہے۔ اگر لوگ مظالم کی چارہ جوئی کے لیے روح کی قوت کا استعمال کریں تو بہت سی مصیبتوں سے جن کا آج کل سامنا کرنا پڑ رہا ہے بچ جائیں گے۔ (۵۹)

بُدھ نے قسمت مندی کے ساتھ دشمن پر یلغار کی اور مغرور پجاریوں کو نیچا دکھایا۔ مسیح نے یروشلم کے معبد سے صرافوں کو نکال باہر کیا اور ریا کاروں اور فریسیوں پر لعنت بھیجی۔ دونوں بہت سخت عملی کارروائی کے قائل تھے۔ مگر جہاں مسیح اور بُدھ گنہگاروں کو سزا دیتے تھے، وہاں یہ بھی تھا کہ اُن کے ہر فعل میں نرمی اور محبت صاف نظر آتی تھی۔ وہ اپنے دشمنوں کو پھول کی چھڑی سے بھی نہ چھوتے تھے۔ مگر خود اُس اصول کے بدلے جس کے لیے وہ جیتے تھے۔ جان دینے کو تیار رہتے تھے۔ اگر بُدھ کی محبت کی شوکت و عظمت پجاریوں کو جھکنے پر مجبور نہ کر دیتی تو وہ اُن کا مقابلہ کرتے ہوئے مر جاتے۔ مسیح کانٹوں کا تاج پہنے سولی پر چڑھ گئے اور ایک پوری سلطنت کی قوت و جبروت

کو خاطر میں نہ لائے۔ اور اگر میں بے تشدد مزاحمت کی تحریکیں کھڑی کر تا رہوں تو یہ مہا عظیم رہنماؤں کی عاجزانہ تقلید ہے۔ (۶۰)

یہ ستیہ گرہ کا ایک قانون ہے کہ جب آدمی کے پاس ہتھیار نہ ہوں اور اُسے کوئی تدبیر نہ سوجھے تو اُسے یہ آخری قدم اُٹھانا چاہیئے کہ اپنی جان قربان کر دے۔ (۶۱)

اہنسا روح کی قوت کا نام ہے اور روح لافانی، غیر تغیر پذیر اور ابدی ہے۔ ایٹم بم طبیعی طاقت کا منتہا ہے، اِس لیے اُس پر انتشار، انحطاط، اور فنا کا قانون جو عالم طبیعی میں کارفرما ہے، حائل ہوتا ہے۔ ہماری مقدس کتابیں گواہ ہیں کہ جب روح کی قوت پوری طرح بیدار ہو جائے تو اُس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا مگر کامل بیداری کا معیار یہ ہے کہ وہ ہمارے روئیں روئیں میں سما جائے اور ہر سانس میں اُس کی آنچ محسوس ہو۔

مگر کسی ادارے کو زبردستی اہنسا کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ اہنسا اور ستیہ کسی آئین میں درج نہیں کیے جا سکتے یہ تو اپنی خوشی سے اختیار کرنے کی چیزیں ہیں۔ اُنہیں ہم پر چست کپڑوں کی طرح ٹھیک آنا چاہیئے۔ ورنہ پھر ہمیں ستیہ اور اہنسا کہنا تناقض لفظی ہوگا۔ (۶۲)

زندگی ایک حوصلہ ہے، ایک آرزو، اُس کا مقصود ہے درجۂ کمال تک پہنچنا یعنی معرفتِ نفس حاصل کرنا۔ ہمیں چاہیئے کہ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کی وجہ سے اپنے نصب العین کو پست نہ ہونے دیں۔...... جو شخص اپنی تقدیر کو اہنسا یا قانونِ محبت سے وابستہ کرتا ہے۔ وہ ہلاکت کے دائرے کو روز بروز گھٹاتا ہے اور اِسی نسبت سے زندگی اور محبت کو فروغ دیتا ہے۔ (۶۳)

زندگی میں ہنسا کو مکمل طور پر ترک کر دینا ناممکن ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی حد کیا مقرر کی جائے۔ یہ حد ہر شخص کے لئے یکساں نہیں ہو سکتی۔ اِس لیے کہ گو اصل اصول ایک ہی ہے۔ لیکن اُس کا استعمال ہر شخص اپنے اپنے طریقے سے کر سکتا ہے۔ جو چیز

ایک شخص کے لئے غذا ہے وہ دوسرے کے لئے زہر ہے۔ گوشت کھانا میرے نزدیک گناہ ہے لیکن کسی اور شخص کے لئے جس نے گوشت کھا کر زندگی بسر کی ہے اور جسے اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی، محض میری تقلید میں گوشت چھوڑنا گناہ ہوگا۔

اگر میں ایک جنگل میں رہ کر کھیتی کرنا چاہتا ہوں تو مجھے اپنے کھیتوں کی حفاظت کے لئے وہ کم سے کم تشدد جس کے بغیر چارہ نہیں استعمال کرنا ہی ہوگا۔ مجھے ان بندروں، چڑیوں کیڑوں مکوڑوں کو جو میرا کھیت کھا جاتے ہیں ہلاک کرنا پڑے گا۔ اگر خود نہ کرنا چاہوں تو کسی دوسرے شخص کو اس کام کے لئے رکھنا پڑے گا۔ ان دونوں صورتوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ اگر میں اہنسا کے نام پر جانوروں کو اپنی فصلیں کھا جانے دوں جب کہ ملک میں قحط ہو تو یقیناً گناہ ہے نیکی اور بدی اضافی اصطلاحیں ہیں۔ جو بات ایک طرح کے حالات میں اچھی ہے وہ دوسری طرح کے حالات میں بری یا گناہ ہو سکتی ہے۔

انسان کو چاہیئے کہ شاستروں کے کنویں میں نہ ڈوب جائے۔ بلکہ ان کے سمندر میں غوطہ لگا کر تہہ سے موتی نکال لائے۔ ہر قدم پر اُسے ہنسا اور اہنسا میں فرق کرنے کے لیے اپنی قوت تمیز کو استعمال کرنا پڑے گا۔ اس میں شرم یا بزدلی سے کام نہیں چلتا۔ شاعر کہہ چکا ہے کہ خدا کی راہ بہادروں کے لیے ہے۔ بزدل اس پر کبھی نہیں چل سکتے۔ (۴۲)

کسی ناگوار بات کو زبان سے کہنا یا قلم سے لکھنا، خصوصاً جب کہ کہنے والا یا لکھنے والا اسے سچ سمجھتا ہو ہنسا نہیں ہے۔ ہنسا در اصل یہ ہے کہ کسی خیال، قول یا فعل سے پیچھے تشدد کی نیت ہو یعنی اس شخص کو جسے ہم اپنا مخالف سمجھتے ہیں۔ نقصان پہنچانے کا ارادہ ہو۔ اکثر اوقات مناسب نا مناسب کا غلط تصور یا کسی شخص کے دل کو ٹھیس لگنے کا ڈر لوگوں کو اپنے اصلی خیالات ظاہر کرنے سے باز رکھتا ہے اور اس طرح انہیں ریاکاری کی سرحد تک پہنچا دیتا ہے۔ لیکن اگر افراد سماج اور قوموں میں خیال کی اہنسا پیدا کرنا ہے تو سچی بات کہنا ضروری ہے، چاہے وہ فوری طور پر کتنی ہی کڑوی معلوم ہو

اور لوگوں کو عام طور پر ناگوار گزرے۔ (۶۵)

دُنیا میں آج تک بغیر عملی اقدام کے کچھ نہیں ہوا۔ میں نے انفعالی مقاومت کی اصطلاح کو اسی لیے ترک کر دیا۔ کہ یہ اپنے مطلب کو پوری طرح ظاہر نہیں کرتی۔ اور کمزوروں کا حربہ سمجھی جاتی ہے۔ (۶۶)

اہنسا کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان میں حملہ کرنے کی قوت موجود ہو اور یہ جان بوجھ کر اور بامقصد انتقام کی خواہش کو ضبط کرنے کا نام ہے۔ مگر بےبسی اور نامردی سے (بدی کے آگے) چپ چاپ ہتھیار ڈال دینے سے تو انتقام بہر حال بہتر اور برتر ہے۔ البتہ عفو کا درجہ اور بھی بلند ہے۔ اس لیے کہ انتقام کھلی کمزوری کی دلیل ہے۔ انتقام کی خواہش حقیقی یا فرضی نقصان کے خوف سے پیدا ہوتی ہے۔ جسے دُنیا میں کسی کا خوف نہ ہو وہ اس شخص پر جو اسے نقصان پہنچانے کی بے فائدہ کوشش کرتا ہو۔ غصہ کرنے کو بھی ایک زحمت ہی سمجھے گا۔ (۶۷)

اہنسا اور بزدلی کا جوڑ نہیں ملتا۔ میں یہ تصور کر سکتا ہوں کہ ایک شخص پوری طرح مسلح ہوتے ہوئے باوجود بزدلی ہو۔ ہتھیار رکھنا اگر بزدلی نہیں تو خوف کی نشانی ضرور ہے مگر سچی اہنسا بغیر کامل بے خوفی کے ممکن نہیں۔ (۶۸)

میرا اہنسا کا عقیدہ ایک نہایت فعّال قوت ہے۔ اس میں بزدلی کی یا کمزوری کی مطلق گنجائش نہیں۔ ایک تشدد پسند سے تو یہ امید ہو سکتی ہے کہ کسی دن اہنسا کا قائل ہو جائے گا۔ مگر بزدل سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اس لیے میں ان صفحات میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ اگر ہم اپنے آپ کو، اپنی عورتوں کو، اپنی عبادت گاہوں کو دکھ اُٹھانے کی قوت یعنی اہنسا کے ذریعہ سے نہیں بچا سکتے۔ تو مردانگی کا تقاضا یہ ہے کہ کم سے کم لڑ بھڑ کر بچائیں۔ (۶۹)

بیتیا کے قریب ایک گاؤں کے لوگوں نے مجھ سے کہا کہ جس وقت پولیس والے

ان کے گھروں کو لوٹ رہے تھے اور اُن کی عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے تو وہ وہاں سے بھاگ آئے تھے تو انہوں نے اپنے بھاگنے کی وجہ یہ بتائی کہ میں نے انہیں اہنسا کی تلقین کی تھی تو کیسے شرم سے آنکھیں نیچی کرنی پڑیں۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میرا مطلب اہنسا سے یہ نہیں تھا۔ میں تو اُن سے یہ توقع رکھتا تھا کہ جو لوگ اُن کی حفاظت میں ہیں انہیں دُنیا کی سب سے زبردست طاقت بھی نقصان پہنچانا چاہے تو وہ آڑے آئیں گے اور انتقام کا خیال کیے بغیر ساری چوٹیں اپنے اوپر لیں گے چاہے اس میں اُن کی جان چلی جائے مگر حملہ کرنے والوں کو بھی پیٹھ نہ دکھائیں گے، اپنی املاک، عزت یا دھرم کی حفاظت کے لیے تلوار اٹھانا بھی کچھ کم مردانگی نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ مردانگی اور شرافت یہ ہے کہ حملہ آور کو نقصان پہنچائے بغیر ان چیزوں کی حفاظت کی جائے۔ میں اہنسا کا پیغام اُن لوگوں کو تو پہنچا سکتا ہوں جو جان دینا جانتے ہیں مگر اُن لوگوں کو نہیں پہنچا سکتا جو جانے سے ڈرتے ہیں۔ (۷۰)

میں ہنسا کا خطرہ مول لینے کو اس کے مقابلہ میں ہزار گنا بہتر سمجھتا ہوں کہ ایک پوری قوم نامرد ہو کر رہ جائے۔ (۷۱)

میری اہنسا میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ آدمی خطرے سے بھاگے اور اپنے پیاروں کو بے حفاظت چھوڑ دے۔ جب ہنسا اور بزدلی میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا سوال ہو تو میں اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا کہ ہنسا کو بزدلی پر ترجیح دوں، میں بزدل کو اہنسا کی تلقین کرنا ایسا سمجھتا ہوں جیسے اندھے کو اچھے مناظر سے لطف اٹھانے کی ترغیب دلانا۔ اہنسا بہادری کا انتہائی درجہ ہے۔ خود اپنے تجربے میں مجھے اس میں کوئی دقت پیش نہیں آئی کہ جن لوگوں نے تشدد کے مدرسے میں تربیت پائی ہے انہیں اہنسا کی برتری کا قائل کر دوں۔ میں خود اس بزدلی کی وجہ سے جو مجھ میں برسوں رہی ہنسا کا خیال دل میں لیے رہا۔ اہنسا کی قدر تو مجھے اس وقت سے ہونی شروع ہوئی جب میری بزدلی دور

ہونے لگی۔ (۷۶)

اہنسا کا سبق اُس شخص کو نہیں دیا جا سکتا۔ جو مرنے سے ڈرتا ہے، اور جس میں مزاحمت کی قوت نہیں ہے۔ ایک بے بس چوہا، جسے بلّی کھا جاتی ہے، اہنسا کا پابند نہیں کہا جا سکتا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ خود بلّی کو کھا جاتا۔ مگر چونکہ یہ ممکن نہیں اِس لیے وہ ہمیشہ اُس سے بھاگ کر بچنا چاہتا ہے۔ ہم اُسے بُزدل نہیں کہتے اِس لیے کہ قدرت نے اُسے ایسا بنایا ہے کہ اس کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ لیکن جب انسان کو کسی خطرے کا سامنا ہو اور وہ چوہے کی سی حرکتیں کرے تو اُسے بجا طور پر بُزدل کہا جاتا ہے، اُس کے دل میں ہنسا اور نفرت ہوتی ہے۔ اور اگر وہ خود نقصان اُٹھائے بغیر اپنے دشمن کو مار سکتا تو ضرور مار ڈالتا۔ اُسے اہنسا چھو بھی نہیں گئی ہے۔ آپ لاکھ اہنسا کی تلقین کیجیے۔ اُس پر کوئی اثر نہیں ہونے کا۔ پہلے اُسے اِس کے لیے تیار کرنے کی ضرورت ہے کہ جب کوئی اُس پر حملہ کرے اور اُسے یہ اندیشہ ہو کہ اُسے کچل دے گا تو وہ جم کر مقابلہ کرے چاہے اِس میں اُن کی جان جاتی رہے، تب جا کر وہ اہنسا کے اصول کو سمجھنے کے قابل ہو گا۔ اگر وہ سرے سے مقابلہ ہی نہ کرے تو اُس کی بُزدلی ثابت ہو جائے گی اور وہ اہنسا سے بہت دور ہو جائے گا۔ میں یہ تو نہیں کر سکتا کہ جو شخص انتقام لینا چاہے اُس کی مدد کروں۔ مگر کسی بُزدل کو نام نہاد اہنسا کی آڑ نہیں لینے دوں گا۔ اہنسا کی ماہیت سے ناواقفیت ہونے کی وجہ سے۔ لوگوں کا ایمانداری سے یہ خیال تھا کہ خطرے سے بھاگنا ہر صورت میں مزاحمت کرنے سے بہتر ہے خصوصاً جب اُس میں جان کا ڈر ہو۔ اہنسا کے معلم کی حیثیت سے مجھے جہاں تک ہو سکے، لوگوں کو اِس بُزدلانہ نظریے سے بچانا ہے۔ (۷۷)

انسان جسمانی حیثیت سے کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو، جب بھاگنے میں ذلت ہو تو اپنی جگہ سے نہ ہٹے اور وہیں جان دے دے۔ یہ بہادری ہو گی اور اہنسا

ہوگی۔ اگر وہ اپنی کمزوری کے باوجود، جو تھوڑی بہت طاقت رکھتا ہے، اُس سے
کام لے کر دشمن پر چوٹ کرے اور لڑتے لڑتے جان دیدے تو یہ بہادری ہوگی۔
اہنسا نہیں ہوگی۔ اگر وہ اِس موقع پر جب اُس کا فرض ہے کہ خطرے کا مقابلہ کرنے،
بھاگ کھڑا ہو تو یہ بزدلی ہوگی۔ پہلی صورت میں اُس کے دل میں محبت اور خیر اندیشی
ہوگی، دوسری اور تیسری صورت میں نفرت یا بے اعتمادی اور خوف ہوگا۔ (۷۴)

میں آپ سے پوچھتا ہوں، فرض کرو کہ میں حبشی ہوتا اور کوئی گوری نسل کا آدمی
میری بہن کی عصمت دری کرتا۔ یا ایک پوری جماعت مل کر اُسے قتل کر ڈالتی تو میں
کیا کرتا؟ اور میرے ذہن میں یہ جواب آتا ہے۔ مجھے اُن لوگوں کا بُرا چاہنا مناسب
نہیں، مگر اُن کے ساتھ تعاون نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر عام حالات میں میری روزی کا
انحصار قتل کرنے والی جماعت کا کام کرنے پر ہو تو میں اب میں ان لوگوں سے تعاون
کرنے سے انکار کر دوں گا۔ یہاں تک کہ وہ کھانا بھی نہیں کھاؤں گا جس سے اُن کا
کوئی تعلق ہو اور اپنے نیگرو بھائیوں سے بھی جو اس ظلم کو انگیز کرتے ہیں ترک تعاون
کر دوں گا۔ اپنے کو قربان کر دینے سے میری مُراد یہ ہے۔ زندگی کا چراغ لحظہ بلحظہ
بُجھتا چلا جائے۔ مگر ایمان کی روشنی ختم نہ ہونے پائے۔ مگر میری ذات اہنسا پر عمل
کرنے کا محض ایک ناقص نمونہ ہے اِس لیے ممکن ہے میرے جواب سے آپ کو تشفی
نہ ہو۔ پھر بھی میں اپنی طرف سے انتہائی کوشش کر رہا ہوں اور اگر مجھے اِس زندگی میں
کامیابی نہ بھی ہو تب بھی میرے عقیدے میں کوئی نہ کمی نہ ہوگی۔ (۷۵)

اِس زمانے میں جب بہیمی قوت کا دور دورہ ہے کسی شخص کے لیے یہ یقین کرنا
قریب قریب ناممکن ہے کہ کوئی دوسرا شخص بہیمی قوت کی برتری کے اصول سے
انکار کر سکتا ہے۔ چنانچہ میرے نام گمنام خطوط آرہے ہیں جن میں مجھے مشورہ دیا گیا
ہے کہ میں ترک تعاون کی تحریک کو نہ روکوں۔ چاہے عوام میں تشدد کی آگ بھڑک اُٹھے

ہونے لگی۔ (۲۶)

اہنسا کا سبق اُس شخص کو نہیں دیا جا سکتا جو مرنے سے ڈرتا ہے اور جس میں مزاحمت کی قوت نہیں ہے۔ ایک بے بس چوہا، جسے بلی کھا جاتی ہے، اہنسا کا پابند نہیں کہا جا سکتا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ خود بلی کو کھا جاتا۔ مگر چونکہ یہ ممکن نہیں اِس لیے وہ ہمیشہ اُس سے بھاگ کر بچنا چاہتا ہے۔ ہم اُسے بُزدل نہیں کہتے اِس لیے کہ قدرت نے اُسے ایسا بنایا ہے کہ اس کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ لیکن جب انسان کو کسی خطرے کا سامنا ہو اور وہ چوہے کی سی حرکتیں کرے تو اُسے بجا طور پر بُزدل کہا جاتا ہے، اُس کے دل میں ہنسا اور نفرت ہوتی ہے۔ اور اگر وہ خود نقصان اُٹھائے بغیر اپنے دشمن کو مار سکتا تو ضرور مار ڈالتا۔ اُسے اہنسا چھو بھی نہیں گئی ہے۔ آپ لاکھ اہنسا کی تلقین کیجیے۔ اُس پر کوئی اثر نہیں ہونے کا۔ پہلے اُسے اِس کے لیے تیار کرنے کی ضرورت ہے کہ جب کوئی اُس پر حملہ کرے اور اُسے یہ اندیشہ ہو کہ اُسے کچل دے گا تو وہ جم کر مقابلہ کرے چاہے اِس میں اُن کی جان جاتی رہے، تب جا کر وہ اہنسا کے اصول کو سمجھنے کے قابل ہو گا۔ اگر وہ سرے سے مقابلہ ہی نہ کرے تو اُس کی بُزدلی ثابت ہو جائے گی اور وہ اہنسا سے بہت دور ہو جائے گا۔ میں یہ تو نہیں کر سکتا کہ جو شخص انتقام لینا چاہے اُس کی مدد کروں۔ مگر کسی بُزدل کو نام نہاد اہنسا کی آڑ نہیں لینے دوں گا۔ اہنسا کی ماہیت سے ناواقف ہونے کی وجہ سے لوگوں کا ایمانداری سے یہ خیال تھا کہ خطرے سے بھاگنا ہر صورت میں مزاحمت کرنے سے بہتر ہے خصوصاً جب اُس میں جان کا ڈر ہو۔ اہنسا کے معلم کی حیثیت سے مجھے جہاں تک ہو سکے، لوگوں کو اِس بُزدلانہ نظریے سے بچانا ہے۔ (۴۷)

انسان جسمانی حیثیت سے کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو، جب بھاگنے میں ذلت ہو تو اپنی جگہ سے نہ ہٹے اور وہیں جان دے دے۔ یہ بہادری ہو گی اور اہنسا

ہوگی۔ اگر وہ اپنی کمزوری کے باوجود، جو تھوڑی بہت طاقت رکھتا ہے، اُس سے کام لے کر دشمن پر چوٹ کرے اور لڑتے لڑتے جان دیدے تو یہ بہادری ہوگی۔ اہنسا نہیں ہوگی۔ اگر وہ اِس موقع پر جب اُس کا فرض ہے کہ خطرے کا مقابلہ کرنے، بھاگ کھڑا ہو تو یہ بُزدلی ہوگی پہلی صورت میں اُس کے دل میں محبت اور خیر اندیشی ہوگی، دوسری اور تیسری صورت میں نفرت یا بے اعتمادی اور خوف ہوگا۔ (۷۴)

میں آپ سے پوچھتا ہوں، فرض کرو کہ میں حبشی ہوتا اور کوئی گوری نسل کا آدمی میری بہن کی عصمت دری کرتا۔ یا ایک پوری جماعت مل کر اُسے قتل کر ڈالتی تو میں کیا کرتا؟ اور میرے ذہن میں یہ جواب آتا ہے۔ مجھے اُن لوگوں کا بُرا چاہنا مناسب نہیں مگر اُن کے ساتھ تعاون نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر عام حالات میں میری روزی کا انحصار قتل کرنے والی جماعت کا کام کرنے پر ہو تو میں اب میں ان لوگوں سے تعاون کرنے سے انکار کر دوں گا۔ یہاں تک کہ وہ کھانا بھی نہیں کھاؤں گا جس سے اُن کا کوئی تعلق ہو اور اپنے حبشی بھائیوں سے بھی جو اس ظلم کو انگیز کرتے ہیں ترک تعاون کر دوں گا۔ اپنے کو قربان کردینے سے میری مُراد یہ ہے۔ زندگی کا چراغ لحظہ بہ لحظہ بجھتا چلا جائے۔ مگر ایمان کی روشنی مدھم نہ ہونے پائے۔ مگر میری ذات اہنسا پر عمل کرنے کا محض ایک ناقص نمونہ ہے اِس لیے ممکن ہے میرے جواب سے آپ کو تشفی نہ ہو۔ پھر بھی میں اپنی طرف سے انتہائی کوشش کر رہا ہوں اور اگر مجھے اِس زندگی میں کامیابی نہ بھی ہو تب بھی میرے عقیدے میں کوئی نہ کمی نہ ہوگی۔ (۷۵)

اِس زمانے میں جب بہیمی قوت کا دور دورہ ہے کسی شخص کے لیے یہ یقین کرنا قریب قریب ناممکن ہے کہ کوئی دوسرا شخص بہیمی قوت کی برتری کے اصول سے انکار کرسکتا ہے۔ چنانچہ میرے نام گمنام خطوط آ رہے ہیں جن میں مجھے متنبہ کیا گیا ہے کہ میں ترک تعاون کی تحریک کو نہ روکوں۔ چاہے عوام میں تشدد کی آگ بھڑک اُٹھے

بعض لوگ میرے پاس آتے ہیں اور یہ فرض کر کے کہیں ضرور در پردہ تشدّد کا منصوبہ گانٹھ رہا ہوں گا۔ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ مبارک لمحہ کب آئے گا جب میں کھُلم کھُلا تشدّد کا اعلان کر دوں گا۔ وہ مجھے یقین دلاتے ہیں کہ انگریز بغیر چھُپے یا کھُلے تشدّد کے قابو میں آنے والے نہیں۔ میں نے سُنا ہے کچھ ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ میں ہندوستان میں سب سے بڑا مکار ہوں۔ اِس لیے کہ میں اپنے دل کا بھید کسی کو نہیں بتاتا۔ اور اُنہیں اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ میں دوسروں کی طرح تشدّد کا قائل ہوں۔ چونکہ دُنیا میں اکثریت کے دل و دماغ پر تشدّد کا نظریہ اس حد تک حاوی ہے اور ترک تعاون کی تحریک کا کامیاب ہونا اس پر موقوف ہے کہ اِس دوران میں تشدّد بالکل نہ ہو اور چونکہ اِس معاملہ میں میرے خیالات لوگوں کے طرزِ عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں اِس لئے میں چاہتا ہوں کہ انھیں جتنی زیادہ وضاحت سے ممکن ہو۔ بیان کر دوں۔

بے شک میرا خیال ہے کہ اگر صرف دو ہی صورتیں ہوں جن میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہو۔ یا بزدلی۔ یا تشدّد، تو میں تشدّد کی رائے دوں گا۔ چنانچہ جب میرے بڑے بیٹے نے مجھ سے پوچھا کہ اگر وہ ۱۹۱۸ء میں اُس موقع پر جب مجھ پر قریب قریب مہلک حملہ کیا گیا۔ موجود ہوتا تو اُسے کیا کرنا چاہیئے تھا، بھاگ کھڑا ہوتا اور مجھے مرنے دیتا۔ یا اُس جسمانی قوت سے جو اُس میں موجود تھی۔ اور جسے وہ استعمال کرنا چاہتا تھا کام لے کر مجھے بچانے کی کوشش کرتا تو میں نے یہی کہا کہ اُس کا فرض تھا کہ مجھے بچاتا، چاہے اس میں تشدّد سے کام لینا پڑتا۔ اسی لیے میں نے جنگ بوئر میں، نام نہاد زولو بغاوت میں اور پچھلی جنگ میں حصہ لیا۔ اسی لیے میں اس کا حامی ہوں کو جو لوگ تشدّد کے قائل ہیں اُنہیں ہتھیار چلانے کی ٹریننگ دی جائے۔ میں اِس بات کو کہ ہندوستان اپنی عزت بچانے کے لیے ہتھیار اُٹھائے اس پر ترجیح دوں گا کہ بزدلوں کی طرح چُپ چاپ اپنی بے عزتی کو برداشت کرے۔

مگر میں سمجھتا ہوں کہ اہنسا، ہنسا سے بدرجہا برتر ہے اور عفو میں سزا سے زیادہ مردانگی ہے۔ عفو سپاہی کی زینت ہے۔ مگر سزا نہ دینا عفو اسی وقت کہلائے گا۔ جب سزا دینے کی طاقت موجود ہو۔ ایک بے بس آدمی کا یہ ظاہر کرنا کہ وہ عفو سے کام لے رہا ہے مہمل بات ہے۔ کیا چوہا بلّی کے ساتھ، جب وہ اُسے پھاڑ کھاتی ہے، عفو سے کام لیتا ہے؟ اِس لیے میں اُن لوگوں کے جذبات کو سمجھتا ہوں جن کی یہ پکار ہے کہ جنرل ڈائر اور اُس کے ساتھیوں کو سخت سزا دی جائے، اُن کا بس چلے تو اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ مگر میرا یہ خیال نہیں کہ ہندوستان بے بس ہے۔ البتہ میں اپنی اور ہندوستان کی طاقت کو اس سے بہتر مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔

میرا مطلب غلط نہ سمجھیے، طاقت جسمانی کس بل سے نہیں پیدا ہوتی۔ بلکہ مضبوط قوتِ ارادی سے۔ ایک معمولی زولو جوان ایک انگریز سے کس بل میں بڑھ کر ہوتا ہے۔ مگر وہ ایک انگریز لڑکے کے مقابلے سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے، اِس لیے کہ وہ اُس لڑکے کے ریوالور سے یا اُن لوگوں سے جو اُس کی طرف سے ریوالور چلاتے ہیں، ڈرتا ہے۔ وہ موت سے ڈرتا ہے اِس لیے اس تن و توش کے باوجود ہمت ہار جاتا ہے۔ ہم ہندوستانیوں کو پل بھر میں یہ احساس ہو سکتا ہے کہ تیس کروڑ آدمیوں کو ایک لاکھ انگریزوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اِس لیے اگر ہم جان بوجھ کر معاف کر دیں تو اس سے ثابت ہوگا کہ ہم اپنی قوت کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ شعوری عفو کے ساتھ ہی ہمارے اندر طاقت کی ایک زبردست لہر دوڑ جائے گی۔ اِس کے بعد کسی ڈائر یا فرینک جانسن کی مجال نہ ہوگی کہ ہندوستان کو ذلت کا نشانہ بنائے۔ اگر میں اِس وقت اپنی بات نہ سمجھا سکوں۔ تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہمیں اس وقت اپنی بے کسی اور مظلومی کا اتنا شدید احساس ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ ہمارے دل میں غصے اور انتقام کے جذبات نہ اُبھریں۔ پھر بھی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر ہندوستان اپنے سزا دینے کے حق سے دست بردار ہو جائے تو اس کے لیے زیادہ مفید ہوگا۔ ہمیں اس سے بہتر کام کرنا

ہے، دُنیا کو اس سے بہتر پیام پہنچاتا ہے۔

میں محض خیال پرست نہیں ہوں۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں ایک عملی تصوریت پسند ہوں، اہنسا کا دھرم محض رشیوں اور سنتوں کے لیے نہیں ہے۔ یہ عام لوگوں کے لیے بھی ہے۔ اہنسا ہماری نوع کا قانون ہے، اسی طرح جیسے ہنسا نوعِ حیوانی کا قانون ہے۔ جانور کے اندر روح سوئی ہوئی ہوتی ہے اور وہ جسمانی طاقت کے سوا کوئی قانون نہیں جانتا۔ انسان کی عظمت و وقار کا تقاضا ہے کہ وہ اس سے برتر قانون کی، روح کی قوت کی اطاعت کرے۔

میں نے ہندوستان کے سامنے ایثارِ نفس کا قدیم قانون پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔ اس لیے کہ ستیاگرہ اور اُس کے لوازم، ترکِ تعاون اور سول نافرمانی، اسی پرانے قانون کے نئے نام ہیں۔ جو ہمیں دُکھ اُٹھانے کا حکم دیتا ہے۔ وہ رشی جنہوں نے ہنسا کے درمیان اہنسا کا قانون دریافت کیا، نیوٹن سے زیادہ خداداد ذہانت رکھتے تھے وہ خود ویلنگٹن سے بڑے آزمودہ کار سپاہی تھے۔ اُنہوں نے ہتھیار چلا کر دیکھ لیا تھا کہ یہ بالکل بے کار چیزیں ہیں اور عاجز و درماندہ دُنیا کو یہ سبق دیا تھا کہ اُس کی نجات ہنسا میں نہیں بلکہ اہنسا میں ہے۔

اہنسا فعالی صورت میں شعوری طور پر دُکھ اُٹھانے کا نام ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان ظالم کی قوتِ ارادی کے سامنے چپ چاپ سر جھکا دے، بلکہ یہ ہیں کہ اپنی روح کی ساری قوت اُس کے ارادے کی مزاحمت میں صرف کر دے۔ ہماری فطرت کے قانون کے مطابق یہ ممکن ہے کہ ایک شخص اپنی عزت، یا اپنے مذہب یا اپنی روح کی حفاظت میں ایک جابر سلطنت کی پوری قوت و حشمت کو خاطر میں نہ لائے اور سلطنت کے زوال یا اُس کی اصلاح کی بُنیاد قائم کر دے۔

چنانچہ میں ہندوستان سے اہنسا پر عمل کرنے کی التجا اِس لیے نہیں کر رہا ہوں

کہ وہ کمزور رہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ اپنی قوت کے شعور کے ساتھ اہنسا کو اختیار کرے۔ اور اپنی قوت کا شعور حاصل کرنے کے لیے اُسے فوجی ٹریننگ کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں اس کی ضرورت اِس لیے محسوس ہوتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو محض گوشت کا لوتھڑا سمجھتے ہیں۔ میں ہندوستان کو یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ وہ ایک لافانی روح رکھتا ہے جو ہر جسمانی کمزوری پر غالب آسکتی ہے اور ساری دُنیا کی مجموعی طاقت سے ٹکر لے سکتی ہے۔ ...... اگر ہندوستان تشدد کا اصول اختیار کرلے تو ممکن ہے اُسے عارضی فتح حاصل ہو جائے۔ ایسا ہوا تو وہ میرے لئے فخر و ناز کا سرمایہ نہیں رہیگا۔ مجھے ہندوستان سے جو قلبی تعلق ہے وہ اِس لیے ہے کہ میں نے سب کچھ اسی سے پایا ہے۔ مجھے قطعی طور پر یقین ہے کہ اُسے ایک مشن پورا کرنا ہے۔ اُسے آنکھ بند کرکے یورپ کی تقلید نہیں کرنی ہے۔ اگر ہندوستان نے تشدد کا نظریہ اختیار کر لیا تو یہ میرے لیے آزمائش کی گھڑی ہوگی۔ مجھے اُمید ہے کہ میں اس میں پورا اُتروں گا۔ میرا مذہب جغرافیائی حدود کا پابند نہیں، میں اس پر جیتا جاگتا عقیدہ رکھتا ہوں اور وہ اِس محبت سے بھی بالاتر ثابت ہوگا جو مجھے ہندوستان سے ہے۔ میں نے اپنی زندگی اِس کے لیے وقف کر دی ہے کہ اہنسا کے مذہب کے ذریعہ جسے میں ہندو دھرم کا اصل اصول سمجھتا ہوں ہندوستان کی خدمت کروں گا۔ (۷۶)

مجھے اپنے مخالفوں کو سمجھانے کی کوشش برابر جاری رکھنا چاہیے۔ یہاں تک کہ یا اُن کو قائل کر دوں یا خود ہار مان لوں، اِس لیے کہ میرا مشن یہ ہے کہ ہر ایک ہندوستانی کو، انگریزوں کو، اور آخر کار ساری دُنیا کو اس کا قائل کر دوں کہ ہمیں آپس کے تعلقات خواہ وہ سیاسی ہوں یا معاشی، سیاسی ہوں یا مذہبی، منضبط کرنے میں اہنسا سے کام لینا چاہیے۔ کوئی مجھ پر یہ الزام لگائے کہ میں بہت زیادہ حوصلہ مند ہوں تو میں اعتراف جرم کرلوں گا۔ کوئی کہے کہ میرا خواب کبھی حقیقت کا جامہ نہیں پہنے گا تو میں یہ کہوں گا "ممکن ہے

آپ کا کہنا صحیح ہو۔" اپنی راہ پر چلتا رہوں گا۔ میں اہنسا کا منجھا ہوا، کڑھا ہوا سپاہی ہوں۔ اور میرے پاس اپنے عقیدے کی تائید میں کافی شہادت موجود ہے۔ اس لیے خواہ میرے ساتھ ایک شخص ہو یا بہت سے لوگ ہوں، یا کوئی بھی نہ ہو، مجھے اپنا تجربہ جاری رکھنا ہے۔"

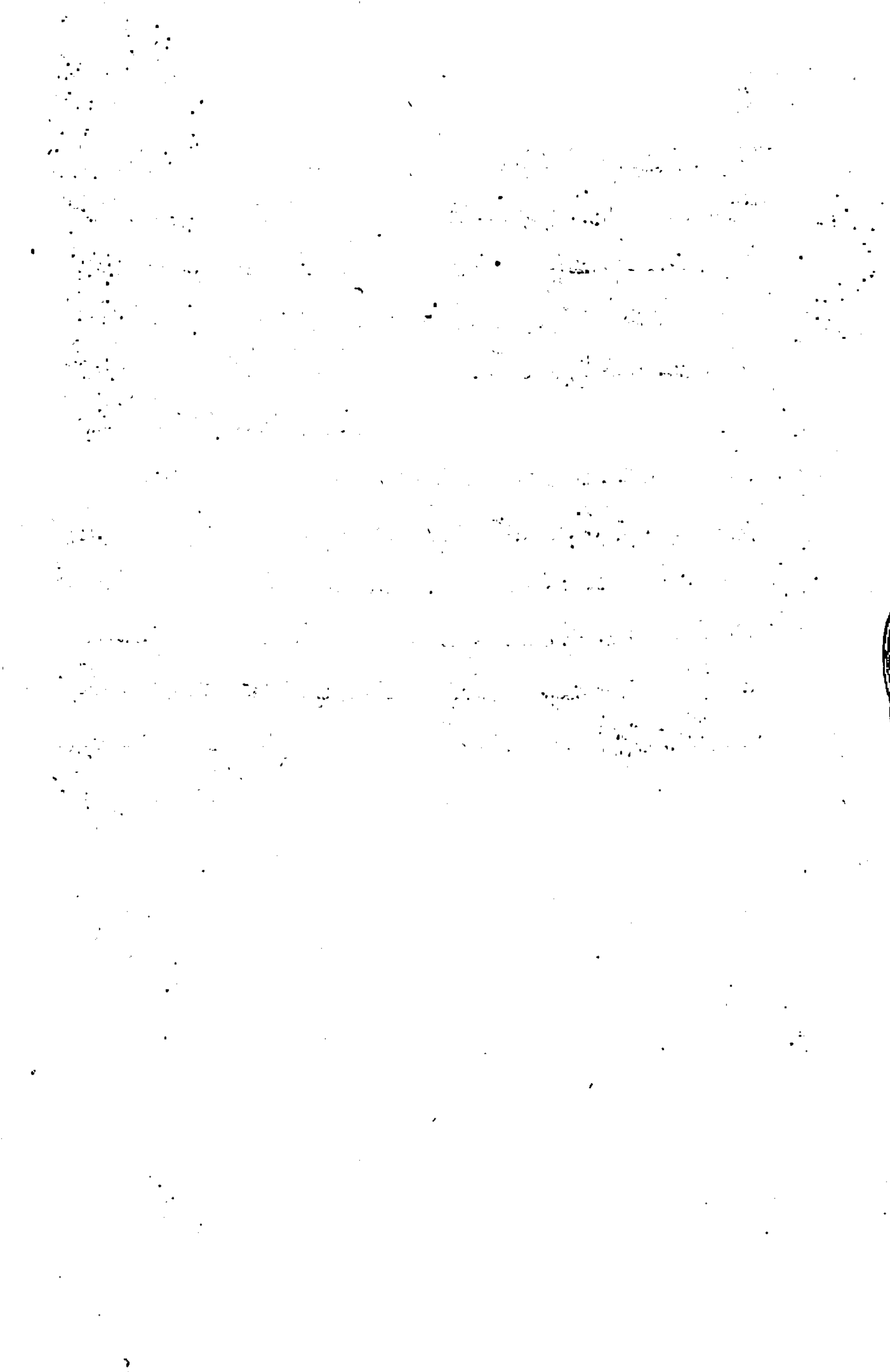
میرے امریکی دوستوں نے کہا ہے کہ اہنسا قائم کرنے میں جتنی مدد ایٹم بم کرے گا اور کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ اگر اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کو اس بم کی مہلک طاقت سے اتنی کراہت پیدا ہو جائے گی کہ وہ کچھ دن کے لیے تشدد کی راہ سے ہٹ جائے گی۔ تو یہ صحیح ہے یہ ویسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص مزیدار کھانے اس قدر ٹھونس لے کہ متلی ہونے لگے اور وہ کچھ دیر کے لیے کھانے سے منہ پھیر لے۔ مگر جیسے ہی متلی کا اثر دور ہو جائے گا وہ اور زیادہ بے قراری سے کھانے پر گرے گا۔ بالکل اسی طرح دنیا کراہت کا اثر دور ہونے کے بعد پھر تشدد پر اتر آئے گی۔

یہ سچ ہے کہ اکثر برائی میں بھلائی کا پہلو نکل آتا ہے۔ مگر یہ تو خدا کے منصوبے ہیں، انسان کے نہیں، انسان تو یہی جانتا ہے کہ برائی سے ہمیشہ برائی نکلتی ہے، اسی طرح، جیسے بھلائی سے بھلائی .... ایٹم بم کے ہولناک المیے سے تو یہی اخلاقی سبق ملتا ہے کہ ہم اس کے جواب میں بم بنا کر اسے ختم نہیں کر سکتے، جیسے تشدد کو جوابی تشدد سے نہیں مٹا سکتے۔ صرف اہنسا ہی نوعِ انسانی کو ہنسا سے نجات دلا سکتی ہے۔ نفرت پر صرف محبت ہی سے قابو پایا جا سکتا ہے۔ جوابی نفرت کا فقط یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ نفرت کا دائرہ بھی بڑھ جاتا ہے اور اس کی شدت بھی۔

میں جانتا ہوں کہ میں وہی بات دوہرا رہا ہوں جو پہلے کئی بار کہہ چکا ہوں۔ اور جس پر اپنی صلاحیت اور طاقت کے مطابق عمل کر چکا ہوں۔ یہ بات جب میں نے پہلی بار کہی تھی اس وقت بھی نئی نہ تھی، بلکہ بہت پرانی تھی۔ مگر میں نے اسے رٹے ہوئے سبق کی طرح

نہیں سنایا تھا بلکہ ایک واضح اصول کے طور پر بیان کیا تھا۔ جس پر مجھے دل وجان سے
یقین تھا۔ اسے زندگی کے مختلف شعبوں میں برتنے کے بعد میرا یقین اور بڑھ گیا۔ اور آپ سے
دوستوں کے تجربے سے مزید تقویت پہنچی۔ مگر یہ ایسی بنیادی حقیقت ہے کہ انسان بالکل
اکیلا ہو تب بھی وہ اس کی حمایت میں ثابت قدم رہ سکتا ہے۔ میں اِس بات کا قائل ہوں
جو میکس مولر نے برسوں پہلے کہی تھی کہ سچی بات کو اُس وقت تک دہرانا ضروری ہے جب تک
ایسے لوگ باقی ہیں جو اُسے نہیں مانتے۔ (۷۸)

اگر ہندوستان ہنسا کا عقیدہ اختیار کرلے اور میں اُس وقت زندہ ہوں تو
میں ایسے ہندوستان میں رہنا پسند نہیں کروں گا۔ مجھے اِس پہ فخر نہیں رہے گا۔ میرا
حُبِ وطن میرے مذہب کے ماتحت ہے۔ میں خود ہندوستان سے اِس طرح چمٹا ہوا
ہوں جیسے بچہ ماں کی چھاتی سے، اُس کی وجہ یہ ہے کہ اُس سے مجھے روحانی غذا ملتی ہے
جس کی مجھے ضرورت ہے، اس میں وہ ماحول موجود ہے جو میرے بلند ترین نصب العین
کے لیے سازگار ہے۔ جب میرا یہ عقیدہ جاتا رہے گا تو میری حالت اُس یتیم کی سی ہوگی جس کا
کوئی سرپرست نہ ہو۔ (۷۹)



پانچواں باب

ضبط نفس

تہذیب حقیقی معنی میں اسے نہیں کہتے کہ ہماری ضرورتوں میں اضافہ ہوتا چلا جائے بلکہ اسے کہتے ہیں کہ ہم اپنی خوشی سے بالقصد اپنی ضرورتوں کو ایک حد کے اندر رکھیں صرف اسی سے سچی راحت اور فراغت حاصل ہوتی ہے اور خدمت کی صلاحیت بڑھتی ہے۔ (۱)

ایک خاص حد تک جسمانی راحت اور حسنِ معاشرت ضروری ہے۔ مگر اس سے آگے یہ چیزیں ہمیں مدد دینے کی بجائے ہماری راہ میں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ اس لیے یہ نصب العین کہ تا محدود ضرورتیں پیدا کی جائیں اور انہیں پورا کیا جائے، مجھے نظر کا دھوکا اور فریب کا پھندا معلوم ہوتا ہے اپنے اس محدود اور تنگ نفس کی جسمانی بلکہ ذہنی ضرورتوں کو بھی ایک حد تک پورا کرنے کے بعد قطعاً روک دینا چاہیے قبل اس کے کہ وہ اپنے درجے سے گر کر آرام طلبی اور ذہنی تعیش بن جائیں۔

انسان کو اپنا طبیعی اور تہذیبی ماحول ایسا بنانا چاہیے کہ وہ اُس کے خدمت کے کام میں، جس میں اُس کی ساری قوتیں صرف ہوتی ہیں، رُکاوٹ نہ ڈالے۔ (۲)

جسم اور نفس میں اِس قدر قریبی رشتہ ہے کہ اگر اُن میں سے ایک بھی ناساز ہو جائے تو پورے نظام میں خلل پڑ جاتا ہے۔ اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پاک سیرت حقیقی معنی میں صحت کی بنیاد ہے۔ اِسی لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ سارے بُرے خیالات اور بُرے جذبات دراصل بیماریوں کی مختلف شکلیں ہیں۔ (۳)

کامل صحت صرف اِسی طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ انسان خدا کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرے اور شیطان کی طاقت کو خاطر میں نہ لائے۔ حقیقی خوشی بغیر حقیقی صحت کے ناممکن ہے۔ اور حقیقی صحت اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی، جب تک انسان زبان کے چٹخارے کو سختی کے ساتھ قابو میں نہ رکھے۔ جب ذائقے پر قابو ہو جائے تو سب حواس خود بخود قابو میں آ جائیں گے۔ اور جس شخص نے اپنے حواس پر فتح پالی اُس نے دراصل ساری دُنیا کو فتح کر لیا اور خدا سے واصل ہو گیا۔ (۴)

میں نے صحافت کو خود اُس کی خاطر حاصل نہیں کیا۔ بلکہ یہ سمجھ کر کہ اس سے مجھے اپنی زندگی کا مشن پورا کرنے میں مدد ملے گی۔ میرا مشن یہ ہے کہ اپنے قول و عمل سے کڑے ضابطوں کے ماتحت ستیا گرہ کے بے مثل ہتھیار سے جو ستیہ اور اہنسا کا بلا واسطہ نتیجہ ہے کام لینا سکھا دوں۔ مجھے یہ فکر ہے۔ بلکہ میں اس کے لیے بے قرار ہوں کہ یہ ثابت کر دوں کہ زندگی کی گوناگوں مشکلات کا حل سوا اہنسا کے اور کچھ نہیں۔ اس کی آنچ اتنی تیز ہے کہ پتھر کا دل بھی ہو تو پگھل جائے۔ چنانچہ اپنے عقیدے کا پابند ہوتے ہوئے میں کوئی بات غصے یا کینہ پروری کے جذبات کے ماتحت نہیں لکھ سکتا۔ کوئی بے کار چیز نہیں لکھ سکتا۔ پڑھنے والے اندازہ نہیں کر سکتے۔ کہ مجھے ہر ہفتے اپنی تحریر کے موضوع

اور الفاظ کے انتخاب میں کس قدر عقیط و احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ اکثر میری خود پسندی تقاضا کرتی ہے کہ کوئی پھڑکتا ہوا جملہ لکھوں، میرا غصہ اکساتا ہے کہ کوئی چبھتا ہوا فقرہ استعمال کر دوں۔ اِس خس و خاشاک سے عبارت کو پاک رکھنا بڑی سخت آزمائش مگر بڑی اچھی تربیت ہے۔ ینگ انڈیا کا پڑھنے والا دیکھتا ہے کہ اُس کے مضمون بڑے شُستہ اور پاکیزہ ہوتے ہیں اور کبھی کبھی اُس کا جی چاہتا ہے کہ دوسروں کا ہم زبان ہو کر کہہ اُٹھے "یہ بوڑھا بہت خوب آدمی ہوگا۔" دُنیا کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ساری خوبی بڑے اہتمام سے اور بڑے اللہ آمین سے ساتھ پیدا کی جاتی ہے۔ اگر یہ چیز بعض لوگوں کو، جن کی میں قدر کرتا ہوں پسند آئی تو پڑھنے والے یہ سمجھ لیں کہ جب یہ خوبی بالکل قدرتی بن جائے، یعنی جب مجھ میں بدی کی صلاحیت ہی نہ رہے۔ اور میرے ذہن میں ایک لمحہ کے لیے بھی کسی قسم کا گھمنڈ یا کوئی سخت بات نہ آئے۔ تب جا کر میرا اہنسا ساری دُنیا کو متاثر کر سکتا ہے۔ اِس سے پہلے ہرگز نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنے سامنے اور پڑھنے والے کے سامنے کوئی ایسا نصب العین یا ایسا سخت امتحان نہیں رکھا جس میں پورا اُترنا ناممکن ہو۔ یہ تو انسان کا فطری اور پیدائشی حق ہے۔ ہم نے فردوس کو محض اسی لیے کھویا ہے کہ اُسے پھر سے حاصل کریں۔ (۵)

میں نے بڑے تلخ تجربے کے بعد یہ انمول سبق سیکھا ہے کہ اپنے غصے کو قابو میں رکھوں۔ جس طرح حرارت کو قابو میں لا کر ایک ایسی قوت میں تبدیل کر سکتے ہیں جو ساری دُنیا کو ہلا کر رکھ دے۔ (۶)

یہ بات نہیں کہ مجھے کبھی غصہ نہ آتا ہو۔ مگر میں غصہ کرتا نہیں۔ میں کوشش کر کے اپنے اندر صبر کی عادت اس شکل میں پیدا کرنا چاہتا ہوں کہ میرا دل غصے سے پاک ہو اور عام طور پر یہ کوشش کامیاب ہوتی ہے مگر جب غصہ آجاتا ہے تو اُسے قابو میں لانا پڑتا ہے۔ یہ سوال کہ میں کس طرح اپنے غصے پر قابو پاتا ہوں، بیکار ہے۔ اس لیے کہ یہ ایسی عادت ہے جو ہر

شخص کو خود ڈالنی چاہیے۔ اور مسلسل کوشش سے ضرور عادت پڑ جاتی ہے۔ (۷)

اپنے افعال کے نتائج سے بچنے کے لیے کوشش نامناسب اور اخلاقی حیثیت سے بری ہے۔ جو شخص ضرورت سے زیادہ کھانا کھائے اس کے لیے یہ اچھا ہے کہ اس کے پیٹ میں درد ہو اور اسے فاقہ کرنا پڑے۔ اور یہ اس کے حق میں برا ہے کہ اپنی اشتہا کو بے لگام چھوڑ دے اور مقویات وغیرہ کے استعمال سے اس کا نتیجہ بھگتنے سے بچ جائے۔ اور پھر حیوانی خواہشات کے ہکر میں پھنس کر ان کے نتائج سے بچنا تو اور بھی برا ہے۔ فطرت بڑی بے رحم ہے اور اپنے قوانین کی خلاف ورزی کا پورا پورا بدلہ لیتی ہے۔ اخلاقی حیثیت سے اچھے نتائج صرف اسی وقت پیدا ہو سکتے ہیں جب ہم اخلاقی ضبط سے کام لیں۔ اور ہر قسم کے ضبط سے خود اس مقصد کو جو اس سے حاصل کرنا ہے نقصان پہنچتا ہے۔ (۸)

ہمارا یہ کام نہیں کہ کسی اور شخص پر نکتہ چینی کریں اور محتسب بن کر اس کی برائیوں کا کھوج لگائیں، خود اپنے احتساب نفس کا کام اتنا ہے کہ ہم اسے کرتے کرتے تھک جائیں۔ جب ہم اپنے اندر کوئی برائی دیکھتے ہیں اور اس کے باوجود یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے عزیز اور دوست درگزر سے کام لیں۔ تو ہم دوسروں کے معاملات میں خواہ مخواہ دخل کیوں دیں ہ اور فرض کیجیے کہ بغیر ہمارے ارادے کے ہمیں کسی کی برائی کا علم ہو جائے اور ہم اختیار رکھتے ہوں اور مناسب سمجھتے ہوں تو خود اس شخص سے پوچھ گچھ کرنی چاہیے کسی اور شخص سے اس کے بارے میں پوچھنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ (۹)

اپنے جذبات کی جھانجھ میں کڑھنا چھوڑ دو، جب ایک فیصلہ کر لو تو پھر اس کے بارے میں بار بار مت سوچو، انسان کوئی عہد کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پھر اس کا ذہن اس موضوع پر قطعاً غور ہی نہ کرے، سوداگر جب ایک مال بیچ دیتا ہے تو پھر اس کی فکر نہیں کرتا۔ بلکہ دوسرے مال کے بارے میں سوچتا ہے۔ یہی بات اس

چیز پر بھی صادق آتی ہے جس کے سلسلے میں کوئی عہد کیا جاتا ہے۔ (۱۰)

آپ یہ جاننا چاہیں گے کہ اُس شخص میں جو حق کی یعنی خدا کی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے کیا خصوصیات ہونی چاہییں۔ اِس میں غیبت، شہوت، لالچ اور لگاؤ، غرور اور خوف کا نام بھی نہ ہو۔ وہ اپنے آپ کو بالکل ناچیز سمجھے اور سب سے پہلے زبان پر یا ذائقے پر اور پھر دوسرے حواس پر قابو حاصل کرے۔ زبان نطق کا آلہ بھی ہے۔ اور ذائقے کا بھی۔ زبان ہی سے ہم مبالغے، جھوٹ اور دل آزار گفتگو کے جرموں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ زبان ہی کا چٹخارا ہمیں پیٹ کا بندہ بنا دیتا ہے اور ہمارا یہ حال کر دیتا ہے۔ کہ ہم جانوروں کی طرح کھانے کیلیے جیتے ہیں۔ مگر مناسب ضبط کے ذریعے سے ہم اپنے آپ کو ایسی ہستیاں بنا سکتے ہیں جو "فرشتوں سے کچھ ہی کم" ہوں جس شخص نے اپنے حواس پر قابو پا لیا ہو وہ بہترین انسان ہے۔ اُس میں ساری نیکیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ خدا اپنے آپ کو اُس کے اندر ظاہر کرتا ہے اِس قدر قوت ہے ضبطِ نفس میں! (۱۱)

سب عالمگیر عملی ضابطے جو احکامِ الٰہی کہلانے کے ہیں سادہ اور سہل ہوتے ہیں۔ اُن کا سمجھنا بھی آسان ہوتا ہے اور اُن پر عمل کرنا بھی، بشرطیکہ آدمی چاہتا ہو۔ وہ مشکل محض اِس لیے لگتے ہیں۔ انسان کاہلی کا بندہ ہوتا ہے۔ فطرت میں کوئی چیز ساکن نہیں صرف خدا غیر متحرک ہے، اِس لیے کہ وہ جیسا کل تھا ویسا ہی آج ہے اور کل بھی ہوگا۔ اِس کے باوجود وہ سرگرمِ عمل ہے۔ .... اِسی لیے میرا یہ خیال ہے کہ اگر نوعِ انسانی کو زندہ رہنا ہے تو اُسے روز بروز سنیہ اور اہنسا کی پابندی کی راہ میں آگے قدم بڑھانا ہوگا۔

جیسے سائنس کے تجربے کرنے کے لیے سائنس کے ایک مقررہ نصابِ تعلیم کی تکمیل ناگزیر ہے، بالکل اسی طرح کسی شخص میں یہ قابلیت پیدا کرنے کے لیے کہ وہ روحانیت کے میدان میں تجربے کر سکے، اُسے شروع میں کڑے ضبطِ نفس کی تربیت

دینا ضروری ہے۔ (۱۳)

نشہ آور چیزوں اور مختلف غذاؤں خصوصاً گوشت سے پرہیز کرنا بلاشبہ روحانی ترقی میں مدد دیتا ہے۔ مگر یہ بجائے خود مقصد ہرگز نہیں۔ بہت سے لوگ جو گوشت کھاتے ہیں اور خدا کے خوف میں زندگی بسر کرتے ہیں، اس شخص کے مقابلہ میں نجات سے زیادہ قریب ہیں جو گوشت سے اور بہت سی چیزوں سے سخت پرہیز کرتا ہے، مگر اپنے ہر فعل سے خدا کے حضور میں بے ادبی کا مرتکب ہوتا ہے۔ (۱۴)

تجربہ یہ سکھاتا ہے کہ حیوانی غذا اُن لوگوں کے لیے جو نفسانی خواہشات کو قابو میں رکھنا چاہتے ہیں ناموزوں ہے۔ مگر غذا کو تعمیر سیرت اور ضبطِ نفس کے معاملہ میں حد سے زیادہ اہمیت دینا غلط ہے۔ غذا بھی ایک قوی عامل ہے جسے نظرانداز نہیں کرنا چاہئے مگر غذا کو مذہب کا نچوڑ سمجھ لینا، جو ہندوستان میں اکثر ہوتا ہے اتنا ہی بیجا ہے جتنا غذا کے معاملے میں ضبط و اعتدال کا مطلق لحاظ نہ کرنا، اور اشتہا کو بے لگام چھوڑ دینا۔ (۱۵)

میرا تجربہ یہ ہے کہ خاموشی حق کے پرستار کی روحانی تربیت کا ایک جزو ہے انسان کی قدرتی کمزوری ہے کہ اس میں شعوری یا غیرشعوری طور پر سچی بات کو چھپانے یا بڑھا کر بیان کرنے یا اس میں کتر بیونت کرنے کا رجحان ہوتا ہے اور اس پر قابو پانے کے لئے خاموشی ضروری ہے۔ کم گو آدمی شاید ہی بے سوچے سمجھے بات کہتا ہو۔ وہ ایک ایک لفظ کو تول کر زبان سے نکالتا ہے۔ (۱۶)

وہ (خاموشی کا روزہ) اب میرے لیے جسمانی حیثیت سے بھی اور روحانی حیثیت سے بھی ضروری ہو گیا ہے۔ شروع میں میں نے اسے کام کے ہجوم سے مہلت پانے کے لیے اختیار کیا تھا۔ میں لکھنے کے لیے وقت نکالنا چاہتا تھا۔ مگر کچھ عرصہ تک یہ معمول رکھنے کے بعد مجھ پر اس کی روحانی قدر و قیمت کا انکشاف ہوا۔ دفعتاً

میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ یہ میرے لیے خدا کا دھیان کرنے کا بہت اچھا وقت ہے۔ اور اب مجھے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے میں قدرتی طور پر خاموش رہنے کے لیے بنا یا گیا ہوں۔ (۱۷)

ہونٹوں کو سی لینا خاموشی نہیں ہے۔ یہی مقصد زبان کو کاٹ ڈالنے سے بھی حاصل ہو سکتا ہے مگر وہ بھی خاموشی نہیں کہلائے گی۔ خاموش تو اُس شخص کو کہا جائے گا جو بولنے کی قوت رکھتا ہے مگر کوئی بے کار بات زبان سے نہیں نکالتا۔ (۱۸)

ساری طاقت قوتِ تولید کو محفوظ رکھنے اور اُس کا ارتقا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ قوت برابر اور اکثر غیر شعوری طور پر ضایع ہوتی رہتی ہے۔ نہ صرف فاسد خیالات کی بلکہ آوارہ، پریشان، بے کار خیالات کی وجہ سے۔ چونکہ ہر قول اور عمل کی جڑ خیال ہے .... اس لیے قول اور عمل کی اچھائی بُرائی خیال کی اچھائی بُرائی پر موقوف ہے۔ چنانچہ پورے طور پر منضبط خیال خود بخود عمل بن جاتا ہے........ اگر انسان خدا کی شبیہ ہے تو وہ اپنے محدود دائرۂ اختیار میں جو قدرت نے اُسے عطا فرمایا ہے، کُن فیکون کا کرشمہ دکھا سکتا ہے۔ یہ طاقت اس شخص کو کبھی حاصل نہیں ہوتی جو اپنی قوت کو منتشر کر دے، چاہے وہ کسی شکل میں بھی ہو۔ (۱۹)

کسی لذت کو جسمانی طور پر حاصل کرنا اس سے بہتر ہے کہ انسان اُس کے خیال سے لذت اُٹھائے۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ شہوانی خواہشیں جیسے ہی انسان کے دل میں پیدا ہوں وہ ناپسندیدگی کے جذبے کے ساتھ اُنہیں کچلنے کی کوشش کرے لیکن اگر جسمانی لذت سے محروم رہنے کی وجہ سے انسان خیالی لذت کی دلدل میں پھنس جائے تو پھر جسم کی خواہش کو پورا کرنا ہی مناسب ہے۔ اس میں مجھے ذرا بھی شبہ نہیں۔ (۲۰)

جنسی خواہش ایک پسندیدہ اور پاکیزہ چیز ہے اس میں شرم کی کوئی بات نہیں مگر اس کا مقصد صرف اولاد پیدا کرنا ہے۔ اس سے کوئی اور کام لینا خدا اور انسانیت

کا گناہ کرنا ہے۔ (۲۱)

دُنیا اُن چیزوں کے پیچھے پھرتی ہے، جو محض عارضی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ اُس کو کسی اور کام کی فرصت ہی نہیں۔ مگر جب انسان ذرا غور سے دیکھتا ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ در اصل وہی چیزیں قدر و قیمت رکھتی ہیں جو دائمی ہیں .... اُن میں سے ایک برہمچریہ بھی ہے۔

برہمچریہ کیا ہے؟ وہ طریق زندگی جو برہمہ یعنی خدا تک پہنچائے۔ اِس میں عملِ تولید پر پوری طرح ضبط رکھنا بھی شامل ہے۔ یہ ضبطِ خیال، قول اور فعل سبھی میں ہونا چاہیے۔ اگر خیال پر قابو نہیں ہے تو باقی دو پر قابو رکھنا کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا ..... جو شخص خیال پر قابو رکھتا ہے، اُس کے لئے باقی دو پر قابو رکھنا بچّوں کا کھیل ہے۔ (۲۲)

یہ سچ ہے کہ جو شخص کامل برہمچریہ حاصل کر لے اُسے اپنی حفاظت کے لیے کسی حصار کی ضرورت نہیں۔ لیکن جو شخص اُس کی سعی کر رہا ہے۔ اُسے یقیناً اپنے گرد حصار کھینچنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح جیسے آم کے چھوٹے پودے کے گرد باڑ کا ہونا ضروری ہے۔ ایک بچہ ماں کی گود سے پالنے میں جاتا ہے، پالنے سے نکل کر گڈ ولنے کے سہارے چلنا سیکھتا ہے، یہاں تک کہ وہ سیانا ہو جاتا ہے اور بے سہارے چلنے لگتا ہے۔ بے ضرورت سہارے سے چمٹا رہنا مضر ہے۔

میرا خیال ہے کہ سعی کی حالت میں بھی اُس شخص کو جو طلب صادق رکھتا ہے۔ اِس طرح کے سہاروں کی ضرورت نہیں۔ برہمچریہ کوئی ایسی چیز نہیں جو خارجی ضبط کے طریقوں سے حاصل ہو سکے۔ جو شخص کسی عورت سے ضروری بات چیت کرنے سے بھی بھاگتا ہے اُس نے برہمچریہ کو پوری طرح نہیں سمجھا۔ ایک عورت کتنی ہی دلکش کیوں نہ ہو اُس کی دلکشی ایسے مرد پر جس کا دل خواہش نفس سے پاک ہے، کوئی اثر نہیں کرے گی .....

سچا برہمچاری بے جا پابندیوں سے دور رہتا ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں کے لحاظ

ہے خود ہی اپنے لیے حصار بنا لیتا ہے اور جب اُنہیں غیر ضروری سمجھتا ہے توڑ دیتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ جاننا ہے کہ برہمچریہ کیا ہے۔ پھر اُس کی قدر و قیمت اور آخر میں اِس انمول صفت کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ ملک کی سچی خدمت کے لیے اِس کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ (۲۳)

میرا اپنا تجربہ ہے کہ جب تک میں اپنی بیوی کو خواہشِ نفس کی نظر سے دیکھتا رہا۔ ہم ایک دوسرے کو حقیقی طور پر سمجھ نہیں پائے۔ ہماری محبت کی سطح ملند نہ ہو سکی۔ یوں تو ہم میں باہمی محبت ہمیشہ رہی۔ مگر جتنا زیادہ ہم نے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میں نے ضبطِ نفس سے کام لیا اُسی نسبت سے ہم ایک دوسرے کے زیادہ قریب آتے گئے۔ میری بیوی میں شروع ہی سے ضبط کی کمی نہ تھی۔ بہت سے موقعوں پر اُنہوں نے ضبط کا ثبوت دیا۔ میری خواہش میں وہ کبھی مزاحمت تو نہیں کرتی تھیں، مگر اکثر ناگواری کا اظہار کر دیتی تھیں۔ جب تک میں شہوانی لذت کا طالب رہا اُن کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔ جیسے ہی میں نے لذتِ نفس کو خیرباد کہی۔ ہمارے تعلقات روحانیت میں ڈوب گئے۔ ہوس مر گئی اور اُس کی جگہ محبت کا سکہ چلنے لگا۔ (۲۴)

برہمچریہ کے خارجی سہارے کے طور پر فاقہ کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا غذا میں انتخاب اور پابندیوں سے کام لینا۔ حواس اتنے طاقتور ہیں کہ ان کو قابو میں رکھنے کے لیے چاروں طرف سے، اوپر سے نیچے سے گھیرنا ضروری ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ بغیر ضبط غذا کے حواس بے بس ہو جاتے ہیں چنانچہ حواس کو قابو میں رکھنے کے لیے فاقہ کرنا میرے لیے بلاشبہ بہت مفید ہے۔ بعض لوگوں کو فاقے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اِس لیے کہ وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ محض فاقے کا میکانکی فعل اُنہیں خواہشِ نفس سے محفوظ رکھے گا اور وہ اپنے جسم کو غذا سے محروم رکھتے ہیں۔ مگر اپنے نفس کی ضیافت طرح طرح کی لذتوں کے تصور سے کرتے ہیں۔ ہر وقت سوچتے رہتے ہیں۔ کہ فاقہ توڑنے کے بعد کیا کیا کھائیں گے اور کیا پئیں گے۔ اِس طرح کے فاقے سے نہ وہ ذائقے پر ہی قابو پا سکتے ہیں اور نہ شہوانی خواہش پر۔ فاقہ اُس وقت

مفید ہوتا ہے جب نفس فاقہ کش جسم کے ساتھ تعاون کرے۔ یعنی جب وہ اِن چیزوں سے جن سے جسم کو محفوظ رکھا ہے کراہت کرنے لگے۔ نفس ہی عیاشی کی جڑ ہے۔ اِس لیے فاقے کا فائدہ بہت محدود ہے، اِس لیے کہ فاقے کی حالت میں بھی انسان خواہش نفس سے مغلوب ہو سکتا ہے۔ (۲۵)

برہمچریہ وہ ہے جو ہر حال میں اور ہر ممکن تحریص کے باوجود قائم رہے۔ اگر ایک خوب صورت عورت کسی مرد کی سنگ مرمر کی مورتی کے قریب آئے۔ تو اِس مورتی پر مطلق اثر نہیں ہوگا۔ برہمچاری وہ ہے جو ایسی صورت میں سنگِ مرمر کی طرح ثابت ہو جیسے سنگ مرمر کا بُت نہ آنکھوں سے دیکھتا ہے نہ کانوں سے سنتا ہے۔ اِسی طرح انسان کو گناہ کے ہر محرک سے بچنا چاہیے۔

آپ کہیں گے کہ جب عورت کو دیکھ کر اور اس سے مل کر ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں تو پھر اس سے دور ہی رہنا چاہیے۔ مگر یہ استدلال غلط ہے۔ اگر برہمچریہ صرف اِسی طرح قائم رہ سکتا ہے کہ عورت کے ملنے سے چاہے وہ خدمت کی غرض سے کیوں نہ ہو۔ پرہیز کیا جائے تو وہ برہمچریہ کہلانے کا مستحق نہیں۔ وہ تو محض جسمانی ترک ہے بغیر اس ذہنی بے تعلقی کے جو ایسی صورت میں ضروری ہے اور اس سے یہ اندیشہ ہے کہ نازک وقت میں ہمارا ساتھ چھوڑ دے گا۔ (۲۶)

جنوبی افریقہ میں بیس برس تک میں مغربی تہذیب سے بہت قریب رہا۔ میں نے جنسی مسائل پر ہیولاک ایلس اور برٹرنیڈ رسل جیسے نامور مصنفوں کی کتابیں پڑھی ہیں۔ اور ان کے نظریات سے واقف ہوں۔ یہ حضرات بڑے ممتاز، دیانتدار اور تجربہ کار مفکر ہیں۔ انہوں نے اپنے خیالات کی بدولت اور انہیں ظاہر کرنے کی وجہ سے بڑی تکلیفیں اُٹھائی ہیں۔ گو وہ شادی وغیرہ کی رسموں کے مروجہ اخلاقی ضابطوں سے قطعاً منکر ہیں —— اور اِس میں اُن سے متفق نہیں ہوں —— پھر بھی وہ اِس بات کو دل سے مانتے ہیں کہ رسم و دستور کا قائل

ہوئے بغیر انسان پاکباز ہو سکتا ہے اور اُسے ہونا چاہیے۔ میں مغرب میں ایسے مردوں اور عورتوں سے ملا ہوں۔ جو عفت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ گو وہ مروجہ رسم و دستور کے نہ قائل ہیں۔ نہ پابند۔ میری تحقیق بھی ایک حد تک یہی ہے۔ اگر آپ خود اسے تسلیم کرتے ہیں کہ سماجی اصلاح یعنی پرانی چیزوں کو جب ضرورت ہو چھوڑنا اور ایک نیا ضابطہ اخلاق جو عہدِ جدید کے لیے موزوں ہو تعمیر کرنا ضروری بھی ہے اور پسندیدہ بھی تو دوسروں سے اجازت لینے کا یا اُنہیں قائل کرنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ مصلح اِس کا انتظار نہیں کر سکتا کہ جب دوسرے اُس کے ہم خیال بن جائیں اُس وقت عملی قدم اُٹھائے۔ اُسے تو آگے بڑھنا ہے۔ خواہ اکیلا ہو اور ساری دُنیا اُس کے خلاف ہو۔ میں برہمچریہ کی موجودہ تعریف کو جانچنا اور اُس میں توسیع اور ترمیم کرنا چاہتا ہوں .... اپنے مشاہدے، مطالعے اور تجربے کی روشنی میں۔ ایسے جب کوئی موقع آتا ہے، میں اُس سے بچتا یا بھاگتا نہیں ہوں بلکہ اُسے اپنا فرض، اپنا دھرم سمجھتا ہوں کہ اس کا سامنا کروں اور یہ دیکھوں کہ وہ کدھر لے جانا چاہتا ہے۔ اور میرا کیا موقف ہے۔ عورت سے ملنے سے پرہیز کرنا یا اُس سے ڈر کر بھاگنا میرے نزدیک برہمچریہ کے طالب کے شایانِ شان نہیں۔ میں نے کبھی عورتوں سے ملنے کی کوشش خواہش نفس کی بنا پر نہیں کی۔ میں اِس کا دعوےٰ نہیں کرتا کہ میں نے اپنے نفس سے جنسی خواہش کا استیصال کر دیا ہے مگر یہ دعویٰ ضرور ہے کہ میں اُسے قابو میں رکھتا ہوں (۲۰)

وہ سارا سلسلۂ فکر جس پر ضبطِ تولید کا خیال مبنی ہے غلط اور خطرناک ہے۔ اُس کے حامیوں کا یہ دعویٰ کہ یہ نہ صرف انسان کا حق بلکہ اُس کا فرض ہے کہ اپنی حیوانی جبلت کو تسکین دے اور اگر وہ اِس فرض کو ادا نہ کرے تو اُس کی نشوونما رُک جائے گی، میرے خیال میں یہ دعویٰ غلط ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ضبطِ تولید میں مصنوعی طریقوں سے کام لے اُس سے ضبطِ تولید کی توقع رکھنا فضول ہے۔ دراصل ضبطِ تولید کی تلقین ہی اِس بنا پر کی جاتی ہے کہ حیوانی جبلت کو ضبط کرنا ناممکن ہے، ظاہر ہے یہ کہنا کہ ضبطِ نفس 'ناممکن' یا غیر ضروری۔ یا

معز ہے۔ ایک سرے سے سامنے مذہب کی نفی ہے اِس لیے کہ مذہب کی ساری عمارت ہی ضبطِ نفس پر قائم ہے ۔ (۲۸)

میں پھر مانعِ حمل تدبیروں کے ذریعہ سے ضبطِ تولید کے موضوع پہ بحث کرنا چاہتا ہوں ۔ ہمارے کانوں میں یہ بات ٹھونسی جاتی ہے کہ جنسی خواہش کی تسکین کی ہمارے اوپر ایسی ہی گمبھیر ذمہ داری ہے، جیسی اپنے جائز قرضوں کے ادا کرنے کی اور اگر ہم اس سے قاصر رہے تو اِس کی سزا ذہنی انحطاط کی صورت میں ملے گی ۔ اِس جنسی خواہش کو اولاد کی خواہش سے الگ کر دیا گیا ہے اور مانع حمل تدبیروں کے حامی یہ کہتے ہیں کہ حمل کا قرار پانا ایک اتفاقی چیز ہے ۔ اور سوا اِس صورت کے جب دونوں فریقوں کو اولاد کی خواہش ہو اسے روکنا چاہیے ۔ میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اِس نظریے کی تلقین ہر ملک میں خطرناک ہے خاص کر ہندستان جیسے ملک میں جہاں متوسط طبقے کے مرد تولید کے عمل میں بے راہروی کی وجہ سے نامرد ہو گئے ہیں ۔ اگر جنسی خواہش کی تسکین فرض ہے تو پھر اُس کو خلاف وضع فطری طریقے سے اور دوسرے طریقوں سے تسکین دینا بھی مستحسن ٹھہرا۔ پڑھنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ کچھ لوگ، یہاں تک کہ بعض نامور اشخاص نے اس چیز کو جسے ہم عام طور پر انحراف جنسی کہتے ہیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے ۔ شاید انھیں یہ سُن کر سخت دھچکا لگے گا۔ لیکن اگر اِس چیز پر کسی طرح بھلمنسی کی مہر لگ گئی تو لڑکے اور لڑکیوں میں عام رواج ہو جائیگا کہ جنسی خواہش کو اپنے ہم جنسوں کے ذریعے پورا کریں ۔ میرے نزدیک مانعِ حمل تدبیروں کے استعمال میں اور اِس قسم کے طریقوں میں جو لوگ اب تک جنسی خواہش کی تسکین کے لیے اختیار کرتے ہیں، بہت فرق ہے ۔ اِس کے نتیجوں سے بہت کم لوگ واقف ہیں ۔ میں جانتا ہوں اِس خفیہ بدکاری نے اسکول کے لڑکوں اور لڑکیوں میں کس قدر تباہی پھیلی ہے ۔ سائنس کے نام سے مانع حمل، تدبیروں کے استعمال اور سماج کے مشہور لیڈروں کی سندِ جواز سے اُن مصلحوں کے کام میں جو سماجی زندگی کو ان بُرائیوں سے پاک کرنا چاہتے ہیں، بڑی پیچیدگی

پیدا ہوگئی ہے اور اس وقت تو یہ کام ناممکن ہوگیا ہے۔ میں اگر پڑھنے والوں کو یہ بتاؤں کہ اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والی کچی عمر کی کنواری لڑکیوں میں کچھ ایسی بھی ہیں جو بڑے شوق سے برتھ کنٹرول کی کتابیں اور رسالے پڑھتی ہیں۔ بلکہ اُن کے پاس مانع حمل چیزیں بھی موجود ہیں تو یہ کوئی افشائے راز نہ ہوگا۔ ان چیزوں کے استعمال کو صرف بیاہی عورتوں تک محدود رکھنا کسی طرح ممکن نہیں۔ شادی کی ساری تقدیس جاتی رہتی ہے جب اُس کا مقصد اور سب سے بڑا مصرف حیوانی خواہش کی تکمیل کو سمجھا جائے۔ اور اس فعل کے قدرتی نتیجے کا حاصل کرنا مقصود نہ ہو۔ (۲۹)

مجھے سادھو کہنا صحیح نہیں ہے۔ میں جن اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرتا ہوں اُنہیں دُنیا کے سامنے اس غرض سے پیش کرتا ہوں کہ عام آدمی اُنہیں اختیار کریں۔ میں تدریجی ترقی کے ذریعے یہاں تک پہنچا ہوں۔ میں نے ہر قدم بڑے غور وفکر کے بعد بہت سمجھ بوجھ کر اُٹھایا ہے۔ میرے یہ برہمچریہ اور اہنسا کے دونوں اصول ذاتی تجربے سے ماخوذ ہیں۔ اور خدمتِ خلق کے تقاضے سے اُن کا اختیار کرنا میرے لیے ضروری ہوگیا ہے۔ مجھے جو زندگی جنوبی افریقہ میں الگ تھلگ رہ کر گرہست۔ جیل اور سماجی مصلح اور سیاست کار کی حیثیت سے اختیار کرنی پڑی۔ اُس کے فرائض کو پورا کرنے کے لیے اِس کی ضرورت تھی کہ اپنی جنسی زندگی میں بڑی احتیاط سے منضبط کروں۔ اور انسانی تعلقات میں خواہ وہ اپنے ہم وطنوں سے ہوں، یا یورپینوں سے بڑی سختی کے ساتھ ستیہ اور اہنسا سے کام لوں۔ میں اپنے آپ کو اس سے زیادہ نہیں سمجھتا کہ ایک معمولی آدمی ہوں جس کی قابلیت اوسط درجے سے بھی کم ہے۔ مجھے اس کا دعویٰ نہیں کہ میں تھوڑی بہت اہنسا یا برہمچریہ کی وجہ سے، جو میں نے بڑی محنت اور تحقیق سے حاصل کی ہے کسی خاص تعریف کا مستحق ہوں (۳۰)

میں نے فیصلہ کر لیا ہے، معرفتِ الٰہی کے سونے راستے ہیں، جو میں نے

اختیار کیا ہے مجھے کسی ارضی رفیق کی ضرورت نہیں، اِس لیے جو لوگ دل میں یہ سمجھتے ہیں گو زبان سے نہیں کہتے کہ میں رنگا سیار ہوں، اُن کا جی چاہے تو یہ بانگِ دہل اس کا اعلان کر دیں۔ ممکن ہے اِس سے اُن لوگوں کو جو مجھے مہاتما کہنے پر مصر ہیں مایوسی ہو۔ سچ پوچھیے تو مجھے اِس خیال سے کہ میرا پردہ اِس طرح فاش ہو جائے گا۔ خوشی ہوتی ہے۔(۳۱)

چھٹا باب

بین الاقوامی امن

میرے خیال میں یہ ممکن نہیں کہ ایک فرد روحانی ترقی کرے اور وہ لوگ جن سے درمیان وہ رہتا ہے دُکھ اُٹھاتے رہیں۔ میں ادویت کا قائل ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ دراصل سب انسان بلکہ سب جاندار ایک ہیں۔ اِس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ایک شخص روحانی ترقی کرتا ہے تو ساری دُنیا اس کے ساتھ ترقی کرتی ہے اور اگر ایک شخص نیچے گرتا ہے۔ تو ساری دُنیا ایک حد تک گر جاتی ہے۔ (۱)

کوئی ایک نیکی بھی ایسی نہیں جس میں صرف فرد کی بھلائی مقصود ہو یا کافی سمجھی جائے۔ اِسی طرح کوئی اخلاقی جرم ایسا نہیں جس کا اثر بلا واسطہ یا بالواسطہ مجرم کے علاوہ اور بہت سے لوگوں پر نہ پڑتا ہو۔ اِس لیے کسی فرد کا بُرا یا بھلا ہونا صرف اُس کا ذاتی معاملہ نہیں۔ دراصل اُس کا تعلق ساری سماج سے بلکہ ساری دُنیا سے ہے۔ (۲)

اگرچہ فطرت میں دفع کی قوت بھی کچھ کم نہیں۔ مگر اس کی ہستی جذب پر منحصر ہے۔

باہمی کشش ہی کی بدولت فطرت کو قیام و دوام حاصل ہے۔ انسان کی زندگی بھی تخریب کے بل پر نہیں چلتی۔ خود حُبِ نفس اُسے دوسروں کا لحاظ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ قوم میں ربط اِن افراد کے باہمی ربط کی وجہ سے ہوتا ہے جن پر وہ مشتمل ہے۔ ایک دن ہمیں قومی نظام کو توسیع دے کر ساری دُنیا پر عائد کرنا ہوگا۔ جس طرح خاندانی نظام کو توسیع دینے سے قوم بنی جو در اصل ایک وسیع تر خاندان ہے۔ (۳)

نوعِ انسانی اِس لحاظ سے ایک ہے کہ سب لوگ ایک ہی اخلاقی قانون کے ماتحت ہیں۔ خدا کی نظر میں سب انسان ایک ہیں۔ ظاہر ہے کہ نسل، درجے وغیرہ کے فرق موجود ہیں لیکن جتنے اونچے درجے کا آدمی ہو اتنی ہی زیادہ ذمہ داریاں اس پر ہوتی ہے۔ (۴)

میرا مشن صرف یہی نہیں کہ ہندوستان کے لوگ برادری کے رشتے میں مربوط ہو جائیں - - - - - - - - - - - - - - - - . اگرچہ آج کل میری ساری زندگی اور سارا وقت اِسی کے لئے وقف ہے۔ بلکہ ہندوستان کی آزادی کے ذریعہ میں انسانی برادری قائم کرنے کا مشن پورا کرنا چاہتا ہوں۔ میرے حُبِ وطن کا دائرہ محدود نہیں، اُس کے دائرے میں ساری دُنیا آجاتی ہے۔ میں ایسے حُبِ وطن کو ٹھکراؤں گا جو دوسری قوموں کے استحصال سے پنپتا ہے۔ میرا حبِ وطن کا تصور ہر حالت میں بغیر کسی استثنار کے سارے عالمِ انسانیت کے مفاد سے ہم آہنگ ہے، یہی نہیں، بلکہ میرا مذہب اور میرا حبِ وطن، جو میرے مذہب سے ماخوذ ہے۔ ساری جاندار مخلوق کو اپنے دائرے میں سمیٹ لیتا ہے۔ نہ صرف اُن ہستیوں سے جو انسان کہلاتی ہیں برادری اور یکجہتی کے تعلقات رکھنا چاہتا ہوں، بلکہ سارے جانوروں، یہاں تک کہ حشرات الارض کے ساتھ بھی یگانگی پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کے دل کو دھچکا نہ لگے تو میں یہ کہوں کہ زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑوں تک سے یگانگی میں اِس لیے پیدا کرنا چاہتا ہوں کہ ہم سب اپنے کو ایک ہی خدا کی اولاد کہتے ہیں۔ اس لیے زندگی خواہ وہ کسی شکل میں ظاہر ہو، لازمی طور پر ایک ہے۔ (۵)

کوئی شخص بین الاقوامی اتحاد کا حامی اس وقت تک نہیں ہو سکتا، جب تک وہ قوم پرور نہ ہو۔ بین الاقوامی اتحاد اُسی وقت ممکن ہے جب قومیت وجود میں آجائے یعنی جب ہر ملک کے لوگ اپنے آپ کو منظم کر کے ایک فرد واحد کی طرح عمل کر سکیں۔ قومیت بجائے خود بُری نہیں ہے، بُرائی دراصل اُس تنگ نظری، خود غرضی، اکل کھرے پن میں ہے جن کا ذمہ عہد جدید کی قوموں میں سرایت کر گیا ہے ہر ایک قوم یہ چاہتی ہے کہ دوسری قوم کو نقصان پہنچا کر خود فائدہ اٹھائے، اُس کی زندگی کے کھنڈر پر اپنی زندگی کی عمارت کھڑی کرے۔ (۶)

میں ہندوستان کا ایک حقیر خادم ہوں اور ہندوستان کی خدمت کے ذریعہ عام انسانی برادری کی خدمت کرتا ہوں۔ پبلک لائف کے پچاس برس کے تجربے کے بعد اب میں یہ کہہ سکتا ہوں اس نظریے پر کہ اپنی قوم کی خدمت، ساری دُنیا کی خدمت سے منافی نہیں ہے۔ میرا عقیدہ اور پکا ہو گیا ہے، یہ بڑا اچھا نظریہ ہے، اس کو قبول کیے بغیر دُنیا کی موجودہ صورت حال کا سدھرنا اور کرۂ ارض پر بسنے والی قوموں کی باہمی رقابت کا دور ہونا ممکن نہیں۔ (۷)

انسان کو ایک دوسرے کی مدد پر بھروسا کرنے کو بھی اسی طرح اپنا نصب العین بنانا چاہیے جیسے خود کفیل ہونے کو۔ انسان ایک سماجی مخلوق ہے۔ بغیر سماج سے تعلق پیدا کئے وہ کائنات کے ساتھ یگانگی پیدا کر سکتا ہے اور نہ اپنی انانیت کو کچل سکتا ہے۔ سماج کے ساتھ تعلقات ہی میں وہ اپنے عقیدے کو آزما سکتا ہے۔ اور اپنے آپ کو واقعات کی کسوٹی پر پرکھ سکتا ہے۔ اگر انسان اتفاق سے یا اپنی کوشش سے ایسے موقف میں ہو کہ وہ اپنے ہم جنسوں کی مدد سے قطعاً بے نیاز ہو تو اس قدر مغرور ہو جائے گا کہ وہ دُنیا کے لئے ایک بوجھ اور مصیبت بن جائے گا۔ سماج کا محتاج ہونے سے وہ انسانیت سیکھ سکتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسان کو اس قابل ہونا چاہیے

کہ اپنی اکثر بنیادی ضرورتوں کو خود پورا کر سکے۔ مگر میرے نزدیک یہ بھی ایک صریحی حقیقت ہے کہ جب خود کفیل ہونا اس حد کو پہنچ جائے کہ انسان سماج سے کٹ کر الگ ہو جائے تو وہ گناہ بن جاتا ہے۔ سچ پوچھیے تو انسان صرف ایک اس معاملے میں بھی خود کفیل نہیں ہو سکتا کہ روئی کی کاشت سے لے کر کپڑا اپنے تک جتنے مختلف کام کرنے ہیں وہ خود انجام دے سکے۔ کسی نہ کسی منزل پر اپنے خاندان کے کسی فرد سے مدد لینی پڑے گی۔ اور اگر آدمی اپنے خاندان کے کسی فرد سے مدد لے تو اپنے ہمسایہ سے کیوں نہ لے۔؟ ورنہ پھر یہ اہم قول بے معنی ٹھہرتا ہے کہ "ساری دنیا میرا خاندان ہے۔" (۸)

ہمارے ذاتی، خاندانی، ملکی اور عالمی فرائض ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں ہیں۔ انسان اپنے آپ کو یا اپنے خاندان کو نقصان پہنچا کر ملک کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اسی طرح ملک کی خدمت دنیا کو نقصان پہنچا کر نہیں ہو سکتی۔ آخر میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فرد کو خاندان پر، خاندان کو ملک پر اور ملک کو دنیا پر اپنی جان قربان کر دینا چاہیے۔ مگر قربانی صرف پاک چیزوں کی ہو سکتی ہے۔ اس لیے سب سے پہلا قدم اپنے نفس کا تزکیہ ہے۔ جب دل پاک صاف ہو تو انسان کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر ایک لمحے میں اُس کا فرض کیا ہے۔ (۹)

سب سے اچھا طریقہ تو یہی ہے کہ ہم ساری دنیا سے دوستی رکھیں اور کل نوعِ انسانی کو ایک خاندان سمجھیں۔ جو شخص اپنے مذہب کے اور دوسرے مذہب کے لوگوں میں فرق کرتا ہے وہ اپنے ہم مذہبوں کو غلط تعلیم دیتا ہے اور فساد اور لامذہبی کی راہ کھول دیتا ہے۔ (۱۰)

میں ہندوستان کی آزادی کے لیے جیتا ہوں اور اس کے لیے مرنے کو تیار رہوں اس لیے کہ میں اُسے حق کا ایک جز سمجھتا ہوں۔ ہندوستان خدا سے برحق کی پرستش تبھی کر سکتا ہے جب وہ آزاد ہو۔ میں ہندوستان کی خدمت اس لیے کرتا ہوں کہ میرا اسدیشی نظریہ مجھے

یہ سکھاتا ہے کہ اُس کی تہذیب کا وارث ہونے کی بنا پر میں اور ملکوں کے مقابلے پر اُس کی خدمت کے لیے زیادہ موزوں ہوں اور اُس کا حق مجھ پر زیادہ ہے مگر میرے حبِّ وطن کا دائرہ تنگ نہیں ہے۔ اِس کا نصب العین محض اتنا ہی نہیں کہ دوسری کسی قوم کو نقصان نہ پہنچائے۔ بلکہ یہ ہے کہ حقیقی معنی میں سب قوموں کو فائدہ پہنچائے۔ ہندوستان کی آزادی جیسی میرے تصور میں ہے دُنیا کے لیے کبھی خطرہ نہیں ہو سکتی۔ (۱۱)

ہم اپنے ملک کے لیے آزادی چاہتے ہیں مگر اِس طرح نہیں کہ ہم دوسروں کے ملکوں کا استحصال کریں۔ یا اُن کو ذلیل کریں۔ اگر ہندوستان کی آزادی کے معنی یہ ہوں کہ انگلستان صفحۂ ہستی سے مٹ جائے اور انگریز دُنیا سے معدوم ہو جائیں تو مجھے ایسی آزادی نہیں چاہیے۔ میں اپنے ملک کی آزادی اِس لیے چاہتا ہوں کہ دوسرے ملک اُس سے کچھ سیکھیں، میرے ملک کے وسائل بنی نوع انسان کے فائدے کے لیے استعمال ہو سکیں جس طرح آج وطن پرستی ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ فرد کو خاندان کے لیے خاندان کو گاؤں کے لیے۔ گاؤں کو ضلع کے لیے اور ضلع کو صوبے کے لیے اور صوبے کو ملک کے لیے جان تک قربان کر دینی چاہیے۔ اُسی طرح ملک کی آزادی کا مقصد یہ ہے کہ اگر ضرورت ہو تو وہ دُنیا کے فائدے کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دے۔ اِس لیے میرا قومی محبت یا قوم پروری کا تصور یہ ہے کہ میرا ملک آزاد ہو تاکہ ضرورت کے وقت وہ دوسری قوموں کی زندگی کے لیے خود مر مٹے۔ اس میں نسلی منافرت کی گنجائش ہی نہیں۔ ہماری قوم پروری ایسی ہونی چاہیے۔ (۱۲)

۱ ہمیں اِن سرحدوں کے پار جو ریاستوں نے قائم کر رکھی ہیں۔ دُنیا کے دوسرے سرے تک اپنے ہمسایوں کی خدمت کرنی چاہیے۔ یہ سرحدیں خدا کی بنائی ہوئی نہیں ہیں۔ (۱۳)

میرا مقصد ساری دُنیا سے دوستی کرنا ہے۔ میں ظلم یا بدی کی زیادہ سے زیادہ

مخالفت کے ساتھ ساتھ انسانوں سے زیادہ سے زیادہ محبت بھی کر سکتا ہوں۔ (۱۴)

میرے نزدیک حُبِ وطن اور حبِ قوم کا دائرہ تنگ نہیں۔ میں ہندوستان کی خدمت کی خاطر انگلستان یا جرمنی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ میرے تصورِ حیات میں سامراج کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایک محبِ وطن کا اصولِ زندگی وہی ہے۔ جو ایک بزرگ خاندان کا ہوتا ہے۔ اگر محبِ وطن انسان دوست نہ ہو تو اُس کے حُبِ وطن کو بٹہ لگ جاتا ہے ذاتی دستور العمل اور سیاسی دستور العمل میں کوئی تزاحم نہیں ہے۔ (۱۵)

ہمارا ترکِ تعاون نہ انگریزوں سے ہے اور نہ مغرب سے، ہمارا ترک تعاون تو اُس نظام سے ہے جو انگریزوں نے قائم کیا ہے اور مادی تہذیب اور اُس کے لوازم یعنی لالچ اور کمزوروں کے استحصال سے۔ ہمارا ترک تعاون یہ ہے کہ دکھ دینے کے لیے، خود اپنے اندر ڈوب جائیں۔ ہمارا ترک تعاون یہ ہے کہ انگریز حاکموں سے اُن کی مقرر کی ہوئی شرطوں پر تعاون کرنے سے انکار کر دیں ہم اُن سے کہتے ہیں۔ "آؤ ہمارے ساتھ ہماری شرطوں پر تعاون کرو۔ اس میں ہمارا تمہارا اور ساری دُنیا کا بھلا ہے۔" ہمیں سیلاب کی رو میں بہنا نہیں چاہیے۔ جو خود ڈوب رہا ہے وہ دوسروں کو کیا بچائے گا۔ اس قابل بننے کے لیے کہ دوسروں کو بچا سکیں۔ ہمیں پہلے آپ کو بچانا ہے۔ ہندوستان کی قومیت نہ تنگ نظر ہے، نہ جارحانہ، نہ تخریبی، وہ صحت مند ہے، مذہبی ہے اور اسی وجہ سے انسان دوست ہے، پہلے ہندوستان جینا تو سیکھے تب وہ جا کر وہ اس قابل ہوگا۔ کہ دوسروں کی خاطر جان دے سکے۔ (۱۶)

میں نہیں چاہتا کہ انگلستان کی شکست یا ذلت ہو، مجھے سینٹ پال کے بڑے گرجا کی ٹوٹ پھوٹ کی خبر سے اتنا ہی دکھ ہوتا ہے۔ جتنا یہ سُن کر ہوتا ہے کہ کاشی میں وشوناتھ مندر کو یا دلّی میں جامع مسجد کو نقصان پہنچا۔ میں وشوناتھ، یا جامع مسجد یا سینٹ پال گرجا کو بچانے کے لیے اپنی جان دینے کو تیار ہوں۔ لیکن کسی دوسرے کی جان لینے کو تیار نہیں ہوں، یہی

بنیادی اختلاف ہے۔ میرے اور برطانوی قوم کے درمیان۔ پھر بھی میری ہمدردی اُن کے ساتھ ہے۔ اس کے بارے میں انگریزوں۔ کاتھولیکوں اور اُن سب لوگوں کو جن تک میری آواز پہنچتی ہے۔ کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ اُس کی یہ وجہ نہیں کہ مجھے انگریزوں سے محبت ہے اور جرمنوں سے نفرت ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ جرمن بہ حیثیت قوم کے انگریزوں سے بُرے ہیں۔ یا اطالوی اُن سے بُرے ہیں۔ ہم ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ایک ہی وسیع انسانی خاندان کے افراد ہیں۔ میں ایک دوسرے میں کوئی امتیاز کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ میں یہ دعوے نہیں کرتا کہ ہندوستانی دوسروں سے بہتر ہیں۔ ہم سب میں ایک سی خوبیاں ہیں اور ایک سے عیب ہیں۔ انسانیت الگ الگ حصار بند قطعوں میں بٹی ہوئی نہیں ہے کہ ایک سے دوسرے میں جانا ناممکن ہو۔ لوگ ہزار کمروں میں رہتے ہوں مگر سب ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ "جو کچھ ہے' ہندوستان ہے باقی دُنیا کو مرنے دو۔" یہ میرا پیغام نہیں ہے۔ مانا کہ ہندوستان سب کچھ ہے' مگر اس شرط پر کہ اُس کے ساتھ باقی دُنیا کا بھی بھلا ہو۔ میں ہندوستان کی اور اُس کی آزادی کی حفاظت صرف اُسی وقت کرسکتا ہوں جب میں سارے انسانی کُنبے کا بھلا چاہوں نہ کہ صرف اُس کُنبے کا جو دُنیا کے اِس چھوٹے سے حصے میں جو ہندوستان کہلاتا ہے۔ بستا ہے۔ وہ بہت سی چھوٹی چھوٹی قوموں سے بڑا ہی' مگر اِس وسیع دُنیا کا ئنات کے اندر آ کیا سکتی ہے۔ (۱۷)

دائمی امن کے امکان کا یقین کرنا اِس بات سے انکار کرنا ہے کہ انسانی فطرت میں الوہیت کا پرتو موجود ہے اُس کے لیے جو طریقے اب تک اختیار کیے گئے' وہ اِس وجہ سے ناکام ہوئے کہ اُس کی کوشش کرنے والوں میں بنیادی خلوص کی کمی تھی۔ گو اُن کو اِس کمی کا احساس نہ تھا۔ امن اِس سے حاصل نہیں ہوتا کہ جو شرطیں اس کے لیے ضروری ہیں' وہ صرف جزوی طور پر پوری کردی جائیں۔ اِسی طرح جیسے کوئی کیمیائی مرکب اُس وقت

تک تیار نہیں ہوتا۔ جب تک اُس کے سب لوازم مہیا نہ ہوں، اگر دُنیا کے مانے ہوئے لیڈر جن کے قبضے میں ہلاکت کے آلات ہیں، اُن کے استعمال کو سارے عواقب و نتائج پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد ترک کر دیں تو دائمی امن حاصل ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک دُنیا کی بڑی طاقتیں اپنے سامراجی منصوبوں سے دست بردار نہ ہو جائیں اور یہ خود ایک امرِ محال ہے۔ جب تک بڑی بڑی قوتیں باہمی مقابلے کی جو روح کے لیے مہلک ہے، قائل رہیں گی اور اُن کی یہ خواہش باقی رہے گی کہ اپنی ضرورتوں کو بڑھاتی رہیں۔ اور اُن کو پورا کرنے کے لیے اپنی مادی املاک میں اضافہ کرتی رہیں۔ (۱۸)

میرا یقیناً یہ خیال ہے کہ اہنسا کا اصول ریاستوں کے باہمی تعلقات پر بھی عائد ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ پچھلی لڑائی کا ذکر کرنا دُکھتی رگ کو چھیڑنا ہے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے یہ کرنا ہی پڑے گا۔ یہ جنگ جہاں تک میں نے اسے سمجھا ہے فریقین کی طرف سے طلب منفعت کی لڑائی تھی۔ یہ کمزور قوموں کے استحصال سے جسے نرم الفاظ میں عالمی تجارت کہا جاتا ہے، حاصل ہونے والی دولت کی تقسیم کی لڑائی تھی...... آپ دیکھیں گے کہ قبل اس کے کہ یورپ میں عام ترکِ اسلحہ شروع ہوا، جو ایک دن ہونا ضروری ہے بجز اس کے کہ سارا یورپ خودکشی پر کمر باندھ لے، کسی قوم کو یہ جسارت کرنی پڑے گی کہ اپنے آپ کو سب سے بڑی جوکھم میں ڈال کر ترکِ اسلحہ کرے۔ اگر خوش قسمتی سے کسی قوم نے ایسا کیا۔ تو وہ اہنسا کے اتنے بڑے اونچے درجے پر پہنچ چکی ہوگی۔ کہ ساری دُنیا اُس کی عزت کرے گی۔ اُس کی رائے صائب ہوگی۔ اُس کے فیصلے محکم ہوں گے، اُس میں قربانی کی حیرت انگیز صلاحیت ہوگی۔ اور اُس کی زندگی جتنی اپنی بھلائی کے لیے وقف ہوگی، اتنی ہی دوسری قوموں کے لیے بھی۔ (۱۹)

ایک بات یقینی ہے کہ اسلحہ بندی کا جنونانہ مقابلہ اسی طرح جاری رہا تو دُنیا میں ایسی خونریزی ہوگی۔ جیسی تاریخ میں آج تک نہیں ہوئی۔ اگر فاتحوں میں سے کوئی قوم زندہ بچ رہی

تو اس کی فتح خود اس کے لیے جیتی جاگتی موت ہوگی۔ اِس تباہی سے جو سر پر منڈلا رہی ہے بچنے کی کوئی صورت نہیں، سوا اس کے کہ ہمت سے کام لے کر غیر مشروط طور پر اہنسا کا طریقہ مع اس کے سارے لوازم کے اختیار کر لیا جائے۔ (۲۰)

اگر دُنیا میں لالچ نہ ہوتا تو اسلحہ بندی کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ اہنسا کے اصول کا تقاضا ہے کہ انسان ہر قسم کے استحصال سے باز رہے۔ (۲۱)

جیسے ہی استحصال کا خیال ختم ہو جائے گا اسلحہ بندی ایک ناقابل برداشت بوجھ معلوم ہونے لگے گی۔ حقیقی ترک اسلحہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ دُنیا کی قومیں ایک دوسرے کا استحصال ترک نہ کردیں۔ (۲۲)

اگر ساری دُنیا مل کر ایک نہ ہوگئی تو میں ایسی دُنیا میں رہنا پسند نہ کروں گا۔ (۲۳)

ساتواں باب

انسان اور مشین

مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں معاشیات اور اخلاقیات میں کوئی خط فاصل نہیں کھینچتا اور کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ جو معاشیات کسی فرد یا قوم کی اخلاقی فلاح کو نقصان پہنچائے وہ منافی اخلاق ہے اور اس بنا پر آلودۂ گناہ ہے۔ چنانچہ جو معاشیات ایک قوم کو دوسری قوم کے استحصال کی اجازت دے وہ سراسر خلاف اخلاق ہے۔ (1)

جو مقصد ہمارے پیش نظر ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو راحت و مسرت اور اس کے ساتھ ساتھ مکمل ذہنی اور اخلاقی نشوونما حاصل ہو سکے۔ میں "اخلاقی" کا اسم صفت روحانی کے مترادف کے طور پر استعمال کرتا ہوں، یہ مقصد لامرکزیت سے حاصل ہو سکتا ہے، مرکزیت کا نظام سماج کے اہنسا تمک ڈھانچے کے ساتھ نہیں کھپ سکتا۔ (2)

میری یہ قطعی رائے ہے کہ دنیا میں جو بحران پایا جاتا ہے، اس کا ذمہ دار بڑے پیمانہ پر مال تیار کرنے کا خبط ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجیے کہ مشینیں انسان کی ضرورت

کی سب چیزیں فراہم کر سکتی ہیں تب بھی مال کی پیدائش تو خاص خاص رقبوں میں مجتمع ہو جائے گی اور اُس کی تقسیم ایک ضابطے کے ماتحت کرنے میں پیچیدہ طریقے اختیار کرنے پڑیں گے، برخلاف اس کے اگر ہر مال کی پیدائش اور تقسیم دونوں اسی رقبے میں ہوں جہاں اس کی ضرورت ہے تو تقسیم خود بخود ضابطے کے اندر ہوگی۔ دھوکا دھڑی کی بہت کم گنجائش ہوگی اور سٹہ بازی کی تو بالکل ہی نہیں ہوگی۔

بڑے پیمانے کی پیدائش میں، صارف کی واقعی ضرورت کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا، اگر بڑے پیمانے کی پیدائش بجائے خود اچھی چیز ہوتی تو اُس میں یہ گنجائش ہوتی کہ جتنا چاہتے بڑھاتے چلے جاتے۔ مگر یہ بات قطعی طور پر ثابت کی جا چکی ہے کہ یہ خود اپنے اوپر کچھ قیود اور حدود عائد کرتی ہے۔ اگر سب ملک بڑے پیمانے کی پیدائش کا نظام اختیار کر لیں تو اتنا بڑا بازار کہاں سے آئے گا جس میں اُن سب کا مال کھپ جائے۔ تب یہ بڑے پیمانے کی پیدائش خود بخود بند ہو جائے گی۔ (۴)

میں اس بات کو نہیں مانتا کہ صنعتی نظام کسی حالت میں بھی کسی ملک کے لیے ضروری ہے اور ہندوستان میں تو اُس کی ضرورت بالکل نہیں ہے۔ در اصل میرا یہ عقیدہ ہے کہ آزاد ہندوستان اُس فرض کو جو اُس پر دُکھ کے بوجھ میں دبی ہوئی دُنیا کی طرف سے عائد ہوتا ہے، صرف اسی طرح ادا کر سکتا ہے کہ ایک سادہ اور شریفانہ زندگی گزارے، اپنی ہزارہا جھونپڑیوں کی حالت سدھارنے کی کوشش کرے اور دُنیا کے ساتھ صلح و آشتی رکھے۔ اونچے خیالات اس پیچیدہ مادی زندگی اور ہر وقت کی بھاگ دوڑ کے ساتھ، جس میں دولت پرستی نے مبتلا کر رکھا ہے نہیں کھپ سکتے۔ زندگی کی ساری خوبیاں اور لطافتیں اُسی وقت حاصل ہو سکتی ہیں جب ہم شرافت سے زندگی بسر کرنے کا فن سیکھ لیں۔

ممکن ہے کہ خطرناک زندگی بسر کرنے میں ایک اہتزازی کیفیت ہو، مگر ہمیں اس فرق کو سمجھنا چاہیے جو خطروں کا سامنا کرتے ہوئے زندگی بسر کرنے اور خطرناک زندگی بسر

کرنے میں ہے۔ جو شخص ایک جنگل میں، جہاں وحشی درندوں اور اُن سے بھی زیادہ وحشی انسانوں کا ہجوم ہو، بغیر کسی ہتھیار کے محض خدا کے سہارے رہتا ہو۔ وہ خطروں کا سامنا کرتے ہوئے بسر کرتا ہے۔ جو شخص آدھر میں لٹکا رہتا ہے اور وہاں سے زمین پر کودتا ہے کہ تماشائیوں کا مجمع اُس کے کرتب دیکھ کر داد دے وہ خطرناک زندگی گزارتا ہے۔ اُن میں سے پہلی با مقصد اور دوسری بے مقصد زندگی ہے۔ (۵)

آخر دُنیا میں موجودہ ابتری کا سبب کیا ہے؟ استحصال! میں یہ نہیں کہوں گا کہ کمزور قوموں کا استحصال طاقتور قوموں کے ہاتھوں، بلکہ بعض قوموں کا اپنی ہم چشم قوموں کے ہاتھوں۔ میرا بنیادی اعتراض مشینوں پر یہ ہے کہ ان قوموں کو دوسری قوموں کا استحصال کرنے کی طاقت مشینوں ہی نے دی ہے۔ (۵)

اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اِس نظام کو آج ہی ختم کر دیتا۔ مجھے مہلک سے مہلک ہتھیاروں کو استعمال کرنے میں بھی تامل نہ ہوتا۔ بہ شرطے کہ مجھے یقین ہوتا کہ وہ اس کا خاتمہ کر دیں گے۔ مگر میں یہ اِس وجہ سے نہیں کرتا کہ ان ہتھیاروں کا استعمال بُرے نظام کے چلانے والوں کو تو ہلاک کر دے گا، مگر خود اِس نظام کو اور بھی پائدار اور مضبوط بنا دے گا۔ جو لوگ عملِ بد کے بُرے طریقوں کو ختم کرنے کے بجائے انسانوں کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں وہ آگے چل کر ان ہی طریقوں کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اور خود اُن لوگوں سے بھی جن کو اُنہوں نے ہلاک کیا ہے بدتر ہو جاتے ہیں۔ اِس دھوکے میں کہ انسانوں کے ساتھ اُن کے طریقے بھی ختم ہو گئے۔ (۷)

مشین کی بھی ایک جگہ ہے، وہ اب قدم جما چکی ہے۔ مگر یہ نہ ہونا چاہیے کہ وہ ضروری انسانی محنت کی جگہ لے لے۔ بہتر قسم کا جدید ہل اچھی چیز ہے۔ لیکن بفرضِ محال ایک شخص ایسی مشین ایجاد کرے جس سے سارے ہندوستان کی زمین جوت ڈالے اور ساری زراعتی پیداوار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اب اگر کروڑوں کسانوں کے لیے

کوئی اور شغل نہ ہو تو وہ فاقوں مریں گے۔ اور بے کار بیٹھے بیٹھے اُن کے دماغ گھٹل ہو جائیں جیسے کہ بہتوں کے پہلے ہی ہو گئے اور ہر وقت یہی خطرہ ہے کہ اور بہت سے لوگوں کی یہی درگت ہو گی۔

میں دستکاری کے آلات میں ہر اصلاح کا خیر مقدم کرونگا۔ مگر میں اُسے مجرمانہ فعل سمجھتا ہوں کہ ہاتھ کی کتائی کے بجائے بجلی کی تکلوں سے کام لیا جائے جب تک کہ اُس کے ساتھ کروڑوں کسانوں کو کوئی اور کام اپنے گھر پر کرنے کے لیے نہ فراہم کیا جائے۔ (۸)

میں جس چیز کے خلاف ہوں وہ مشینیں نہیں ہیں، بلکہ مشینوں کا خبط ہے۔ خبط یہ ہے۔ کہ ایسی مشینیں بنائی جائیں جو "محنت کو بچانے والی" کہلاتی ہیں۔ لوگ ہیں کہ "محنت بچانے" پہ زور دئے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ہزاروں آدمی بے روزگار ہو جاتے ہیں اور سڑکوں پر پڑے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہیں میں بھی محنت بچانا چاہتا ہوں مگر نوع انسانی کے ایک چھوٹے سے حصے کی نہیں، بلکہ کل انسانوں کی، میں یہ نہیں چاہتا کہ دولت چند آدمیوں کے ہاتھوں میں اکٹھی ہو جائے۔ بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ سب کے پاس رہے آج مشینیں صرف اس کام آتی ہیں کہ مٹھی بھر آدمیوں کو لاکھوں کی گردن پر سوار ہونے میں مدد دیں۔ اُن کے پیچھے جو محرک ہے وہ انسان دوستی کی خاطر محنت بچانا نہیں ہے، بلکہ لالچ ہے۔ یہ نظام ہے جس کے خلاف میں اپنی ساری قوت سے لڑنا چاہتا ہوں۔

ہم کو جس کا سب سے زیادہ خیال کرنا ہے وہ انسان ہے مشین کا رجحان اس طرف نہیں ہونا چاہیے کہ انسان کے ہاتھ پاؤں کو شل کر دے۔ مثال کے طور پر میں آپ کو عام روش میں استثنا کی بعض معقول صورتیں بتاتا ہوں، آپ سنگر کی مشین کو لے لیجیے۔ یہ اُن محدود سے چند مفید چیزوں میں سے ہے جو آج تک ایجاد ہوئی ہیں اور اس کے ساتھ ایک رومان نہ البتہ ہے۔ سنگر نے دیکھا کہ اس کی بیوی اپنے ہاتھ سے سینے اور

تجربہ کرنے کی مشقت اٹھا رہی ہے۔ محض اس کی محبت میں اس نے سینے کی مشین ایجاد کی تاکہ اسے غیر ضروری محنت سے بچائے۔ لیکن اس نے نہ صرف اپنی بیوی کی محنت بچائی۔ بلکہ ہر اس شخص کی جو سینے کی مشین خریدنے کا مقدور رکھتا ہوں۔ میں جو چیز چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مزدوروں کی حالت بدلے ان کو نہ صرف گذر بسر کے لائق اجرت ملے بلکہ روز مرہ کا کام ایسا ہو جس سے جی نہ اکتائے، ایسی حالت میں مشین مزدور کے لیے اتنی ہی مفید ہو گی جتنی ریاست کے لئے یا مشین کے مالک کے لیئے۔ موجودہ مجنونانہ دوڑ بھاگ ختم ہو جائے گی اور مزدور (جیسا کہ میں نے کہا) عمدہ اور خوشگوار حالات میں کام کرے گا۔ یہ ان مستثنیٰ صورتوں میں سے جو میرے ذہن میں ہیں، صرف ایک ہے۔ سینے کی مشین کے پیچھے محبت کا تصور تھا۔ سب سے بڑھ کر جس کا خیال کرنا ہے وہ انسان ہے۔ ہمارا اصل مقصد ہونا چاہیے افراد کی محنت بچانا۔ اور اس کا محرک لالچ نہ ہو، بلکہ انسان دوستی ہو۔ لالچ کو ہٹا کر اس کی جگہ محبت کو دیدو۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ (۹)

ہاتھ کی کتائی کی خاطر کسی ایک صحت مند نفع بخش صنعت کو بھی چھوڑنے کا مشورہ دینا تو در کنار میں نے کبھی اس کا خیال تک نہیں کیا۔ چرخے کی ساری بنیاد ہی اس پر قائم ہے کہ ہندوستان میں کروڑوں آدمی جزوی طور پر مشغول رہتے ہیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ اگر ایسے لوگ نہ ہوتے تو چرخے کیلیئے کوئی گنجائش نہ ہوتی۔ (۱۱)

ایک فاقہ کش کو سب سے پہلے اپنا پیٹ بھرنے کی فکر ہوتی ہے، وہ اپنی آزادی کیا سبھی کچھ ایک لوٹی کے نوالے کے بدلے بیچنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کے کروڑوں آدمیوں کا یہی حال ہے، ان کے لیے آزادی، خدا اور اس قسم کے اور سب الفاظ محض حروف کے مجموعے ہیں جن کے کچھ معنی نہیں۔ اگر ہم لوگ ان میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے ایسا کام فراہم کرنا ہوگا جسے وہ اپنے اجڑے گھروں میں بیٹھ کر آسانی

سے انجام دے سکیں اور اُس سے قوت لاہموت حاصل کر سکیں۔ یہ صرف چرخے کے ذریعے سے ہو سکتا ہے۔ اور جب اُنھیں اپنے اوپر بھروسا ہو جائے اور اپنی روزی آپ پیدا کرنے لگیں تب ہم ان سے آزادی، کانگریس وغیرہ کے بارے میں بات چیت کر سکتے ہیں۔ اِس لیے جو لوگ اُنہیں کام دینگے جسکے ذریعہ روٹی کا ٹکڑا حاصل کر سکیں وہی اُنکے نجات دہندہ ہوں گے اور وہی اُن میں آزادی کی بھوک پیدا کر سکیں گے۔ (۱۲)

شہر کے رہنے والوں کو کیا خبر کہ ہندوستان کے نیم فاقہ کش عوام کس طرح سسک رہے ہیں۔ وہ کیا جانیں کہ اُن کی یہ کمبخت فارغ البالی، دلالی کے پیسے سے ہے جو وہ بدیسی نفع خوروں کا کام کر کے کماتے ہیں۔ اور یہ سارا منافع اور دلالی غریبوں کا خون چوس کر حاصل کی جاتی ہے۔ اُنہیں کیا معلوم کہ برطانوی ہند میں جو حکومت از روئے قانون قائم ہے وہ عوام کے استحصال کے لئے چلائی جاتی ہے۔

جو شہادت بہت سے گانوؤں میں ہڈیوں کے ڈھیر ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کرتے ہیں، اُس کی تاویل فلسفیوں کی کسی دلیل، شعبدہ بازوں کی کسی بازیگری سے نہیں ہو سکتی۔ مجھے اِس میں مطلق شبہ نہیں کہ اگر ہمارے سر پر کوئی خدا ہے تو انگلستان کو بھی اور ہندوستان کے شہروں میں رہنے والے لوگوں کو بھی انسانیت کے خلاف اِس جرم کی جواب دہی کرنی پڑے گی۔ جس کی تاریخ میں شاید ہی کوئی مثال ہو۔ (۱۳)

میں پیچیدہ سے پیچیدہ مشین کی حمایت کروں گا۔ اگر اُس سے ہندوستان کی کنگالی اور اُس سے پیدا ہونے والی کاہلی دور ہو جائے میں نے ہاتھ کی کتائی کو رائج کرنے کی تجویز اِس لیے کی ہے کہ یہی ایک فوری طریقہ ہے جو افلاس کو دور کر سکتا ہے۔ اور کام کے قحط کا سدّ باب کر سکتا ہے چرخہ خود ایک قابل قدر مشین ہے۔ اور میں نے اپنی بساط کے مطابق اس میں ہندوستان کے خاص

حالات کے لحاظ سے کچھ اصلاح اور ترمیم کی ہے۔(۱۴)

میں یہ کہوں گا کہ اگر گاؤں ڈوبا تو ہندوستان ڈوب جائے گا۔ پھر ہندوستان، ہندوستان نہیں رہے گا۔ اُس کا دُنیا میں جو مشن ہے وہ غارت ہو جائے گا۔ گاؤں کی حالت تبھی سدھر سکتی ہے جب اُس کا استحصال موقوف ہو جائے۔ بڑے پیمانے کی صنعتوں کا لازمی نتیجہ گاؤں کا کھلا یا چھپا استحصال ہوگا۔ اِس لیے کہ مال کے لیے بازار تلاش کرنے کے مسائل پیدا ہونگے اس لیے ہمیں اِسی پر زور دینا چاہیے کہ گاؤں خود کفیل ہو۔ اور جو کچھ پیدا کرے وہ محض اپنے استعمال کے لیے۔ اگر دیہی صنعت کی یہ خصوصیت قائم رہے تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ گاؤں کے لوگ جدید مشینیں اور اوزار جو وہ خود بنا سکیں اور جن سے استعمال کی مقدرت رکھتے ہوں استعمال کریں۔ بس یہ شرط ہے کہ اُن سے دوسروں کے استحصال کا کام نہ لیا جائے۔ (۱۵)

آٹھواں باب

افراط میں افلاس

وہ چھوٹی معاشیات ہے جو اخلاقی اقدار کو نظرانداز کر دے۔ اہنسا کے قانون کو معاشیات پر عائد کرتے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ بین الاقوامی تجارت کے نظم و ضبط میں اخلاقی اقدار کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ (۱)

میرے خیال میں ہندوستان کا' اور ہندوستان ہی پر کیا موقوف ہے ساری دُنیا کا معاشی آئین ایسا ہونا چاہیے کہ اُس کے ماتحت کوئی شخص روٹی کپڑے کا محتاج نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں ہر شخص کو اتنا کام ملنا چاہیے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنا ضروری خرچ پورا کر لے اور یہ نصب العین ساری دُنیا میں اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ان چیزوں کی جو زندگی کی بنیادی ضرورتوں میں داخل ہیں' پیدائش عوام کے نظم و ضبط میں ہو۔ یہ چیزیں لوگوں کو اسی طرح آسانی سے مل جائیں جیسے خدا کی دین پانی اور ہوا آسانی سے ملتی ہے اور ملنی چاہیے۔ اُن کو لوگوں کے استحصال کے لئے مالِ تجارت نہیں بننے دینا چاہیے۔

امن پر کسی ملک، قوم، یا گروہ کا بلاشرکت غیرے تصرف ہونا بے انصافی ہے۔ اس سیدھے سادھے اصول کو نظرانداز کرنا اس عام افلاس کا باعث ہے جو ہمیں نہ صرف اس بدنصیب ملک میں بلکہ دُنیا کے اور حصوں میں بھی نظر آتا ہے۔ (۲)

میرا نصب العین تو مساوی تقسیم ہے۔ مگر جہاں تک میں اندازہ کرسکتا ہوں یہ حاصل نہیں ہونے کا۔ لہٰذا میں منصفانہ تقسیم کے لیے کوشش کرتا ہوں۔ (۳)

خلق خدا کی محبت اور کسی چیز کی بلاشرکت غیرے ملکیت کبھی ایک دوسرے کے ساتھ کھپ نہیں سکتے۔ نظری حیثیت سے کامل محبت کا تقاضا ہے کامل ترکِ املاک ہمارا جسم ہماری آخری ملک ہے۔ اِس لیے انسان کامل محبت اور کامل ترکِ ملکیت تبھی کرسکتا ہے۔ جب وہ خدمتِ خلق کی خاطر موت کو گلے لگالے اور جسم کو ترک کرنے پر تیار رہو۔

مگر یہ بات محض نظری طور پر صحیح ہے۔ واقعی زندگی میں ہم کبھی کامل محبت نہیں کرسکتے۔ اِس لیے کہ جسم کی ملکیت تو ہمارے ساتھ ہمیشہ لگی رہے گی۔ انسان ہمیشہ ناقص رہے گا اور اُس کا ہمیشہ یہ فرض گا کہ کامل بننے کی کوشش کرتا رہے۔ چنانچہ جب تک ہم زندہ ہیں کامل محبت یا کامل ترکِ املاک ایک ناممکن الحصول نصب العین رہے گا۔ مگر ہم کو برابر اُسے حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہنا چاہیئے۔ (۴)

میرا خیال ہے ہم سب ایک طرح سے چور ہیں۔ اگر میں کوئی چیز جس کی مجھے فوراً ضرورت نہیں، لے کر رکھ لوں تو میں اُسے کسی اور شخص سے چُرا رہا ہوں، میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ یہ ایک بنیادی قانونِ قدرت ہے۔ جس میں کوئی استثنا نہیں کہ قدرت ہماری روزمرہ ضرورتوں کے لیے کافی پیدا کرتی رہتی ہے، اگر ہر شخص اتنا ہی لے جتنے کی اُسے ضرورت ہے، اُس سے زیادہ نہ لے تو دُنیا میں کہیں محتاجی نہ رہے، دُنیا میں کوئی

شخص بھوکا نہ رہے۔ مگر جب تک یہ عدم مساوات باقی ہے، اُس وقت تک ہم چوری کر رہے ہیں۔ میں سوشلسٹ نہیں ہوں اور صاحبانِ املاک کی املاک چھیننا نہیں چاہتا مگر میں ضرور کہوں گا کہ ہم میں سے جو لوگ اندھیرے میں روشنی دیکھنا چاہتے ہیں اُنہیں ذاتی طور پر اس اصول پر عمل کرنا چاہیے۔ میں کسی شخص کو زبردستی اُس کی املاک سے محروم کرنا نہیں چاہتا۔ اگر ایسا کروں تو یہ اہنسا کے اصول سے انحراف ہوگا۔ مگر جہاں تک میری اپنی زندگی سے ضبط و نظم کا تعلق ہے میں بے شک یہ کہتا ہوں کہ مجھے کوئی ایسی چیز جس کی مجھے ضرورت نہ ہو اپنے تصرف میں رکھنے کی جسارت نہیں کرنی چاہیے۔ ہندوستان میں تیس لاکھ آدمیوں کو ایک وقت کھا کر گزر کرنی پڑتی ہے اور وہ کھاتے کیا ہیں۔ ایک چپاتی جس میں چکنائی کا نام نہیں ہوتا۔ اور چٹکی بھر نمک۔ ہم کو اور آپ کو اس املاک پر بھی جو ہمارے پاس ہے۔ اُس وقت تک کوئی حق نہیں جب تک ان تیس لاکھ آدمیوں کے لئے کھانے کپڑے کا اِس سے بہتر انتظام نہ ہو۔ ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا بہتر احساس ہونا چاہیے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی ضرورتوں کو قابو میں رکھیں، یہاں تک کہ اپنی خوشی سے فاقہ کریں تاکہ اُن لوگوں کی مناسب دیکھ بھال ہو سکے اور انھیں کھانا کپڑا مل سکے۔ (۵)

ترکِ املاک کا چوری نہ کرنے سے گہرا تعلق ہے۔ وہ چیز بھی جو ہم نے چُرائی نہیں ہے مگر بلا ضرورت اپنے پاس رکھ چھوڑی ہے، چوری کے زمرے میں آجاتی ہے۔ کسی چیز کو اپنی مِلک کے طور پر رکھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمیں آئندہ کی فکر ہے مگر حق کے طالب اور قانونِ محبت کے پیرو کو تو کوئی چیز اِس خیال سے رکھنی ہی نہیں چاہیے کہ کل کام آئے گی۔ خدا کبھی کل کے لیے ذخیرہ نہیں رکھتا، وہ اِس سے زیادہ پیدا ہی نہیں کرتا، جتنا فوری ضرورت کے لیے درکار ہے۔ اِس لیے اگر ہم اُس کی ربوبیت پر ایمان رکھتے ہیں تو ہمیں مطمئن رہنا چاہیے کہ ہر وہ چیز جس کی ہمیں ضرورت ہے ہمارے لیے مہیا کر دے گا۔ اُن سنتوں اور بھگتوں کو جنہوں نے اِس عقیدے کے مطابق زندگی بسر کی

ہمیشہ اپنے تجربے سے اُس کی تصدیق ہوئی۔ چونکہ لوگ اُس قانون الٰہی سے جس کی رو سے ہر شخص کو صرف یہ حق ہے کہ اُسے روز کھانے بھر کو مل جائے، اس سے زیادہ نہیں، واقف نہیں تھے، یا اُسے نظرانداز کرتے تھے اسی لیے یہ عدم مساوات اور اُس کے ساتھ دُنیا بھر کی مصیبتیں پیدا ہوگئیں۔ ایک طرف امیروں کے پاس چیزوں کا فاضل ذخیرہ ہے جس کی اُنھیں ضرورت نہیں اس لیے اُس کی دیکھ بھال نہیں ہوتی۔ اور وہ ضائع ہو جاتا ہے دوسری طرف لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو کھانے کو روٹی نہیں ملتی اور وہ فاقوں سے مرتے ہیں۔ اگر ہر شخص اپنے پاس صرف اتنا ہی رکھے جتنے کی اُسے ضرورت ہے۔ تو کوئی محتاج نہ رہے۔ اور سب اطمینان سے بسر کریں۔ مگر موجودہ حالات میں غریب ہی نہیں، امیر بھی غیر مطمئن ہیں۔ غریب کو امیر ہونے کی لگن ہے۔ اور امیر کو کروڑپتی ہونے کی۔ امیروں کو چاہیے کہ خود ترک املاک کا اقدام کریں۔ تاکہ سب لوگ چین سے رہ سکیں۔ اگر وہ صرف اتنا کریں کہ اپنی املاک کو مناسب حدود کے اندر رکھیں تو غریبوں کو آسانی سے روزی میسر آجائے اور وہ بھی امیروں کے ساتھ قناعت کا سبق سیکھ لیں۔ (۶)

معاشی مساوات بے تشدد آزادی کی کنجی ہے۔ معاشی مساوات قائم کرنے کے معنی ہیں سرمایہ و محنت کی دائمی کشمکش کو ختم کر دینا۔ اس کے معنی ہیں ایک طرف ان مٹھی بھر امیروں کی، جن کے پاس قومی دولت کا بڑا حصہ اکٹھا ہو گیا ہے، معاشی سطح کو نیچا کرنا اور دوسری طرف کروڑوں، نیم فاقہ کش، ننگے غریبوں کی سطح کو اونچا کرنا۔ بے تشدد نظام حکومت کا قائم ہونا، اس وقت تک ناممکن ہے۔ جب تک امیروں اور بھوکے غریبوں میں یہ زبردست خلیج حائل ہے۔ نئی دہلی کے محلوں اور مزدوروں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں یہ تفاوت آزاد ہندوستان میں جہاں غریبوں کو وہی طاقت حاصل ہوگی جو بڑے سے بڑے امیروں کو، ایک دن کے لیے بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اگر لوگوں نے اپنی مرضی سے دولت کو اور اس طاقت کو جو دولت سے حاصل ہوتی ہے، نہ چھوڑا اور اُس میں فلاح عامہ کی خاطر

سب کو حصہ دار نہ بنایا تو ایک پُر تشدد خونریز انقلاب کا آنا یقینی ہے ۔ میرے امانت کے نظریے کا بہت مضحکہ اُڑایا گیا ہے ۔ مگر اس کے باوجود میں اب بھی اس پر قائم ہوں ۔ یہ سچ ہے کہ اس پر عمل کرنا مشکل ہے مگر اہنسا بھی کوئی آسان چیز نہیں ۔(۷)

مساوی تقسیم کے معنی دراصل یہ ہیں کہ ہر شخص کو اتنا ملے جو اس کی قدرتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کافی ہے ۔ اس سے زیادہ نہ ملے مثلاً اگر ایک شخص کا ہاضمہ کمزور ہے اور اسے روٹی کے صرف آدھ پاؤ آٹے کی حاجت ہے اور ایک اور شخص کو آدھ سیر آٹا چاہیے تو دونوں کو اُن کی ضرورت بھر کا ملنا چاہیے ۔ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے سارے سماجی نظام کی از سرِ نو تشکیل کرنی ہوگی ، جو سماج اہنسا پر مبنی ہو وہ اس کے سوا کسی اور نصب العین کو اختیار نہیں کر سکتا ۔ ممکن ہے ہم اس منزل تک نہ پہنچ سکیں ، مگر ہمیں چاہیے کہ اسے ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں اور برابر اُس کی طرف قدم بڑھاتے رہیں ۔ جتنا ہم اپنی منزل کی طرف بڑھیں گے ۔ اتنا ہی ہمیں خوشی اور اطمینان حاصل ہوگا ۔ اور اتنا ہی بے تشدد سماج کے بنانے میں ہمارا حصہ ہوگا ۔

آیئے ! یہ سوچیں کہ مساوی تقسیم اہنسا کے ذریعہ کیوں کر ہو سکتی ہے ؟ اُس شخص کے لیے جس نے اس نصب العین کو دل و جان سے قبول کیا ہے ، اُس سمت میں پہلا قدم یہ ہوگا ۔ کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں ضروری تبدیلیاں کرے ، وہ ہندوستان کے افلاس کو نظر میں رکھتے ہوئے اپنی ضرورتوں کو گھٹا کر کم سے کم کر دے گا ۔ اُس کی کمائی حلال کی ہوگی ۔ وہ سٹہ بازی کا خیال چھوڑ دے گا ۔ اُس کا رہن سہن نئے طرز کی زندگی کے مطابق ہوگا ۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں ضبطِ نفس سے کام لے گا ۔ جب وہ اپنی زندگی میں ہر ممکن طریقے سے سدھار کرے گا ۔ تب اُسے اِس کا حق ہوگا کہ اپنے ساتھیوں اور پڑوسیوں میں اُس نصب العین کا پرچار کرے ۔

دراصل مساوی تقسیم دولت کے اِس نظریے کو اِس اصول پر مبنی ہونا چاہیے کہ امیر

اپنے آپ کو اُس دولت کا جو اُن کی ضرورت سے فاضل ہو امین سمجھیں۔ کیونکہ اِس نظریے کے مطابق اُن کو اپنے ہمسایوں سے زیادہ ایک روپیہ بھی اپنی ملکیت میں نہیں رکھنا چاہیے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس اصول کو اہنسا کے ذریعہ عمل میں لایا جائے یا امیروں سے اُن کی دولت زبردستی چھین لی جائے؟ ظاہر ہے دوسری صورت میں ہمیں تشدد سے کام لینا پڑے گا۔ اِس جبر و تشدد سے سماج کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اِس لیے کہ وہ اُن لوگوں کی قابلیت سے جو دولت پیدا کرنا جانتے ہیں محروم ہو جائے گا۔ اِس سے اہنسا کا طریقہ صریحی طور پر بہتر ہے۔ امیر اپنی دولت پر قابض رہے گا۔ اُس میں سے ایک واجبی رقم اپنی ذاتی ضرورتوں پر خرچ کرے گا۔ باقی امانت کے طور پر رکھے گا کہ سماج کے کام آئے۔ یہاں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ امانت رکھنے والا دیانتداری برتے گا۔

اور اگر ہماری انتہائی کوشش کے باوجود امیر غریبوں کے سچے سرپرست نہ بنیں۔ اور وہ بے چارے روز بروز اور زیادہ پستے اور فاقوں کا شکار ہوتے جائیں تو پھر کیا کیا جائے؟ اِس پہیلی کو بوجھنے میں سر کھپانے کے بعد مجھے ترک تعاون اور سول نافرمانی کی مناسب اور حکمی تدبیریں سوجھی ہیں۔ امیر بغیر غریبوں کے تعاون کے دولت اکٹھا نہیں کر سکتے، اگر یہ بات غریبوں کو عام طور پر معلوم ہو جائے تو اُن کی طاقت بہت بڑھ جائے گی۔ اور وہ عدم مساوات کے بھاری بوجھ سے جس نے اُنہیں اِس طرح کچلا ہے کہ فاقوں کی نوبت آگئی ہے، اہنسا کے ذریعہ نجات پانے کا طریقہ سیکھ جائیں گے۔ (۸)

میرے ذہن میں اِس سے بہتر اور قوم کے حق میں مفید کوئی چیز نہیں کہ ہم سب کچھ دیر مثلاً ایک گھنٹہ روز محنت کے وہ کام جو غریبوں کو مجبوراً کرنے پڑتے ہیں کیا کریں اور اِس طرح اُن سے اور اُن کے توسط سے ساری نوع انسان سے اپنایت پیدا کریں۔

میں خدا کی عبادت کا اِس سے بہتر کوئی طریقہ تصور نہیں کرسکتا کہ میں اُس کے نام پر غریبوں کی خاطر اسی طرح کی مشقت کروں جیسی وہ خود کرتے ہیں۔ (۹)

بائبل کہتی ہے۔" اپنے ماتھے کا پسینہ بہا کر روزی کماؤ۔" قربانی کی بہت سی قسمیں ہوسکتی ہیں، اُن میں سے ایک یہ کیوں نہ ہو کہ ہم اپنی روزی کی خاطر محنت کریں۔ اگر سب لوگ صرف اتنی ہی محنت کریں جس سے کہ اپنی روزی پیدا کریں تو سب کو کافی غذا بھی میسر آجائے اور کافی فرصت بھی، پھر نہ تو کثرتِ آبادی کی شکایت ہوگی، نہ بیماریاں ہونگی اور نہ یہ خستہ حالی ہوگی جو ہمیں ہر طرف نظر آتی ہے۔ اِس طرح کی محنت سب سے اعلیٰ قسم کی قربانی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ لوگ اور بھی بہت سے جسمانی اور ذہنی کام کریں گے۔ مگر وہ سب کے سب بلا معاوضہ محض فلاحِ عامہ کے لیئے ہوں گے۔ پھر نہ کوئی امیر ہوگا نہ غریب، نہ بلند نہ پست، نہ سورن نہ اچھوت۔ (۱۰)

ممکن ہے کوئی پوچھے "جب آپ کو اپنی روزی کمانے کے لیے محنت کرنے کی ضرورت نہیں ہے تو آپ کیوں چرخہ کاتتے ہیں؟" اِس لیے کہ میں جو روٹی کھاتا ہوں وہ میری نہیں ہے میں اپنے ہم وطنوں کو لوٹ کر زندگی بسر کر رہا ہوں۔ آپ ہر ایک پیسے کے بارے میں جو آپ کی جیب میں آتا ہے، یہ پتہ چلایئے کہ یہ کہاں کہاں سے ہوکر آیا ہے، تو آپ کو اندازہ ہوجائیگا کہ میں نے جو لکھا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے۔

مجھے ننگوں کی اِس طرح توہین نہیں کرنی چاہیے کہ اُن کو کپڑا دوں جس کی اُنہیں ضرورت نہیں، بجائے کام کے جس کی اُنہیں شدید ضرورت ہے۔ میں یہ گناہ نہ کروں گا کہ اُن کا مربی بنوں۔ میں نہ اُنہیں روٹی کے بچے کھچے ٹکڑے دوں گا، نہ پھٹے پرانے کپڑے، بلکہ یہ جاننے کے بعد کہ اُن کو افلاس میں مبتلا کرنے میں میرا بھی حصہ ہے، میں اُنہیں اپنے اچھے سے کپڑے اور اچھے سے اچھا کھانا دوں گا۔ اور اُن کے ساتھ مل کر کام کروں گا۔۔۔۔

خدا نے انسان کو اِس لیے پیدا کیا ہے کہ اپنی روزی کے لیے محنت کرنے

اور یہ کہہ دیا ہے کہ جو لوگ بغیر محنت کیئے کھاتے ہیں وہ چور ہیں۔ (۱۱)

ہمیں اُس وقت تک آرام کرتے یا پیٹ بھر کھاتے شرم آنی چاہیے۔ جب تک ہر صحیح الجسم مرد اور عورت کو کام اور ہر ایک کو روٹی نہ مل جائے۔ (۱۲)

مجھے مخصوص حقوق اور بلا شرکتِ غیرے املاک سے نفرت ہے۔ میں ہر چیز کو جس میں عام لوگوں کو حصّہ نہ مل سکے حرام سمجھتا ہوں۔ (۱۳)

لوگوں کو اختیار ہے کہ میرے ترکِ املاک کا مضحکہ اُڑائیں مجھے تو اس سے یقیناً فائدہ ہوا ہے۔ لوگ آئیں اور قناعت میں مجھ سے مقابلہ کریں۔ یہ میری سب سے بڑی دولت ہے۔ اِس لیے شاید یہ کہنا صحیح ہو کہ گو میں افلاس کا پرچار کرتا ہوں مگر خود دولت مند ہوں۔ (۱۴)

کسی نے یہ نہیں کہا ہے کہ شدید محتاجی کا نتیجہ اخلاقی پستی کے سوا کچھ اور ہو سکتا ہے ہر انسان کو اس کا حق ہے کہ زندہ رہے اور اس لئے اُس کا حق ہے کہ اُسے کھانے کو روٹی اور جہاں ضروری ہو پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان ملے مگر اِس سیدھی سی بات کے لیے ہمیں معاشیات کے ماہرین اور ان کے قوانین کی کوئی ضرورت نہیں۔

"کل کی فکر نہ کرو" وہ ہدایت ہے جو قریب قریب دُنیا کے ہر مذہب کی مقدس کتابوں میں ملتی ہے۔ ایک اچھی منظم سماج میں انسان کیلئے اپنی روزی کمانا سب سے آسان چیز ہوتی ہے اور ہونی چاہیے۔ سچ پوچھیے تو کسی ملک میں اچھی تنظیم کا معیار یہ نہیں کہ اس میں کتنے لکھ پتی کروڑ پتی ہیں، بلکہ یہ ہے کہ وہاں عام لوگ فاقوں نہ مرتے ہوں۔ (۱۵)

میری اہنسا کبھی اسے گوارا نہ کرے گی کہ ایک ہٹے کٹے آدمی کو مفت کھانا کھلاؤں جس نے اُس کا مستحق بننے کے لیے ایمانداری سے کام نہ کیا ہو۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو ہر سدا برت کو جہاں مفت کھانا ملتا ہے بند کر دیتا۔ اِس سے قوم میں گراوٹ آتی ہے اور سستی، کاہلی، ریاکاری یہاں تک کہ جرم کو بھی شہ ملتی ہے۔ (۱۶)

اپنی فطرت کے تقاضے سے ہمارا شاعر آنے والے کل کے لیے جیتا ہے۔ اچھا ہوتا ہے کہ ہم بھی یہی کریں۔ وہ ہماری مشتاق آنکھوں کو ان چڑیوں کی تصویر دکھاتا ہے۔ جو صبح تڑکے آسمان کی طرف پرواز کرتے ہوئے حمد کے ترانے گاتی ہیں۔ یہ چڑیاں وہ ہیں جو شام کو چپ چاپ تھک کر جھک چکی ہیں جن کے پنکھ سستائے ہوئے ہیں۔ جن کی رگوں میں رات بھر میں نیا خون دوڑ گیا ہے۔ مگر میں نے ان چڑیوں کو دیکھنے کا دکھ اٹھایا ہے، جو اتنی نڈھال رہتی ہیں کہ کوئی کتنا ہی چمکارے اُن سے پر بھی پھڑپھڑائے نہیں جاتے۔ بھارت کے آکاش کے نیچے وہ پکھیرو جسے انسان کہتے ہیں شام کو آرام کر کے بستر سے اٹھتا ہے تو رات سے بھی زیادہ نڈھال ہوتا ہے۔ لاکھوں کروڑوں کے لیے زندگی ایک مسلسل رات ہے جو آنکھوں میں کٹتی ہے۔ یا ایک سکتے کی کیفیت ہے جو ہمیشہ چھائی رہتی ہے۔ ایسی تکلیف وہ حالت ہے جو بیان نہیں ہو سکتی۔ میں نے یہ پایا ہے کہ بیار کا دکھ کبیر کے دوہے گا کر بہلایا نہیں جا سکتا۔ کروڑوں بھوکے ہیں۔ جو ایک ہی شعر کے طالب ہیں طاقت بخش غذا کے۔ یہ انھیں دان نہیں دی جا سکتی۔ انھیں خود کمانی ہے اور وہ صرف گاڑھا پسینہ بہا کر ہی کما سکتے ہیں (۷۰)

اب آپ خود ہی سوچیے کہ کتنی بڑی مصیبت ہے کہ کسی ملک میں ۲۰ کروڑ بے روزگار اور کم روزگار لوگ ہوں، یعنی دسیوں لاکھ روزگار نہ ملنے کی وجہ سے روز بروز پستی کے گڑھے میں گرتے جائیں۔ نہ ان میں عزتِ نفس باقی رہے اور نہ خدا پر ایمان، ان کروڑوں بھوکوں کو جن کی آنکھوں میں چمک کا نام نہیں، جو روٹی کے سوا کسی معبود کو نہیں جانتے۔ خدا کا پیام پہنچانا ایسا ہی ہے جیسے سامنے والے کتے کو۔ میں انھیں خدا کا پیام صرف اسی شکل میں پہنچا سکتا ہوں کہ ان کو کام دلاؤں۔ جو بجائے خود ایک مقدس چیز ہے جب ہم اچھا سا ناشتہ کر چکے ہوں اور اس سے بھی اچھے دوپہر کے کھانے کی راہ بڑے اشتیاق سے دیکھ رہے ہوں تب خدا کا ذکر بھی بھلا لگتا ہے۔ مگر میں ان غریبوں سے خدا کی بات کیسے کروں جنہیں دن میں دو وقت کا کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ وہ تو خدا کا تصور صرف دال روٹی کی شکل میں

کر سکتے ہیں۔ (۱۸)

فاقہ کشوں اور بے روزگاروں کے سامنے خدا کو صرف کام، مزدوری اور روٹی کے وعدے کی شکل میں آنے کی ہمت ہو سکتی ہے۔ (۱۹)

اہنسا کے طریقے سے ہم سرمایہ داری کو مٹانا چاہتے ہیں۔ سرمایہ دار کو ہم یہ دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ان لوگوں کا امین سمجھے جن کی مدد کے بغیر نہ وہ سرمایہ حاصل کر سکتا ہے نہ اسے محفوظ رکھ سکتا ہے اور نہ اس میں اضافہ کر سکتا ہے۔ اور مزدور کو سرمایہ دار کی مت بدلنے کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں اگر سرمایہ طاقت ہے تو کام بھی طاقت ہے۔ دونوں طاقتوں کا استعمال تعمیر کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور تخریب کے لیے بھی۔ دونوں ایک دوسرے کی محتاج ہیں، جیسے ہی مزدور کو اپنی طاقت کا احساس پیدا ہو جائے۔ وہ سرمایہ دار کی غلامی کرنے کے بجائے اس کا شریک بن سکتا ہے۔ اگر وہ چاہے کہ وہی اکیلا کارخانے کا مالک بن جائے۔ تو اغلب ہے کہ وہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو مار کر خالی ہاتھ رہ جائے۔ (۲۱)

ہر شخص کو پرندوں اور چوپایوں کی طرح یہ حق ہے کہ اسے اپنی ضروریات زندگی میسر ہوں۔ چونکہ ہر حق کے مقابل کوئی فرض بھی ہوتا ہے اور اس حق کو ہر حملے سے محفوظ رکھنے کے لیے کوئی تدبیر ہوتی ہے، اس لیے انسان کو اپنا بنیادی مساوات کا حق حاصل کرنے کے لیے صرف اس کی ضرورت ہے کہ وہ اس جوڑ کے کے فرائض اور حفاظتی تدبیریں معلوم کرے اس کے جوڑ کا فرض یہ ہے کہ میں اپنے ہاتھ پاؤں سے محنت کروں اور حفاظتی تدبیر یہ ہے کہ جو شخص مجھے میرے حق سے محروم رکھنا چاہے اس سے ترک تعاون کر دوں۔ اور اگر میں سرمایہ دار اور مزدور کی بنیادی مساوات کو تسلیم کرتا ہوں جو مجھے لازمی طور پر کرنی چاہیے تو مجھے سرمایہ دار کو ختم کرنے کی نہیں بلکہ اس کے خیالات کو بدلنے کی کوشش کرنی ہے۔ جب میں اس کے ساتھ ترک تعاون کروں گا۔ تو اس کی آنکھیں کھل جائیں گی اور اسے اس ناانصافی کا جو میرے

ساتھ کر رہا ہے احساس ہو جائے گا۔ (۲۲)

میں اس کا تصور نہیں کر سکتا کہ کوئی زمانہ ایسا آئے گا جب ایک شخص کے پاس دوسرے سے زیادہ دولت نہیں ہوگی۔ مگر ایسے زمانہ کا تصور ضرور کر سکتا ہوں جب امیر غریبوں کو لوٹ کر اپنا خزانہ بھرنے کو برا سمجھیں گے اور غریب اُن سے حسد کرنا چھوڑ دیں گے دُنیا کتنی ہی مکمل کیوں نہ ہو جائے ہم عدم مساوات کو بالکل ختم تو نہیں کر سکیں گے۔ مگر یہ ضرور کر سکتے ہیں اور کریں گے کہ کشمکش اور تلخی نہ پیدا ہونے دیں۔ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ غریب اور امیر کامل صلح و آشتی کے ساتھ رہتے ہیں۔ ہمیں بس اتنا کرنا ہے کہ ایسی اور بہت سی مثالیں قائم کر دیں۔ (۲۳)

میں یہ نہیں مانتا کہ سرمایہ دار اور زمیندار فطری طور پر استحصال کرنے پر مجبور ہیں۔ یا اُن کے اور عوام کے مفاد میں کوئی ایسا بنیادی تضاد ہے جسے دور نہ کیا جا سکے۔ استحصال ہمیشہ اس پر موقوف ہوتا ہے کہ جس کا استحصال کیا جائے وہ اپنی خوشی سے یا مجبوری سے اُس میں تعاون کرے۔ ہمیں اس کا اعتراف کرنا کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ اکثر لوگ لیٹرے کا حکم ماننے سے انکار کر دیں تو لوٹ ہو ہی نہیں سکتی۔ مگر جان کا خوف غالب آجاتا ہے اور ہم ان زنجیروں کو جن سے جکڑے جاتے ہیں، خود گلے لگا لیتے ہیں۔ یہ چیز ختم ہو نی چاہیے۔ ضرورت اس کی نہیں کہ زمیندار اور سرمایہ دار مٹ جائیں بلکہ اس کی ہے کہ اُن کے اور عوام کے درمیان تعلقات اخلاقی حیثیت سے بہتر اور صحت مند ہوں۔ (۲۴)

طبقاتی جنگ کا خیال میرے دل کو نہیں لگتا۔ ہندوستان میں صرف یہی نہیں کہ طبقاتی جنگ ناگزیر نہیں ہے بلکہ ہم اس سے بالکل محفوظ رہ سکتے ہیں اگر اہنسا کے پیغام کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ طبقاتی جنگ ناگزیر ہے، انہوں نے یا تو اہنسا کو بالکل نہیں سمجھا یا محض رسمی طور پر سمجھا ہے۔ (۲۵)

غریبوں کا استحصال اس سے نہیں مٹ سکتا کہ چند لکھ پتی کروڑ پتی ختم کر دیئے جائیں

بلکہ صرف اس طرح مٹ سکتا ہے کہ غریبوں کی جہالت کو دور کر کے انہیں یہ سکھایا جائے کہ اپنا استحصال کرنے والوں سے ترک تعاون کریں۔ اس سے استحصال کرنے والوں کی مت بھی بدل جائے گی۔ میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ اس کی وجہ سے ایک دن یہ دونوں کاروبار میں حصہ دار بن جائیں گے۔ سرمایہ بجائے خود کوئی بری چیز نہیں۔ اس کا غلط استعمال برا ہے سرمایہ تو کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ درکار ہوگا۔(۲۶)

اب جن لوگوں کے پاس روپیہ ہے ان کا یہ کہنا ہے کہ اپنے آپ کو غریبوں کا امین اور اپنی دولت کو ان کی امانت سمجھیں۔ ممکن ہے آپ کہیں کہ امانت تو محض ایک قانونی ڈھکوسلا ہے لیکن اگر اس کو ہر وقت دھیان میں رکھیں اور عملی طور پر برتیں تو اس دنیا میں ہماری زندگی میں محبت اس طرح رچ جائے جیسی آج نظر نہیں آتی۔ مساواتِ محض تو اقلیدس کے نقطے کی ایک مجرد تصویر ہے لیکن اگر اس کے لیے کوشش کریں تو مساوات قائم کرنے میں اتنی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں کہ کسی اور طریقے سے نہیں کر سکتے۔

کامل ترکِ املاک ایسی چیز ہے کہ معمولی حیثیت کے آدمیوں میں سے بھی بہت کم اس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ امیر طبقے سے تو ہم اتنی ہی توقع کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی دولت اور قابلیت کو ایک امانت سمجھیں اور سماج کی خدمت کے لیے استعمال کریں۔ اس سے زیادہ یہ اصرار کرنا ایسا ہوگا جیسے سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو مار ڈالنا۔(۲۸)

نواں باب

جمہوریت اور جنتا

میرا جمہوریت کا تصور یہ ہے کہ اُس کے ماتحت کمزور سے کمزور کو بھی وہی موقعے ملیں جو زیادہ سے زیادہ طاقتور کو ملتے ہیں۔ یہ صرف اہنسا ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ (۱)

میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ اگر ہم چھوٹے سے چھوٹے اور ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے ساتھ معاشی انصاف چاہتے ہیں تو تشدد کے ذریعے سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادنیٰ سے ادنیٰ لوگوں کو اہنسا کے طریقے کی تربیت دے کر اِس قابل بنایا سکتا ہے کہ جو ظلم اُن پر کیے جائیں اُن کی چارہ جوئی کریں، یہ طریقہ بے تشدد ترک تعاون کا ہے۔ بعض اوقات ترک تعاون اِسی طرح فرض ہو جاتا ہے جیسے عام حالات میں تعاون۔ کسی شخص کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اپنی بربادی یا غلامی میں دوسروں سے تعاون کرے۔ وہ آزادی جو دوسروں کی کوشش سے خواہ وہ کتنے ہی مہربان کیوں نہ ہوں۔ حاصل ہو وہ

اس کوشش کے ختم ہو جانے کے بعد قائم نہیں رہ سکتی۔ دوسرے الفاظ میں ایسی آزادی حقیقی آزادی نہیں ہے مگر ادنےٰ سے ادنےٰ لوگ بھی جب بے تشدد ترکِ تعاون کے ذریعہ آزادی حاصل کرتے کا گر سیکھ لیں تو اپنے دل میں اس کی لگن محسوس کر سکتے ہیں۔ (۳)

سول نافرمانی ایک شہری کا فطری حق ہے۔ اگر وہ اُسے چھوڑ دے تو پھر انسانیت کے درجے سے گر جائے گا۔ سول نافرمانی سے کبھی بدامنی اور انتشار نہیں ہوتا۔ پُرتشدد نافرمانی سے ہو سکتا ہے۔ ہر ریاست پُرتشدد نافرمانی کو طاقت کے ذریعے کچل دیتی ہے اگر نہ کرے تو خود ہی ختم ہو جائے۔ مگر سول نافرمانی کو کچلنا ایسا ہے جیسے ضمیر کو قید کرنے کی کوشش کرنا

سچی جمہوریت یا جنتا کا سوراج جھوٹ اور تشدد سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اُس کی وجہ ظاہر ہے۔ ایسے طریقے اختیار کرنے کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ مخالفوں کو کچل کر یا ہلاک کر کے مخالفت کو ختم کر دیا جائے گا۔ اس طرح انفرادی آزادی پنپ ہی نہیں سکتی۔ فرد کو پوری آزادی صرف اُسی وقت مل سکتی ہے جب خالص اہنسا کی حکومت ہو۔ (۴)

دُنیا میں لوگوں کا اتنی بڑی تعداد میں موجود ہونا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی بنیاد ہتھیاروں کی طاقت پر نہیں بلکہ سچائی اور محبّت کی قوت پر ہے۔ اس قوت کی کامیابی کی سب سے بڑی شہادت جسے کوئی نہیں جھٹلا سکتا، یہ ہے کہ دُنیا میں اتنی لڑائیاں ہو چکی ہیں، پھر بھی وہ زندہ سلامت موجود ہے۔

ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا وجود اس قوت کے سرگرم عمل ہوتے پر منحصر ہے۔ کروڑوں خاندانوں کے چھوٹے چھوٹے جھگڑے اُس کی آنچ سے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ سینکڑوں قومیں صلح و آشتی سے زندگی بسر کر رہی ہیں۔ تاریخ اس حقیقت کی طرف توجہ نہیں کرتی اور کر بھی نہیں سکتی۔ تاریخ در اصل ان ہی واقعات کی روداد ہے، جن سے محبت کی قوت یا روح کی قوت کے عمل میں خلل پڑتا ہے، دو بھائیوں میں لڑائی ہوتی ہے

اُن میں سے ایک بجھتا جاتا ہے اور محبت جو اس کے دل میں دبی ہوئی تھی اُبھر آتی ہے۔ اُن دونوں میں بہتر سلوک ہو جاتا ہے۔ کوئی اس واقعہ کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ لیکن اگر دونوں بھائی وکیلوں کے بھڑکانے سے یا کسی اور وجہ سے لڑیں یا مقدمہ بازی شروع کر دیں جو بہیمی قوت کے اظہار کی ایک دوسری شکل ہے ـــــ تو اُن کے نام فوراً اخباروں میں چھپ جائیں گے۔ ہمسایوں میں اُن کا چرچا ہوگا اور ممکن ہے کہ تاریخ میں اُن کا ذکر باقی رہ جائے۔ اور یہ بات صرف خاندانوں اور جماعتوں ہی پر نہیں بلکہ قوموں پر بھی صادق آتی ہے کوئی وجہ نہیں کہ خاندانوں کے لیے کچھ اور قانون ہو اور قوموں کے لیے کچھ اور ہو۔ غرض تاریخ قانونِ فطرت میں خلل پڑنے کی روداد ہے۔ روح کی قوت فطری چیز ہے اس لیے تاریخ میں اِس کا ذکر نہیں آتا۔ (۵)

حکومت خود اختیاری کا انحصار تمام تر ہماری اندرونی قوت پر اور بڑی سے بڑی مخالف قوتوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پر ہے۔ در اصل وہ خود اختیاری جسے حاصل کرنے اور قائم رکھنے کے لیے مسلسل سعی کی ضرورت نہ ہو اس نام کی مستحق ہی نہیں۔ اسی لیے میں نے اپنے قول و عمل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سیاسی خود اختیاری ـــــ یعنی بہت سے مردوں اور عورتوں کا اپنے اوپر آپ حکومت کرنا ـــــ انفرادی خود اختیاری سے مختلف نہیں ہے۔ اس لیے اُس کے حاصل کرنے کے لیے بھی بالکل وہی ذریعے اختیار کرنے پڑتے ہیں جو انفرادی خود اختیاری یا ضبطِ نفس کے لیے درکار ہیں۔ (۶)

حقوق کا اصلی سرچشمہ فرائض ہیں۔ اگر ہم سب اپنا اپنا فرض ادا کر دیں تو ہمیں اپنا حق آسانی سے مل جائے گا۔ اگر ہم فرائض کو ادا کیے بغیر حقوق کے پیچھے دوڑیں تو وہ اگیا بیتال کی طرح ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ جتنا ہم اُن کا پیچھا کریں گے اتنے ہی وہ ہم سے دور بھاگیں گے۔ (۷)

میرے نزدیک سیاسی قوت بجائے خود مقصد نہیں بلکہ ایک ذریعہ ہے جس سے لوگ ہر شعبۂ زندگی میں اپنی حالت کو سدھار سکتے ہیں۔ سیاسی قوت کے معنی ہیں اس کا اختیار کہ قومی زندگی کا نظم و ضبط قوم کے نمائندوں کے ہاتھوں ہو سکے۔ اگر قومی زندگی اس قدر مکمل ہو جائے کہ نظم و ضبط خود بخود قائم رہے تو نمائندگی کی ضرورت ہی نہیں ہو گی۔ اُس وقت، وہ حالت پیدا ہو جائیگی جسے ایک معقول نراج کہہ سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں ہر شخص اپنا حاکم ہوتا ہے، وہ اپنے اوپر اس طرح حکومت کرتا ہے کہ اُس کی وجہ سے اُس کے ہمسایہ کے کام میں کبھی رکاوٹ نہیں پڑتی۔ چنانچہ مثالی ریاست میں، سیاسی قوت کا وجود نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ سرے سے ریاست ہی نہیں ہوتی۔ مگر یہ نصب العین زندگی میں پوری طرح حاصل نہیں ہوتا۔ اسی لیے تھورو نے یہ کلاسیکی فقرہ کہا ہے، کہ سب سے اچھی وہ حکومت ہے جو سب سے کم حکم چلائے۔ (۸)

میرا خیال ہے کہ سچی جمہوریت صرف اہنسا سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ایک عالمگیر وفاق کی عمارت اہنسا ہی کی بنیاد پر کھڑی ہو سکے گی۔ اور دُنیا کے معاملات سے تشدّد کو بالکل خارج کرنا پڑے گا۔ (۹)

میرا سماج کا تصور یہ ہے کہ گو خلقی طور پر ہم سب برابر ہیں یعنی سب کو یکساں مواقع پانے کا حق ہے لیکن سب میں یکساں صلاحیت نہیں ہوتی۔ مثلاً سب کا قد اور رنگ یکساں نہیں ہوتا، سب میں ایک سی ذہانت نہیں ہوتی۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے قدرتی طور پر بعض زیادہ کما سکیں گے اور بعض کم، قابل آدمیوں میں زیادہ کمانے کی صلاحیت ہو گی اور وہ اُسے اس مقصد کے لیے صرف کریں گے۔ اگر وہ اپنی قابلیت کو اچھی طرح صرف کریں تو یہ ریاست کی خدمت ہو گی۔ میرے خیال میں ایک قابل آدمی کو زیادہ کمانے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اُس کی اُمنگوں کو دبانا مناسب نہیں۔ لیکن اس کمائی کا بڑا حصہ ریاست کی بھلائی کے لیے صرف ہونا چاہیے۔ اُسی طرح جیسے ایک باپ کے بیٹوں

کی کمائی خاندان کے مشترک فنڈ میں چلی جاتی ہے ایسے لوگوں کو اپنی آمدنی صرف امین کی حیثیت سے اپنے پاس رکھنی چاہیے۔ ممکن ہے میں اس میں بُری طرح ناکام رہوں لیکن میری ساری کوشش اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہے۔ (۱۰)

مجھے اُمید ہے کہ میں یہ دکھا دوں گا کہ اصلی سوراج چند آدمیوں کے ہاتھ میں اختیارات آجانے سے نہیں مل جائے گا۔ بلکہ اُس وقت حاصل ہوگا جب سب لوگوں میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ جب اختیارات بیجا طور پر استعمال کیے جائیں تو وہ مزاحمت کر سکیں۔ دوسرے الفاظ میں سوراج اِس طرح حاصل ہوگا کہ عام لوگوں میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ حکومت کے اختیارات میں نظم و ضبط رکھنا اُن کا کام ہے۔ (۱۱)

محض انگریزی زبان کا ہٹ جانا آزادی نہیں ہے۔ آزادی کے معنی ہیں ایک گاؤں والے میں یہ شعور پیدا ہو جانا کہ وہ خود اپنی قسمت کا معمار ہے اور اپنے منتخب کیے ہوئے نمائندے کے ذریعے اپنے لیے خود قانون بناتا ہے۔ (۱۲)

ہم مدتوں سے یہ سوچنے کے عادی ہیں کہ طاقت صرف قانون ساز مجلسوں کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بالکل غلط خیال ہے۔ جو ذہنی جمود کی وجہ سے یا ہپناٹزم کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے۔ برطانیہ کی تاریخ کے سطحی مطالعے نے ہمارے ذہن میں بٹھا دیا ہے کہ طاقت پارلیمنٹ کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچتی ہے۔ دراصل طاقت عوام کے اندر ہے اور وہ کچھ دن کے لیے ان لوگوں کے سپرد کر دیتے ہیں جن کو وہ اپنا نمائندہ منتخب کرتے ہیں۔ عوام سے الگ پارلیمنٹ کے پاس طاقت ہونا درکنار اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ میں اکیس برس سے لوگوں کو یہ سیدھی سادی حقیقت سمجھانے سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سول نافرمانی طاقت کا خزانہ ہے۔ ذرا آپ تصور کیجیے کہ ایک پوری قوم قانون ساز مجلس کے بنائے ہوئے قوانین کی پابندی سے انکار کرتی ہے۔ اور اُس کی سزا بھگتنے کو تیار ہے۔ اس سے تو مقننہ اور عاملہ کا سارا کارخا

ہی معطل ہو جائے گا۔ پولیس اور فوج اس کام آتی ہے کہ چھوٹی جماعتوں کو خواہ وہ کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہوں دبا لے۔ مگر کسی فوج یا پولیس کے جبر سے اس قوم کے عزم محکم کو دبایا نہیں جا سکتا۔ جو زیادہ تکلیف اٹھانے پر کمر باندھ لے۔ اور پارلیمنٹ کی کارروائی اسی وقت موثر ہو سکتی ہے۔ جب اس کے ممبر اکثریت کی مرضی پر چلنے کو تیار ہوں۔ دوسرے لفظوں میں وہ صرف ان ہی لوگوں پر اثر انداز ہوتی ہے جو آئین کے تابع ہوں۔ (۱۳)

مجھے امید ہے کہ ہم ایسی حکومت چاہتے ہیں جس میں اقلیت پر کبھی جبر نہ کیا جائے بلکہ اسے ہم خیال بنانے کی کوشش کی جائے۔ اگر صرف اسی کا سوال ہے کہ گوروں کی فوجی حکومت کی جگہ گندمی رنگ والوں کی فوجی حکومت ہوگی۔ تو پھر ہمیں اس سارے ہنگامے کی کیا ضرورت ہے۔ بہرحال عوام تو اس حکومت میں کبھی کسی قطار و شمار میں نہیں ہوں گے۔ وہ اسی طرح بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ لوٹے جائیں گے۔ (۱۴)

میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جو بیماری ہندوستان میں ہے وہ یورپ میں بھی ہے باوجود اس کے کہ وہاں لوگوں کو حکومت خود اختیاری حاصل ہے ...... اس لیے غالباً وہی علاج ان کے لیے بھی موزوں ہوگا۔ اگر پردہ ہٹا کر دیکھا جائے تو یورپ کے لوگوں کا بھی تشدد کے ذریعہ استحصال ہوتا ہے۔

یہ بیماری اس طرح دور نہیں ہو سکتی۔ کہ عوام بھی تشدد سے کام لیں۔ کم سے کم اب تک تجربے سے یہی ثابت ہوا ہے کہ تشدد کے ذریعہ جو کامیابی ہوئی وہ محض عارضی تھی اس سے تشدد اور بڑھ گیا۔ ابھی تک جن تدبیروں سے کام لیا گیا وہ تشدد کی مختلف صورتیں اور مزاحمت کے مصنوعی طریقے تھے جن کا انحصار زیادہ تر تشدد کرنے والوں کی مرضی پر تھا ظاہر ہے کہ ضرورت کے وقت یہ طریقے ناکام ثابت ہوئے، مجھے یہ نظر آتا ہے کہ اگر یورپ کے عوام استحصال سے نجات پانا چاہتے ہیں تو انھیں کبھی دیر سویر اہنسا سے کام لینا ہوگا۔ (۱۵)

مجھے صرف اسی کی فکر نہیں کہ ہندوستان کی گردن سے انگریزوں کا جوا اترنے میں نے تو یہ طے کرلیا ہے کہ ان کو ہر جوئے سے چاہے وہ کسی کا ہو، چھٹکارا دلاؤں۔ مجھے یہ ہرگز منظور نہیں کہ وہ ایک موذی کے بجائے دوسرے موذی کے پنجے میں پھنس جائے اس لیے میرے نزدیک سوراج کی تحریک دراصل خود اپنی اصلاح کی تحریک ہے۔ اگر ہم زبردستی دوسروں کو اپنی مرضی پر چلائیں تو ہمارا استبداد اُن مٹھی بھر انگریزوں کے استبداد سے کہیں بدتر ہوگا جن پر موجودہ دفتری حکومت مشتمل ہے۔ یہ دہشت انگیزی ایک اقلیت کی طرف سے ہے جو اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے اکثریت کے ساتھ کشمکش میں مصروف ہے۔ ہماری دہشت انگیزی اکثریت کی طرف سے ہوگی اور اسی لیے اس سے بھی بدتر اور بے اصول ہوگی۔ اس لیے ہمیں اپنی جدوجہد سے جبر کو چاہے وہ کسی صورت میں ہو، خارج کر دینا چاہیے۔ اگر ہمارے ساتھ صرف مٹھی بھر آدمی ہیں جو اپنی خوشی سے اہنسا کے اصول کو مانتے ہیں تو ممکن ہے ہمیں دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش میں جان دینی پڑے۔ مگر ہم اپنے مقصد کی تائید کی اور حفاظت کا حق ادا کردیں گے۔ لیکن اگر ہم لوگوں کو زبردستی اپنے جھنڈے کے نیچے لے آئیں تو یہ اپنے مقصد اور اپنے خدا سے غداری ہوگی۔ اور گو ظاہر ہمیں وقتی کامیابی ہو جائے۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اور زیادہ دہشت پھیلائیں گے۔ (۱۷)

جو شخص پیدائشی جمہوریت پسند ہو وہ پیدائشی ضبط پسند بھی ہوتا ہے، اگر وہ سب قوانین کی، خواہ وہ انسانی ہوں یا الٰہی۔ اپنی خوشی سے اطاعت کرنے کا عادی ہے، تو جمہوریت کی طرف اس کا رجحان قدرتی ہوگا۔ میرا دعویٰ ہے کہ میں خلقی طور پر بھی جمہوریت پسند ہوں اور اکتسابی طور پر بھی۔ جو لوگ جمہوریت کی خدمت کا حوصلہ رکھتے ہیں انھیں پہلے اس کڑی آزمائش سے گزر کر اپنی اہلیت کا ثبوت دینا چاہیے۔ اس کے علاوہ جمہوریت پسند کو بالکل بے غرض ہونا چاہیے، اُسے اپنی یا اپنی پارٹی کی نہیں بلکہ صرف جمہوریت

کی فکر ہونی چاہیے۔ تبھی اُسے سول نافرمانی کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ کوئی شخص اپنے عقیدے کو چھوڑ دے یا اپنے خیالات کے اظہار سے باز رہے۔ میرے خیال میں صحت مند اور پُر خلوص اختلاف رائے سے ہمارے مقصد کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ مگر موقع پرستی، ریاکاری اور محض مصلحت کی خاطر سمجھوتہ کر لینے سے ضرور نقصان پہنچے گا۔ اگر آپ واقعی اختلاف رکھتے ہیں تو آپ کو اِس کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیے کہ آپ کی رائے آپ کے دلی عقیدے کو ظاہر کرتی ہو۔ پارٹی کا نعرہ نہ ہو جو مصلحت کی خاطر لگایا جاتا ہے۔

میں انفرادی آزادی کی قدر کرتا ہوں۔ مگر آپ یہ نہ بھولیے کہ انسان دراصل ایک سماجی مخلوق ہے۔ وہ اپنے موجودہ درجے پر اِس طرح پہنچا ہے کہ اُس نے اپنی انفرادیت کو سماجی ترقی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ہے۔ بے لگام انفرادیت جنگلی جانوروں کا اصول ہے۔ ہم نے انفرادی آزادی اور سماجی ضبط کے درمیان توازن قائم رکھنا سیکھا ہے۔ پوری سماج کی بھلائی کی خاطر اپنی خوشی سے۔ سماجی ضابطوں کی تعمیل کرنے سے فرد کی قدر و قیمت بھی بڑھتی ہے اور اُس سماج کی بھی جس کا وہ رکن ہے۔ (۱۸)

اس کا لحاظ کرتے ہوئے کہ ہم سب بھی ہم خیال نہیں ہونگے اور ہمیں نظر سے مختلف زاویوں سے حقیقت مختلف رُخ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نظر آتی ہے، باہمی رواداری ہمارے کردار و عمل کے لیے ایک سنہری اصول ہے۔ ضمیر ہر شخص کا الگ الگ ہے۔ اس لیے گو وہ انفرادی عمل کے لیے اچھا رہنما ہے۔ مگر سب کو ایک ہی عمل پر مجبور کرنا ہر شخص کی آزادی ضمیر میں مداخلت ہے۔ جو کسی طرح برداشت نہیں کی جا سکتی۔ (۱۹)

اختلاف رائے کو مخالفت ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے۔ اگر دونوں چیزیں ایک ہوتیں تو میں اور میری بیوی ایک دوسرے کے سخت دشمن ہوتے۔ میرے علم میں دُنیا میں کوئی دو

آدمی ایسے نہیں ہیں جن میں اختلاف رائے نہ ہو۔ چونکہ میں گیتا کا پیرو ہوں، اس لیے میں نے ہمیشہ اس کی کوشش کی کہ جو لوگ مجھ سے اختلاف رکھتے ہیں، اُن سے اسی طرح محبت کروں جس طرح قریبی عزیزوں اور دوستوں سے کرتا ہوں۔ (۲۰)

جب تک میری قوم کے لوگ غلطیاں کرتے رہیں گے، میں اُن کا اعتراف کرتا رہوں گا۔ میں صرف ایک ہی جابر حاکم کی حکومت کو مانتا ہوں اور وہ میرے دل کی آواز ہے۔ اور گو مجھے اندیشہ ہے کہ میں ایک کی اقلیت میں رہ جاؤں گا۔ مگر میں نہایت عاجزی کے ساتھ کہتا ہوں، مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں اِس قدر حقیر اقلیت میں ہونا گوارا کر لوں گا۔ (۲۱)

میں سچائی کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھے دوسروں کے عیب کم نظر آتے ہیں۔ اِس لیے کہ میں خود سراپا عیب ہوں اور اُن کی درگزر کا محتاج ہوں۔ میں نے اس کی عادت ڈالی ہے کہ کسی کا سختی سے احتساب نہیں کرتا۔ اور جو نقص مجھے دکھائی دیں میں اُن پر نکتہ چینی کرتے میں انسانی کمزوری کا لحاظ رکھتا ہوں۔ (۲۲)

مجھ پر اکثر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ میں ضدی طبیعت رکھتا ہوں۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں اکثریت کی رائے کے آگے سر نہیں جھکاتا اور اپنی من مانی کرتا ہوں۔ مگر میں نے اس کو کبھی تسلیم نہیں کیا کہ مجھ میں ضد اور خود آرائی ہے۔ اِس کے برعکس مجھے تو اِس پر فخر ہے کہ میں غیر اہم باتوں میں ہمیشہ دوسروں کا کہا مان لیتا ہوں۔ مجھے من مانی کرنے سے نفرت ہے، چونکہ مجھے اپنی آزادی عزیز ہے اِس لیے دوسروں کی آزادی کی بھی اتنی ہی قدر کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی ایک شخص کو بھی اپنا ساتھ دینے پر مجبور کروں جب تک کہ اُسے معقول دلیلوں سے قائل نہ کر لوں۔ میں خود رسم پرستی سے اِس حد تک دور ہوں کہ قدیم ترین مقدس کتابوں کو بھی جب تک وہ میری عقل کو مطمئن نہ کر دیں، من جانب اللہ نہیں مانتا۔ مگر مجھے تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ اگر میں سماج کے اندر رہ کر اپنی آزادی رائے

کو قائم رکھنا چاہتا ہوں، تو مجھے اِس آزادی کو اہم ترین معاملات تک محدود رکھنا چاہیے اور سب معاملوں میں، جہاں اپنے ذاتی مذہبی عقیدے یا اخلاقی ضابطے سے انحراف کا سوال نہ ہو اکثریت کی رائے کے آگے سر جھکا دینا چاہیے۔ (۲۳)

"میں "زیادہ سے زیادہ لوگوں کے زیادہ سے زیادہ فائدے" کے اصول کا قائل نہیں ہوں، صاف صاف لفظوں میں اس کے معنی یہ ہیں کہ ۴۹ فی صدی لوگوں کے مفاد کو ۵۱ فی صدی لوگوں کے مفاد پر قربان کر سکتے ہیں بلکہ کرنا چاہیے۔ یہ ایک بے دردانہ اصول ہے۔ اس سے انسانیت کو نقصان پہنچتا ہے۔ سچا، باوقار انسانی اصول صرف ایک ہے اور وہ سب لوگوں کے زیادہ سے زیادہ فائدے کا اصول ہے۔ مگر اس مقصد کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ قربانی درکار ہے۔ (۲۴)

اگر ہمیں طوفان بے تمیزی سے بچنا اور ملک کی منظم ترقی منظور ہے تو عوام کی رہنمائی کے دعوے داروں کو اس معاملے میں بڑی مضبوطی سے کام لینا چاہیے کہ وہ خود عوام کے پیچھے نہ چلیں۔ میں اس بات کو کہ ہم اپنی رائے ظاہر کر دیں اور پھر عوام کی مرضی کے آگے سر جھکا دیں، صرف ناکافی نہیں بلکہ بہت بُرا سمجھتا ہوں۔ میرے خیال میں اہم ترین معاملات میں اگر لیڈروں کو عوام کی رائے معقول نہ معلوم ہو تو انہیں اُس کی عملی مخالفت کرنی چاہیے۔ (۲۵)

وہ لیڈر کس کام کا جو اپنے ضمیر کی ہدایت کے خلاف عمل کرے، اِس بنا پر کہ وہ مختلف خیالات کے لوگوں میں گھرا ہوا ہے۔ اگر اندر کی آواز اُس کو سہارا نہیں دیتی اور اُس کی رہنمائی نہیں کرتی تو وہ ایک بے لنگر کشتی کی طرح بہا چلا جاتا ہے۔ (۲۶)

میں یہ مانتا ہوں کہ انسان فی الواقع عادت کے ماتحت زندگی بسر کرتا ہے مگر میری رائے میں اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے ارادہ سے کام لے کر زندگی گزارے میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ انسان اپنے ارادے کو اتنا مضبوط کر سکتا ہے کہ استحصال گھٹ کر

کم سے کم رہ جائے۔ میں ریاست کی قوت کے بڑھنے سے بہت ڈرتا ہوں۔ اس لیے گو بظاہر وہ استحصال کو کم کر کے ہمیں فائدہ پہنچاتی ہو مگر وہ انفرادیت کو جو ہر قسم کی ترقی کی جڑ ہے، مٹا کر نوعِ انسانی کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے ہمیں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ افراد نے اپنی دولت کو غریبوں کی امانت سمجھا۔ مگر اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ کہ ریاست نے واقعی غریبوں کی خدمت کو اپنا شعار بنایا ہو۔ (۲۷)

ریاست میں تشدد منظم اور مجتمع شکل میں نظر آتا ہے۔ فرد روح رکھتا ہے مگر ریاست ایک بے روح مشین ہے۔ وہ تشدد کو کبھی چھوڑ نہیں سکتی اس لیے کہ اس کا وجود ہی تشدد پر منحصر ہے۔ (۲۸)

مجھے پکا یقین ہے کہ اگر ریاست نے سرمایہ داری کو جبر و طاقت سے مٹایا، تو وہ تشدد کے چکر میں پھنس کر رہ جائے گا۔ اور پھر کبھی اہنسا کو اختیار نہ کر سکے گی۔ (۲۹)

حکومت خود اختیاری کے معنی ہیں اس بات کی مسلسل کوشش کہ ہم حکومت سے تسلط سے خواہ وہ بدیسی حکومت ہو یا قومی حکومت۔ آزاد ہوں۔ سوراج کی حکومت ایک افسوس ناک چیز ہو گی اگر لوگ اس سے یہ توقع رکھیں کہ وہ ان کی زندگی کی ساری جزویات کی دیکھ بھال کرے گی۔ (۳۰)

اگر ہم آزاد مردوں اور عورتوں کی طرح نہیں جی سکتے تو ہمیں موت کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ (۳۱)

اکثریت کی حکومت کا ایک بہت تنگ تصور ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ فرد چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اکثریت کی مرضی کے آگے سر جھکا دے۔ مگر یہ تو غلامی ہوئی کہ اکثریت چاہے جو فیصلہ کرے ہم اسے چپ چاپ مان لیں۔ جمہوریت اس کا نام نہیں کہ لوگ بھیڑ یا چال چلیں۔ جمہوریت میں فرد کی آزادی رائے اور آزادی عمل کی حفاظت کا خاص اہتمام ہوتا ہے۔ (۳۲)

جن معاملات کا تعلق ہمارے ضمیر سے ہو۔ ان میں اکثریت کے قانون کا کوئی دخل نہیں۔ (۳۳)

مجھے یکا یقین ہے کہ انسان اپنی آزادی خود اپنی ہی کمزوری سے کھوتا ہے۔ (۳۴)

ہماری محکومی کی ذمہ داری برطانوی توپوں سے زیادہ خود ہمارے رضاکارانہ تعاون پر ہے۔ (۳۵)

کتنی ہی جابر حکومت کیوں نہ ہو۔ بغیر محکوموں کی رضامندی کے قائم نہیں رہ سکتی اکثر یہ رضامندی زبردستی حاصل کی جاتی ہے۔ جہاں محکوم کے دل سے مستبد حاکم کا خوف نکلا اور اُس کی قوت ختم ہوئی۔ (۳٦)

اکثر لوگ حکومت کی پیچیدہ مشینری کو نہیں سمجھتے۔ انھیں اُس کا احساس نہیں کہ ہر شہری خاموشی سے مگر یقینی طور پر حکومت وقت کو طرح طرح سے سہارا دیتا ہے۔ گو اُسے اُس کی خبر نہیں۔ اِس لیے ہر شہری اپنی حکومت کے ہر فعل کا ذمہ دار ہے جب تک حکومت کی کارروائیاں قابل برداشت ہیں اس کا یہ سہارا دینا ٹھیک ہی ہے۔ مگر جب اُن سے اُسے اور اُس کی قوم کو نقصان پہنچے۔ تو اُس کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ سہارا دینے سے ہاتھ کھینچ لے۔ (۳۷)

یہ صحیح ہے کہ بیشتر صورتوں میں محکوم کا فرض ہے کہ حکومت کی بے عنوانیوں سے جو تکلیف پہنچے اُسے سہہ لے۔ بہ شرطے کہ اُس سے اُس کے جوہرِ حیات پر اثر نہ پڑتا ہو۔ مگر ہر قوم اور ہر فرد کو یہ حق ہے اور اُن کا یہ فرض ہے کہ جو ظلم ناقابل برداشت ہو اُس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں۔ (۳۸)

اِس سے بڑھ کر کوئی جواں مردی کا کام نہیں کہ انسان دُنیوی طاقت کے آگے خواہ وہ کتنی ہی زبردست کیوں نہ ہو، گھٹنے ٹیکنے سے انکار کردے۔ اِس طرح کہ اُس کے دل میں تلخی نہ ہو۔ اور اُسے اِس پر کامل اعتقاد ہو کہ روح کے سوا اور کسی

چیز کو لقا نہیں۔ (۳۹)

بیرونی آزادی ہمیں اُسی نسبت سے حاصل ہوگی جتنی اندرونی آزادی ہم اُس وقت تک حاصل کر چکے ہوں۔ اور اگر آزادی کا صحیح تصور یہ ہے تو ہمیں اپنی پوری قوت اندرونی اصلاح میں لگا دینی چاہیے۔ (۴۰)

سچا جمہوریت پسند وہ ہے جو خالص بے تشدد وسائل سے کام لے کر اپنی آزادی کی حفاظت کرے۔ جس کا سلسلہ ملک کی آزادی سے اور بالآخر نوع انسانی کی آزادی سے جا ملتا ہے۔ (۴۱)

جمہوریت جس میں ضبط و تنظیم اور روشن خیالی ہو دُنیا میں سب سے اچھی چیز ہے لیکن وہ جمہوریت جو متعصب جاہل اور توہم پرست ہو، آخر میں سماجی زندگی کو درہم برہم کر دے گی۔ اور خود اپنے ہاتھوں برباد ہو جائے گی۔ (۴۲)

جمہوریت اور تشدد ایک دوسرے کے ساتھ نہیں چلتے۔ جو ریاستیں آج برائے نام جمہوری ہیں۔ ان کو یا تو کھلم کھلا آمریت اختیار کرنی ہے یا سچی جمہوریت، اگر سچی جمہوریت اختیار کرنی ہے تو اُنہیں ہمت سے کام لے کر بے تشدد بن جانا چاہیے۔ یہ کہنا کہ اہنسا پر صرف افراد عمل کر سکتے ہیں قومیں جو افراد پر مشتمل ہیں نہیں کر سکتیں (عقل اور منطق) کی توہین ہے۔ (۴۳)

میرے خیال میں سوراج کے لیے ہمیں اس کے سوا کسی ٹریننگ کی ضرورت نہیں کہ ہم اپنی حفاظت کے لیے ساری دُنیا کا مقابلہ کر سکیں اور اپنی زندگی خواہ اُس میں کتنے ہی نقائص کیوں نہ ہوں، پوری آزادی کے ساتھ بسر کر سکیں، اچھی حکومت اپنی حکومت کا بدل نہیں ہو سکتی۔ (۴۴)

میں اہل برطانیہ کو الزام نہیں دیتا۔ اگر ہم تعداد میں اتنے ہی ہوتے جتنے وہ ہیں تو شاید ہم بھی وہی طریقے اختیار کرتے جن سے وہ کام لے رہے ہیں۔ دہشت انگیزی، اور فریب

طاقتوروں کے ہتھیار نہیں بلکہ کمزوروں کے ہیں۔ اہلِ برطانیہ تو تعداد میں کم ہونے کی وجہ سے کمزور ہیں۔ اور ہم اتنی بڑی تعداد کے باوجود کمزور ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو کھینچکر پستی کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ انگریزوں کی سیرت پر ہندوستان میں رہنے کا بُرا اثر پڑتا ہے اور ہندوستانیوں کی ہمت اور مردانگی میں انگریزوں کے سابقے سے کمی ہوتی ہے۔ یہ بات نہ تو ہم دونوں قوموں کے لیے اچھی ہے اور نہ دُنیا کے لیے۔

لیکن اگر ہم ہندوستانی اپنی اصلاح کی فکر کریں تو انگریز اور باقی دُنیا اپنی اصلاح خود کرے گی۔ اس لیے ہمارا حصہ دُنیا کی ترقی میں یہ ہونا چاہیے کہ خود اپنے گھر میں سدھار کریں۔ (۴۵)

تو پھر ترکِ تعاون کا تقاضا ایثار و قربانی کے لحاظ سے کیا ہے؟ یہی کہ ہم کو اس حکومت سے جو ہماری مرضی کے خلاف ہم پر مسلّط ہے، تعاون نہ کرنے سے جو نقصانات پہنچیں اور تکلیفیں اُٹھانی پڑیں اُن کو خوشی سے برداشت کریں۔ تھورو نے کہا ہے "ایک بے انصاف حکومت کے ماتحت کسی شخص کے پاس قوت اور دولت کا ہونا جرم ہے مفلسی ایسی صورت میں نیکی کہلائے گی"۔ ہوسکتا ہے کہ عبوری دور میں ہم سے غلطیاں سرزد ہوں اور وہ تکلیفیں اُٹھانی پڑیں جن سے ہم بچ سکتے تھے یہ چیزیں اس سے اچھی ہیں کہ پوری قوم نامرد ہو کر رہ جائے۔

ہمیں اس کا انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ جب ظالم کو اپنی بے انصافی کا احساس ہوگا۔ تو وہ اُس کی تلافی کر دے گا۔ ہمارے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں کہ اپنی یا دوسروں کی تکلیفوں اور مصیبتوں کے خوف سے اس بے انصافی میں حصہ دار بنے رہیں۔ بلکہ ہمارا فرض ہے کہ اس کا مقابلہ کریں۔ اس طرح سے کہ ظالم کے ساتھ ہر قسم کا تعاون خواہ وہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ ترک کر دیں۔

اگر باپ ناانصافی کرے تو اولاد کا فرض ہے کہ اُس کا گھر چھوڑ کر چلی جائے۔ اگر کسی اسکول کا ہیڈماسٹر اپنے ادارے کو ایسے طریقے سے چلائے جو منافی اخلاق ہو۔ تو بچوں کو چاہیئے کہ اسکول چھوڑ دیں۔ اگر کسی کارپوریشن کا چیرمین بددیانت ہے تو اسکے ممبروں پر لازم ہے۔ کہ اُس کی بددیانتی سے اپنے دامن کو بچانے کے لیے ممبری سے الگ ہوجائیں۔ اِسی طرح اگر کوئی اپنی رعایا کے ساتھ شدید بے انصافی کرے تو رعایا کو اُس سے کلی یا جزوی ترک تعاون کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ حاکم اپنی زیادتی سے باز آجائے۔ اِن سب صورتوں میں جو میرے تصور میں آتی ہیں۔ جسمانی یا ذہنی تکلیف کا ایک عنصر شامل ہے۔ اس طرح کی تکلیف اُٹھائے بغیر آزادی حاصل کرنا ممکن نہیں۔(۴۶)

جس لمحے میں نے ستیاگرہ شروع کی اُسی لمحے سے میں حکومت کا محکوم نہیں رہا۔ مگر ریاست کا شہری بنا رہا۔ شہری قوانین کی پابندی اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ وہ جب ضرورت سمجھتا ہے، قانون توڑتا ہے اور اُس کی سزا کو خوشی سے برداشت کرتا ہے۔ اِس طرح سزا کی دھار کند ہوجاتی ہے یعنی اس میں وہ ذلت نہیں رہتی جو عام صورتوں میں سمجھی جاتی ہے۔ (۴۷)

مکمل سول نافرمانی وہ بغاوت ہے جس میں تشدد کا عنصر نہ ہو۔ پکا سول نافرمانی کرنے والا ریاست کے حکم و اختیار کو قطعاً نظر انداز کر دیتا ہے، وہ قانون کا باغی بن کر ریاست کے ہر قانون سے جو غیر اخلاقی ہو انحراف کرتا ہے مثلاً ممکن ہے کہ وہ ٹیکس ادا کرنے سے انکار کردے، یا روزمرہ زندگی میں ریاست اسکے حکم کو تسلیم نہ کرے۔ ممکن ہے وہ مداخلت بے جا کے قانون کو نہ مانے اور یہ دعوی کرے کہ اُسے فوجی بارکوں میں جا کر سپاہیوں سے بات چیت کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ پکیٹنگ کے طریقوں پر لگائی ہوئی پابندیوں کو ماننے سے انکار کردے۔ اور ممنوعہ رقبہ میں جاکر پکیٹنگ کرے ان سب باتوں کے کرنے میں وہ کبھی تشدد سے کام نہیں لیتا۔ اور اگر اس پر تشدد کیا جائے

تو کبھی مزاحمت نہیں کرتا۔ بلکہ وہ تو خود کوشش کرتا ہے کہ قید کی سزا بھگتے اور اسی قسم کے اور تشدد برداشت کرے، یہ وہ اسی وجہ سے کرتا ہے اور اسی صورت میں کرتا ہے کہ ظاہری جسمانی آزادی اُس کے لیے ایک ناقابل برداشت بوجھ بن جاتی ہے۔ وہ اپنے دل میں سوچتا ہے کہ ریاست اپنے شہری کو جسمانی آزادی اسی شرط پر دیتی ہے کہ وہ اس کے قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی کرے۔ گویا ریاست کے قانون کی پابندی وہ قیمت ہے جو ایک شہری اپنی جسمانی آزادی کی ادا کرتا ہے۔ اس لیے ریاست کے کسی ایسے قانون کی پابندی جو سراسر یا بڑی حد تک بے انصافی پر مبنی ہے آزادی کا ناجائز سودا ہے۔ جب کسی شہری کو اس طرح سے ریاست کی بد طینتی کا اندازہ ہو جائے تو وہ اُسے گوارا نہیں کرتا کہ اس کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرے، وہ تو اس کی کوشش کرتا ہے کہ بغیر کسی اخلاقی اصول کے خلاف ورزی کیے ریاست کو اس بات پر مجبور کر دے کہ اُسے گرفتار کر لے اور دوسرے لوگ، جو اُس کے ہم خیال نہیں ہیں، اُسے سماج کے لیے وبال جان سمجھنے لگتے ہیں۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو سِوِل نافرمانی ایک دُکھی آتما کی دلدوز فریاد اور بری ریاست کے وجود کے خلاف ایک زبردست احتجاج ہے۔ کیا دُنیا کی ہر اصلاح کی یہی روداد نہیں ہے؟ کیا مصلحوں نے اپنے ہم عصروں کو ناراض کر کے بڑے افعال کی بے ضرر علامتوں تک کو مردود قرار نہیں دیا؟

جب کچھ لوگ اس ریاست سے، جس کے ماتحت وہ اب تک رہا کیے ہیں، قطع تعلق کر لیں۔ تو گویا وہ خود اپنی حکومت قائم کر لیتے ہیں۔ میں نے "گویا" کا لفظ اِس لیے استعمال کیا کہ وہ اُس حد تک نہیں جاتے کہ ریاست کی مزاحمت کا مقابلہ کرنے میں تشدد سے کام لیں اِن کا کام افراد کی حیثیت سے یہ ہے کہ جب تک ریاست اُن کے جداگانہ وجود کو تسلیم نہ کرلے یا دوسرے الفاظ میں اُن کی مرضی کے آگے سر نہ جھکائے وہ قید کی سختیاں جھیلتے رہیں یا گولی کھا کر جان دیتے رہیں۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء میں جنوبی افریقہ

میں تین ہزار ہندوستانی، حکومت ٹرانسوال کو باضابطہ نوٹس دے کر ٹرانسوال میں داخل ہوئے تاکہ اس کے قانون نو آبادی کی خلاف ورزی کریں۔ جب حکومت انہیں تشدد پر اکسانے یا اطاعت پر مجبور کرنے میں ناکام رہی تو اسے ان کے مطالبوں کے آگے سر جھکانا پڑا۔ غرض سول نافرمانی کرنے والوں کی فوج کو ضبط و نظم کے تمام قاعدوں کی، جو فوج سے سپاہیوں کے لیے ہوتے ہیں، پابندی کرنی پڑتی ہے، بلکہ ان کے لیے مزید دشواری یہ ہے کہ ان کی زندگی میں وہ جوش و خروش نہیں ہوتا جو معمولی سپاہیوں کی زندگی میں ہوا کرتا ہے۔ اور چونکہ سول نافرمانی کرتے والوں کی فوج جوش اور اشتعال سے خالی ہوتی ہے یا ہونی چاہیے اور ان میں انتقامی جذبہ نہیں ہوتا اس لیے اس میں سپاہیوں کی تعداد جہاں تک ہو سکے کم ہونی چاہیے۔ سچ پوچھیے تو صرف ایک سول نافرمانی کرنے والا، اگر وہ ہر اعتبار سے کامل ہو حق و باطل کی جنگ میں فتح پانے کے لیے کافی ہے۔ (۴۸)

اہنسا کی تدبیر جنگ میں ضبط و نظم تو درکار ہوتا ہی ہے مگر اس کے علاوہ اور بہت سی چیزوں کی بھی ضرورت ہے ستیا گرہ کی فوج میں ہر شخص سپاہی اور خدمت گذار ہے۔ مگر ضرورت کے وقت ہر ستیا گرہی سپاہی کو خود ہی اپنا سپہ سالار اور قائد بھی بننا پڑتا ہے۔ محض نظم و ضبط سے قابلیت کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے لیے ایمان و بصیرت درکار ہے۔ (۴۹)

جہاں خود اعتمادی کا دور دورہ ہو، جہاں ایک کو دوسرے کی ہدایت کی احتیاج نہ ہو۔ جہاں کوئی رہنما اور پیرو نہ ہو یا سبھی رہنما۔ اور سبھی پیرو ہوں وہاں ایک لڑنے والے کی موت سے خواہ وہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو، لڑائی دھیمی نہیں پڑتی، بلکہ اس کی شدت اور بڑھ جاتی ہے۔ (۵۰)

ہر اچھی تحریک پانچ منزلوں سے گزرتی ہے (۱) بے اعتنائی (۲) تضحیک، (۳) لعنت ملامت (۴) جبر و تشدد (۵) قدر و عزت۔ چند مہینوں تک ہمارے ساتھ

بے اعتنائی برتی گئی - پھر والیسرائے نے ازراہِ کرم ہمارا مضحکہ اُڑایا - پھر لعنت ملامت کا جس میں ہمارے خیالات اور مقاصد کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا بھی شامل ہے بڑا زور رہا۔ صوبوں کے گورنروں اور ترکِ تعاون کے مخالف اخباروں نے اِس تحریک پر سب و شتم کی بوچھار کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی، اب جبر و تشدد کی باری آئی جس کی آنچ ابھی تک خاصی دھیمی ہے۔ ہر تحریک جو جبر و تشدد کو چاہے وہ خفیف ہو یا شدید جھیل کر چلتی رہے اُسے لازمی طور پر قدر و عزت حاصل ہوتی ہے، جو کامیابی کا دوسرا نام ہے - اگر ہم سچے اندر کھرے ہیں تو موجودہ جبر و تشدد کو آنے والی فتح کی یقینی نشانی سمجھنا چاہیے لیکن اگر ہم سچے اور کھرے ہیں تو ہمیں نہ خوف سے دیکھنا چاہیے اور نہ غصے میں آکر انتقام لینا اور تشدد کرنا چاہیے - تشدد ہمارے لیے خودکشی ہے۔ (۵۱)

میری خود اعتمادی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اگر ایک ستیاگرہی بھی آخر تک اپنی جگہ جما رہا تو فتح بالکل یقینی ہے۔ (۵۲)

میرا کام پورا ہو جائے گا - اگر میں نوعِ انسانی کو یہ یقین دلا دوں کہ ہر شخص مرد ہو یا عورت، خواہ جسمانی حیثیت سے کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو خود ہی اپنی خودداری، اور آزادی کا محافظ ہے۔ اور اُسے اُس حفاظت کی مہم میں کامیابی ہوتی ہے، گو ساری دُنیا اُس کے خلاف ہو۔ (۵۳)

دسواں باب

تعلیم

سچی تعلیم یہ ہے کہ ہمارے اندر جو بہترین صلاحیتیں ہیں اُنھیں اُبھاریں۔ کتابِ انسانیت سے بہتر دُنیا میں کوئی کتاب نہیں۔ (۱)

میرا خیال ہے ذہن کی سچی تعلیم صرف جسمانی اعضا، مثلاً ہاتھ، پاؤں، ناک، کان وغیرہ کے صحیح استعمال اور تربیت سے ہو سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں بچے کا اپنے اعضا سے سمجھ بوجھ کر کام لینا، اُس کے ذہن کی نشوونما کے لیے سب سے اچھا اور سب سے قریب کا راستہ ہے۔ لیکن ذہن اور جسم کی نشوونما، جب تک کہ اُس کے ساتھ روح کی بیداری نہ ہو، ناقص اور ناہموار ہے۔ روحانی تربیت سے میرا مطلب ہے تہذیبِ نفس، لہٰذا ذہن کی صحیح اور ہمہ گیر نشوونما اسی وقت ہو سکتی ہے جب بچے کی ذہنی تربیت اُس کی جسمانی اور روحانی قوتوں کی تربیت کے ساتھ مساوی رفتار سے آگے بڑھے، یہ سب چیزیں مل کر ایک قدرِ سالم بناتی ہیں جسے اجزا میں تقسیم نہیں

کر سکتے۔ اِس لیے یہ سمجھنا سخت حماقت ہے کہ یہ الگ الگ، ایک دوسرے سے بے تعلق رہ کر نشو و نما پا سکتی ہیں۔ (۲)

تعلیم سے میری مُراد ہے بچوں اور بڑوں میں ـــــ ان کے ذہن، جسم اور روح کے اندر ـــــ جو بہترین صلاحیتیں ہیں اُنھیں اُبھارنا، لکھنے پڑھنے کی قابلیت تعلیم کا منتہا نہیں۔ بلکہ سچ پوچھیے تو یہ تعلیم کی ابتدا بھی نہیں۔ یہ محض ایک ذریعہ ہے، اُن ذریعوں میں سے جن سے مردوں اور عورتوں کو تعلیم دی جا سکتی ہے اِس لیے میں بچے کی تعلیم اِس طرح شروع کرنا چاہتا ہوں کہ اُسے کوئی مفید دستکاری سکھاؤں اور اِس قابل بنادوں کہ وہ پہلے ہی دن سے کوئی کام کی چیز پیدا کرنے لگے۔ اِس طرح ہر اسکول خود کفیل بن سکتا ہے۔ بہ شرطے کہ ریاست ان اسکولوں میں بنی ہوئی چیزوں کو لے کر اُن کی فروخت کا انتظام کرے۔

میرے خیال میں اِس طرزِ تعلیم سے ذہن اور روح کی زیادہ سے زیادہ نشوونما ہو سکتی ہے البتہ اُس کی ضرورت ہے کہ جو دستکاری سکھائی جائے۔ وہ محض مکانکی طریقے سے نہ سکھائی جائے۔ جیسا کہ آج کل ہوتا ہے۔ بلکہ علمی طریقے سے یعنی بچے کو ہر عمل کی غرض و غایت معلوم ہو، میں یہ بات کسی قدر وثوق کے ساتھ لکھ رہا ہوں اس لیے کہ اُسے تجربے کی تائید حاصل ہے، یہ طریقہ ہر جگہ جہاں کارکنوں کو کتائی سکھائی جاتی ہے کم و بیش مکمل طور پر اختیار کیا جا رہا ہے۔ میں نے خود چپل سازی اور کتائی اِسی طرح سکھائی ہے اور اس سے خاطر خواہ نتیجہ نکلا ہے۔ اِس طریقے سے کام لینے کے یہ معنی نہیں کہ تاریخ اور جغرافیہ نہ سکھایا جائے۔ البتہ میں نے یہ دیکھا ہے کہ اِس طرح کی عام معلومات کا درس زبانی ہوتا ہے۔ اِس طرح بچے اس سے دس گنا زیادہ سیکھتے ہیں۔ جتنا لکھنے پڑھنے کے ذریعے۔ اب رہے حروف تہجی تو وہ آگے چل کر سکھائے جا سکتے ہیں جب بچہ اہم اور غیر اہم میں فرق کرنے لگے۔ اور اُس کا مذاق کسی حد تک نشو و نما پا چکا ہو۔ یہ

ایک انقلابی تجویز ہے۔ مگر اس سے بہت محنت بچتی ہے اور طالب علم سال بھر میں اتنا سیکھ لیتا ہے۔ جتنا اُس سے بہت زیادہ وقت میں سیکھتا۔ غرض اس میں ہر طرح سے کفایت ہے۔ ظاہر ہے کہ بچہ ریاضی دستکاری کے ساتھ ساتھ سیکھ لیتا ہے۔ (۲)

مجھے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف ہے میں نے ایسی تعلیم جسے یونیورسٹی کی تعلیم کہہ سکیں نہیں پائی ہے۔ اسکول میں بھی میری قابلیت کبھی اوسط درجے سے زیادہ کی نہیں رہی۔ میں اسی کو غنیمت سمجھتا تھا کہ امتحان میں پاس ہوجاتا ہوں۔ یہ چیز کہ اسکول میں امتیاز حاصل کروں۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ اِس کے باوجود میں عام تعلیمی مسائل کے بارے میں جن میں اعلیٰ تعلیم بھی شامل ہے۔ ایک واضح اور قطعی رائے رکھتا ہوں اور مجھ پر اپنے ملک کی طرف سے یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ اپنے خیالات صاف صاف لوگوں پر ظاہر کردوں تاکہ اگر وہ کسی قابل ہوں تو اُن پر عمل کیا جائے۔ مجھے اس حجاب کو جس کی بدولت میں نے اپنی رائے کو دبائے رکھا ہے چھوڑنا چاہیے۔ مجھے اس سے نہیں ڈرنا چاہیے کہ میرا مضحکہ اُڑایا جائے گا۔ یا میری مقبولیت اور ساکھ کم ہوجائیگی۔ اگر میں اپنے خیالات کو چھپاؤں تو میری رائے میں جو غلطیاں ہوں اُن کی تصحیح نہیں ہوسکے گی مجھے ہمیشہ یہ تمنا رہتی ہے کہ اپنی غلطیاں معلوم کروں اور اُن کو درست کروں۔

آئیے اب میں ان نظریات کو جن کا میں برسوں سے قائل ہوں اور جب موقع ملتا ہے اُن پر عمل کرتا ہوں۔ بیان کروں۔

(۱) میں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا جو دُنیا میں کہیں بھی حاصل ہوسکتی ہے مخالف نہیں ہوں۔

(۲) اِس تعلیم کا خرچ ریاست کو اُسی وقت ادا کرنا چاہیے۔ جب وہ اس کے کسی خاص مقصد کو پورا کرتی ہو۔

(۳) مجھے اِس سے اختلاف ہے کہ ساری اعلیٰ تعلیم کا خرچ ریاست کی

آمدنی سے ادا کیا جائے؟

(۴) مجھے پکا یقین ہے کہ آرٹس کی نام نہاد تعلیم کا جو ہمارے کالجوں میں دی جاتی ہے۔ بہت بڑا حصہ محض تضیع اوقات ہے اور اس کی وجہ سے تعلیم یافتہ طبقوں میں بے روزگاری پھیل گئی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس نے اُن لڑکوں اور لڑکیوں کی جنہیں بدقسمتی سے کالج کی تعلیم کی چکی میں پسنی پڑی۔ جسمانی اور دماغی صحت کو برباد کر دیا ہے

(۵) ہندوستان کی ایک بدیسی زبان کو اعلیٰ تعلیم کے ذریعے کے طور پر اختیار کرنے کی وجہ سے قوم کو بے حد ذہنی اور اخلاقی نقصان پہنچا ہے۔ ہم اپنے زمانے کو اس قدر قریب سے دیکھتے ہیں کہ ہمیں اس نقصان کی شدت کا پورا اندازہ نہیں ہوسکتا اس پر طرہ یہ کہ ہم لوگ جنہوں نے یہ تعلیم پائی ہے خود ہی اُس کے مارے ہوئے ہیں اور خود ہی جج بن کر فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں ظاہر ہے کہ یہ ہمارے لیے قریب قریب ناممکن ہے۔

مجھے اِن نظریات کا جو میں نے اوپر بیان کیے ہیں ثبوت بھی پیش کرنا چاہیے۔ اُس کی بہترین صورت یہ ہے کہ میں اپنے کچھ ذاتی تجربے آپ کے سامنے بیان کر دوں۔

بارہ برس کی عمر تک جتنا علم میں نے حاصل کیا۔ وہ اپنی مادری زبان گجراتی کے ذریعہ حاصل کیا۔ اِس وقت میں تھوڑا سا حساب اور تاریخ و جغرافیہ جانتا تھا۔ اس کے بعد ہائی اسکول میں داخل ہوا پہلے تین سال تک مادری زبان ہی ذریعہ تعلیم رہی۔ مگر ماسٹر صاحب کا خاص کام یہ تھا کہ انگریزی زبان لڑکوں کے دماغ میں ٹھونسیں، اِس لیے ہمارا آدھے سے زیادہ وقت انگریزی پڑھنے میں اور اُس کے اوٹ پٹانگ ہجے اور تلفظ یاد کرنے میں گزرتا تھا۔ یہ بڑا تکلیف دہ انکشاف تھا کہ جو زبان ہمیں سیکھنی پڑ رہی ہے۔ اس کا تلفظ اِس طرح نہیں کیا جاتا جس طرح وہ لکھی جاتی ہے۔ مگر یہ ایک

ضمنی بات ہے اور میرے استدلال سے تعلق نہیں رکھتی۔ بہرحال پہلے تین سال اچھی خاصی طرح کام چلتا رہا۔

چوتھے سال سے شکنجے میں کسے گئے۔ جامیٹری الجبرا کیمسٹری، ہیئت تاریخ جغرافیہ ہر چیز انگریزی کے ذریعہ پڑھائی جاتی تھی۔ اگر کوئی لڑکا گجراتی بولتا جس کو وہ سمجھتا تھا تو اُسے سزا دی جاتی تھی۔ اُستاد کو اُس کی پروا نہ تھی۔ کہ لڑکا انگریزی غلط سلط بولتا ہے، غلط لکھتا ہے اور اچھی طرح سمجھ بھی نہیں پاتا۔ اُسے کیوں پروا ہوتی؟ خود اُس کی انگریزی بھی تو غلطیوں سے پاک نہ تھی۔ اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ جیسے لڑکوں کیلیے انگریزی بدیسی زبان تھی ویسے ہی اُسکے لیے بھی تھی، ہم لڑکوں کو بہت سی چیزیں زبانی یاد کرنی پڑتی تھی، گو ہم اُن کا مطلب اچھی طرح نہیں سمجھتے تھے اور بعض اوقات تو بالکل نہیں سمجھتے تھے۔ جب اُستاد ہمیں انگریزی میں جامیٹری سمجھانے کی کشمکش میں مبتلا ہوتا تو میرا سر چکرانے لگتا تھا۔ ہم اقلیدس کی پہلی کتاب کی تیرھویں شکل تک پہنچ گئے۔ مگر جامیٹری کا سر پیر میری سمجھ میں نہ آیا۔ اور میں پڑھنے والوں سے سامنے اعتراف کرتا ہوں، اِس ساری محنت کے باوجود جو مجھے اپنی مادری زبان سے ہے۔ مجھے آج تک جامیٹری، الجبرا وغیرہ کی گجراتی اصطلاحیں نہیں معلوم اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس قدر حساب، جامیٹری، الجبرا، کیمسٹری اور ہیئت میں نے چار برس میں سیکھی، اگر انگریزی کے بجائے گجراتی میں پڑھائی جاتی تو سال بھر میں سیکھ لیتا، اِس مضمون کا تصور بھی میرے ذہن میں زیادہ صاف اور واضح ہوتا اور میرا گجراتی الفاظ کا ذخیرہ بھی بڑھ جاتا۔ پھر میں اس علم سے اپنے گھر میں بھی کام لے سکتا تھا۔ مگر انگریزی کے ذریعہ تعلیم ہونے سے میرے اور میرے خاندان کے لوگوں کے درمیان، جنہوں نے انگریزی اسکولوں میں نہیں پڑھا تھا۔ ایک ناقابل عبور خلیج حائل ہو گئی۔ میرے والد کو میرے کام کی کچھ خبر نہ تھی۔ اگر میں چاہتا تو بھی میرے

والد کو ان چیزوں سے جو میں سیکھ رہا تھا دلچسپی نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ اس لیے کہ وہ انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے تھے۔ میں اپنے گھر میں اجنبی ہوتا جارہا تھا اور اپنے آپ کو بہت اونچا تو سمجھتا ہی تھا۔ میرے لباس تک میں غیر محسوس طور پر تبدیلی ہو رہی تھی اور میری روداد کچھ غیر معمولی نہ تھی۔ انگریزی اسکولوں میں پڑھنے والوں کی اکثریت کا یہی حال تھا۔

ہائی اسکول کی تعلیم کے پہلے تین سال میں میری عام معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ یہ زمانہ تو صرف اس کی تیاری کا تھا۔ کہ لڑکے ہر مضمون انگریزی کے ذریعہ پڑھنے کے قابل ہو جائیں۔ جو علم میرے اسکول کے تین سو لڑکوں نے حاصل کیا، وہ انہیں تک محدود رہا۔ وہ عوام تک نہیں پہنچایا جا سکتا تھا۔

اب دو لفظ ادب کے بارے میں بھی سن لیجئے۔ ہم نے انگریزی نظم و نثر کی کئی کتابیں پڑھیں۔ اپنی جگہ یہ بہت اچھی بات ہے مگر اس علم سے مجھے عوام کی خدمت کرنے میں اور ان سے تعلق پیدا کرنے میں کوئی مدد نہیں ملی، میں یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ جو انگریزی نظم و نثر میں نے پڑھی وہ نہ پڑھتا تو کسی نادر خزانے سے محروم رہتا اگر اس کی جگہ میں وہ قیمتی سات برس گجراتی زبان پر عبور حاصل کرنے میں اور گجراتی کے ذریعے ریاضی سائنس اور سنسکرت وغیرہ پڑھنے میں صرف کرتا تو جو علم اس طرح حاصل ہوتا وہ آسانی سے اپنے ہمسایوں کو سکھا سکتا، میں گجراتی ادب کے ذخیرے میں اضافہ کر سکتا۔ اور کیا عجب ہے کہ اپنی محنت کی عادت اور اس گہری محبت کی بدولت جو مجھے اپنے ملک سے اور اپنی مادری زبان سے ہے، عوام کی اس سے زیادہ اور بیش قیمت خدمت کر سکتا۔

کوئی اس کا مطلب یہ نہ سمجھے کہ میں انگریزی زبان اور اس کے بلند پایہ ادب کی بے قدری کر رہا ہوں۔ "ہریجن" کے کالم اس کی شہادت کے لیے کافی ہیں کہ

مجھے انگریزی سے کتنی محبت ہے۔ مگر انگریزی ادب کی عظمت و رفعت سے ہندستانی قوم کو کوئی فائدہ نہیں، اسی طرح جیسے انگلستان کی معتدل آب وہوا یا خوشنما مناظر قدرت ہمارے کسی کام کے نہیں۔ ہمیں اور ہماری اولاد کو تو اپنی تہذیب کی تعمیر اپنی ہی میراث کی بنیاد پر کرنی ہوگی۔ اگر ہم دوسروں سے ادھار لیں گے تو اپنی ساکھ کم کریں گے۔ بدیسی غذا سے ہم کبھی پنپ نہیں سکتے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ہماری قوم کو انگریزی زبان کے ادراسی پر کیا موقوف ہے، دُنیا کی سبھی زبانوں کے ادبی خزانے خود اپنی زبانوں میں میسر ہوں۔ مجھے رابندر ناتھ ٹیگور کی بے مثل تصانیف کی خوبیوں سے واقف ہونے کے لیے بنگالی سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں اچھے ترجموں کے ذریعہ اُن سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔ گجراتی لڑکوں اور لڑکیوں کو طالسٹائے کی کہانیوں کا مطالعہ کرنے کیلیے روسی زبان سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ترجمے موجود ہیں، انگریزوں کو اس پر ناز ہے کہ دُنیا میں جو بہترین ادبی کتابیں شائع ہوتی ہیں، وہ تاریخ اشاعت کے ایک ہفتہ کے اندر سہل اور سادہ انگریزی میں اُن کی قوم کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہیں۔ کیا ضرورت ہے کہ مجھے شکسپیر اور ملٹن کے بہترین خیالات اور تحریروں سے فیض یاب ہونے کے لیے انگریزی سیکھنی پڑے۔

اس میں بڑی کفایت ہے کہ اہلِ علم کے ایک طبقے کو اُس کے لیے مخصوص کر دیا جائے کہ وہ دُنیا کی مختلف زبانوں کے بہترین ادب کا مطالعہ کر کے اُسے ہندستانی زبانوں میں منتقل کریں۔ ہمارے حاکموں نے ہمیں غلط راہ پر ڈال دیا۔ اور اُس پر چلتے چلتے ہم سمجھنے لگے کہ یہی صحیح راہ ہے۔۔۔۔

یونیورسٹیوں کو خود کفیل ہونا چاہیے۔ ریاست صرف اُن لوگوں کی تعلیم کا خرچ اُٹھائے جن کی خدمات کی اُسے ضرورت پڑے گی۔ اور لوگوں کو مختلف علوم و فنون کی تعلیم دینے کے لیے نجی کوشش کی ہمت افزائی کرے۔ ذریعہ تعلیم تو فوراً اور ہر قیمت پہ

بدل دیا جائے اور صوبوں کی زبانوں کو وہ درجہ ملے جس کی وہ مستحق ہیں ممکن ہے اُس سے عارضی طور پر تعلیمی نظام درہم برہم ہو جائے مگر میں اُسے ترجیح دونگا، روپے اور وقت کی اِس مجرمانہ بربادی پر جو روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

غرض میرا دعوےٰ ہے کہ میں اعلےٰ تعلیم کا دشمن نہیں ہوں مگر اِس وقت اعلیٰ تعلیم جس طرح دی جا رہی ہے، اُس سے مجھے شدید اختلاف ہے۔ میری اسکیم کے مطابق کتب خانے، تجربہ گاہیں، تحقیقی ادارے جتنے اب ہیں اس سے زیادہ اور بہتر ہوں گے، اسکے ماتحت کیمیا دانوں، انجینیروں اور دوسرے ماہرینِ فن کی ایک فوج کی فوج ہوگی۔ جو قوم کے سچے خادم ہوں گے اور ہماری جنتا کے جیسے اب روز بروز اپنے حقوق اور ضروریات کا شعور بڑھ رہا ہے۔ بڑھتے ہوئے مطالبوں کو پورا کریں گے۔ اور یہ سب ماہرینِ فن کسی بدیسی زبان میں نہیں بلکہ جنتا کی زبان میں بات چیت کریں گے۔ جو زبان وہ حاصل کریں گے وہ جنتا کی مشترک ملک ہوگی۔ نقالی کے بجائے ذاتی تحقیق اور ایجاد سے کام لیا جائے گا۔ اور اس پر جو خرچ آئے گا انصاف کے ساتھ سب پر بانٹ دیا جائے گا۔(۴۵)

ہمارے عہد کی ہندوستانی تہذیب ابھی بن رہی ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ ان مختلف تہذیبوں میں جو آج کل ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار نظر آتی ہیں۔ امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، دُنیا میں کوئی تہذیب، جو اور تہذیبوں سے الگ تھلگ رہنا چاہے زندہ نہیں رہ سکتی۔ آج آریہ تہذیب کا ہندوستان میں کہیں وجود نہیں ہے، آریہ ہندوستان ہی کے اصلی باشندے تھے یا باہر سے گھس آئے تھے مجھے اِس سے بحث نہیں ہے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ میرے قدیم ترین بزرگ بے تکلف مل جل کر رہتے تھے اور ہم اِسی میل جول کا نتیجہ ہیں۔ آیا ہم اس سرزمین کو جس میں ہم پیدا ہوئے اور اِس چھوٹے کرۂ ارض کو جس نے ہمیں اپنی پشت پر اُٹھائے رکھا ہے کوئی فائدہ پہنچا رہے ہیں یا اس کے لیے ایک

بوجھ ہیں اُس کا فیصلہ مستقبل کو کرنا ہے۔ (۵)

میں نہیں چاہتا کہ میرے مکان کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں کھڑی ہوں اور اُس کی سب کھڑکیاں بند رہیں۔ میں تو دل سے چاہتا ہوں کہ میرے گھر دیس دیس کی ہوائیں خوب آئیں۔ خوب چلیں۔ مگر یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ ان ہواؤں کے زور سے میرے پاؤں اپنی زمین سے اکھڑ جائیں۔ میری عین خوشی ہے کہ ہمارے لڑکے لڑکیاں جو علمی ادبی مذاق رکھتے ہیں دل کھول کر انگریزی اور عالمی زبانیں سیکھیں اور پھر اپنے علم سے ہندوستان کو فائدہ پہنچائیں۔ بوس کی طرح۔ رے کی طرح، یا خود ہمارے شاعر کی طرح۔٭

مگر مجھے یہ گوارا نہیں کہ کوئی ہندوستانی اپنی مادری زبان کو بھول جائے۔ یا اُس سے غفلت برتے یا اُسے اپنی زبان کہتے ہوئے شرمائے۔ یا یہ محسوس کرے کہ وہ اُسے بہترین فکر یا اظہار فکر کا ذریعہ نہیں بنا سکتا۔ میرا مذہب قید خانہ کا مذہب نہیں ہے۔ (۶)

موسیقی روانی اور ترتیب کا دوسرا نام ہے، وہ بجلی کی طرح اثر کرتی ہے۔ فوراً سکون محسوس ہونے لگتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں شاستروں کی طرح موسیقی کا علم بھی چند لوگوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ وہ عہد جدید کی اصطلاح میں قومی ملکیت نہیں تھی۔ اگر مجھے بوائے اسکاؤٹ اور سیوا سمیتی کی تنظیم میں کچھ دخل ہوتا۔ تو میں قومی گیت مل کر قاعدے سے گانا لازمی قرار دیتا اور اس مقصد کے پیش نظر ہر کانفرنس یا کانگریس کے موقع پر بڑے بڑے مجمع کا رول کو ملاتا تاکہ وہ لوگوں کو مل کر گانا سکھائیں۔ (۷)

٭ بوس اور رے سے مراد مشہور سائنسداں سر جگدیش چندر بوس، سر پی سی رے ہیں اور ہمارے شاعر سے مراد رابندرناتھ ٹیگور ہیں۔

پنڈت کھرے کی رائے جو وسیع تجربے پر مبنی ہے، یہ ہے کہ موسیقی کو ہر پرائمری اسکول کے نصاب کا جز ہونا چاہئے۔ میں اس تجویز کی دل سے تائید کرتا ہوں۔ آواز کا سدھانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ہاتھ کا سدھانا۔ جسمانی ڈرل، دستکاری، ڈرائنگ اور موسیقی ساتھ ساتھ سکھائی جانی چاہیئے تاکہ لڑکوں اور لڑکیوں کی بہترین صلاحیتیں اُبھریں اور اُنہیں اپنی تعلیم میں حقیقی دلچسپی پیدا ہو۔ (۸)

آنکھیں، کان اور زبان ہاتھ سے مقدم ہیں۔ لکھے ہوئے کو پڑھنا پہلے سکھانا چاہئے اور لکھنا بعد میں۔ ڈرائنگ پہلے سکھائی جائے اور حروف تہجی کا چربا اُتارنا بعد میں۔ اگر اس قدرتی طریقہ کی پابندی کی جائے تو لڑکوں کی سمجھ بوجھ کو نشوونما پانے کا زیادہ موقع ملے گا۔ جب اُنہیں شروع ہی میں حروف تہجی لکھنے کی مشق کرائی جاتی ہے تو یہ نشوونما رُک جاتی ہے۔ (۹)

میرا ہرگز یہ خیال نہیں ہے کہ ہم دوسروں سے الگ تھلگ رہیں یا اپنے اور اُنکے درمیان دیواریں کھڑی کر لیں۔ مگر میں ادب کے ساتھ اتنا ضرور کہوں گا کہ دوسری تہذیبوں کا مطالعہ خود اپنی تہذیب کو جاننے اور اپنانے سے پہلے نہیں، بلکہ اُس کے بعد مناسب ہوگا۔ محض نظری مطالعہ بغیر عملی مشق کے اُس لاش کی طرح ہے۔ جسے مصالحہ لگا کر محفوظ کر لیا جائے شاید دیکھنے میں خوشنما معلوم ہو، مگر اُس سے کوئی فیضان یا علوئے نفس حاصل نہیں ہوتا۔ میرا مذہب مجھے اِس سے منع کرتا ہے کہ دوسروں کی تہذیبوں کی بے قدری کروں یا اُن کو نظر انداز کروں، اسی طرح جیسے اُس کی تاکید کرتا ہے کہ اپنی تہذیب کو اپناؤں اور اپنی زندگی کا دستور العمل بناؤں۔ ورنہ عمرانی خودکشی کا مرتکب ہوں گا۔ (۱۰)

اِس غلط اور بے بنیاد خیال کو دل سے نکال کر کہ ذہانت صرف کتابیں پڑھنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہمیں اِس حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے کہ ذہن کی نشوونما سب سے زیادہ تیزی کے ساتھ اِس طرح ہوتی ہے کہ ہم کوئی دستکاری سائنٹفک طریقے سے سیکھیں۔ سچی ذہنی نشوونما اسی وقت ثمر آور ہو جاتی ہے جب سیکھنے والے کو ہر ایک قدم پر، یہ بتایا جائے کہ ہاتھ کی یا

اوزار کی ہر ایک حرکت کس ضرورت کے ماتحت ہوتی ہے۔ اگر طالب علم اپنے آپ کو عام مزدوروں کی طرح سمجھیں تو اُن کی بے روزگاری کا مسئلہ آسانی سے حل ہو جائے گا۔ (۱۱)

میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ بچوں کو شروع میں زبانی تعلیم دیجائے۔ ننھے بچوں پر یہ بوجھ ڈالنا کہ وہ حروف تہجی سیکھیں اور پڑھنے کی مشق کریں قبل اس کے کہ اُنہیں کچھ معلومات حاصل ہو جائے مناسب نہیں ہے۔ یہ تو اُنہیں ایسی عمر میں جب ذہن تازہ ہوتا ہے۔ زبانی درس کے ذریعہ سیکھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتا ہے۔ (۱۲)

لکھنا پڑھنا سیکھ لینا بجائے خود انسان کی اخلاقی استعداد میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ تعمیر سیرت کو لکھنا پڑھنا سکھانے سے بالکل بے تعلق ہے۔ (۱۳)

میں اس اصول کا پُر زور حامی ہوں کہ ہندوستان میں ابتدائی تعلیم مفت اور جبری ہونی چاہئے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ اِس مقصد میں کامیابی صرف اِسی صورت میں ہو سکتی ہے جب طلباء کو کوئی مفید پیشہ سکھایا جائے۔ اور اِس کے ذریعہ سے اُن کی جسمانی ذہنی اور روحانی قوتوں کی تربیت کی جائے۔ کسی شخص کو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ تعلیم کے معاملہ میں مصارف کا حساب لگانا بے جا ہے یا گھٹیا بات ہے۔ معاشی پہلو کو ملحوظ رکھنے میں کوئی چھچھورا پن نہیں۔ سچی معاشیات کبھی اعلیٰ اخلاقی اقدار کے منافی نہیں ہوتی۔ اِسی طرح جیسے اخلاقیات صحیح معنوں میں وہی ہے جو معاشی حیثیت سے مناسب اور قابل عمل ہو۔ (۱۴)

میں مختلف سائنسوں کی تعلیم کی قدر کرتا ہوں، ہمارے بچے علم طبیعی اور علم کیمیاوی جتنا زیادہ سیکھیں۔ (۱۵)

میں بچے کے ہاتھ، دماغ اور روح کی صلاحیت کو نشو و نما دینا چاہتا ہوں۔ اِس وقت حالت یہ ہے کہ ہاتھ تو قریب قریب ماؤف ہو گئے ہیں۔ اور روح کی کسی کو فکر ہی نہیں ہے۔ (۱۶)

بچوں میں تجسس کا مادہ ہوتا ہے اور وہ زندگی کے بارے میں ساری باتیں معلوم

کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں یہ چاہیئے کہ اگر ہم جانتے ہوں تو اُنہیں بتا دیں اور اگر نہ جانتے ہوں تو اپنی ناواقفیت کا اعتراف کر لیں۔ اگر کوئی ایسی بات ہو جو بتانے کی نہیں تو ہم اُنہیں روک دیں اور یہ کہہ دیں کہ یہ سوال کسی اور سے کبھی نہ پوچھنا۔ مگر اُنہیں جھوٹ سچ کہہ کر بہلانے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔ وہ ایسے بھولے نہیں جیسے ہم سمجھتے ہیں، بلکہ وہ بہت کچھ جانتے ہیں، یہ ضرور ہے کہ اگر وہ نہ جانتے ہوں اور ہم بتانے سے انکار کر دیں تو وہ قابلِ اعتراض طریقے سے معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاہم اگر بات کو اُن سے چھپانا ضروری ہے تو پھر یہ جوکھم لینا ہی پڑے گا۔ (۱۷)

عقلمند ماں باپ اپنے بچوں کو غلطیاں کرنے دیتے ہیں۔ اگر وہ کبھی اپنی غلطی کا نتیجہ بھگتیں تو اُن کے لیئے اچھا ہی ہے۔ (۱۸)

ہم شہوتِ جنسی پر پردہ ڈال کر اُسے مغلوب کرنا یا قابو میں رکھنا چاہیں تو کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اِس لئے میری قطعی رائے ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو آلاتِ تناسل کی اہمیت اور صحیح استعمال بتانا چاہیئے۔ میں نے اپنے طور پر اِن لڑکوں اور لڑکیوں کو جن کی تربیت کی ذمہ داری مجھ پر تھی۔ یہ واقفیت بہم پہنچانے کی کوشش کی۔ مگر جس قسم کی جنسی تعلیم کی حمایت میں کر رہا ہوں، اُس کا مقصد یہ ہو کہ شہوتِ جنسی کو ضبط کیا جائے یا کسی برتر جذبے میں تحویل کر دیا جائے۔ یہ تعلیم ایسی ہو جس سے کہ بچے انسان اور حیوان کا بنیادی فرق سمجھ لیں اور اُن کے ذہن نشین ہو جائے کہ انسان کو یہ شرف حاصل ہے کہ اُسے دل کے ساتھ دماغ بھی عطا ہوا ہے۔ وہ صرف محسوس ہی نہیں کرتا بلکہ سوچتا بھی ہے اور اگر وہ اندھی جبلّت کو عقل کے قابو میں نہ رکھ سکا تو اپنا انسانیت کا مرتبہ کھو دے گا۔ انسان میں عقل احساس کو تیز کرتی ہے اور اُس کی رہنمائی کرتی ہے۔ حیوان میں روح خوابیدہ رہتی ہے۔ دل کو بیدار کرنے کے معنی ہیں خوابیدہ روح کو جگانا اور نیک و بد کا فرق سمجھانا۔ آج ہمارا سارا ماحول، ہمارا مطالعہ، ہماری فکر، ہمارا سماجی طرزِ عمل ایسا ہے

جو عام طور پر جنسی خواہش کو اکساتا ہے۔ اس کے شکنجے سے چھوٹنا آسان نہیں ہے۔ مگر یہ کام اتنا اہم ہے کہ ہمیں اس کے لئے دل و جان سے کوشش کرنی چاہیئے۔

گیارھواں باب

عورتیں

میری قطعی رائے ہے کہ ہندوستان کی نجات عورتوں کے ایثار اور روشن خیالی پر منحصر ہے (۱)

اہنسا کے معنی ہیں انتھاہ محبت اور دکھ اٹھانے کی انتھاہ طاقت۔ عورت سے، جو انسان کی ماں ہے، زیادہ یہ طاقت کس میں ہے؟ وہ اس طاقت کا اظہار اس طرح کرتی ہے کہ بچے کو نو مہینے پیٹ میں رکھ کر اپنے خونِ جگر سے اس کی پرورش کرتی ہے، اور اس میں جو دکھ اٹھانے پڑیں انھیں سکھ جان کر خوش ہوتی ہے بھلا دردِ زہ سے بڑھ کر تکلیف دہ اور کون سی چیز ہو سکتی ہے؟ مگر وہ تخلیق کی خوشی میں اس اذیت کو بالکل بھول جاتی ہے۔ اور پھر اس کے سوا اور کون دن رات اس فکر میں گھلتا ہے کہ بچہ روز بروز بڑھتا رہے؟ اُسے چاہیے کہ اس محبت کا رخ پوری نوعِ انسانی کی طرف موڑ دے اور اس بات کو دل سے دور کر دے کہ وہ کبھی انسان کی خواہشِ نفس کا موضوع تھی یا ہو سکتی ہے۔ پھر وہ مرد کے دوش بدوش اس کی ماں، اس کی جنم دینے والی،

اور خاموشی سے اس کی رہنمائی کرنے والی کی حیثیت سے عزت واحترام کے ساتھ رہے گی۔ اس کا یہ منصب ہے کہ جنگ میں اُلجھی ہوئی دُنیا کو جو ان کے آبِ حیات کی پیاسی ہے، امن سے رہنے کا ہنر سکھائے۔ (۲)

میری رائے میں جس طرح مرد اور عورت بنیادی طور پر ایک ہیں اُن کا مسئلہ بھی دراصل ایک ہونا چاہیئے۔ دونوں میں روح ایک ہی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرتے ہیں، ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ کسی نہ کسی طرح مرد قدیم زمانے سے عورت کو دباتا رہا ہے اور اس کی وجہ سے عورت میں احساسِ کمتری پیدا ہو گیا۔ مرد نے خودغرضی کی بنا پر اسے یہ سکھایا کہ وہ مرد سے کم تر ہے اور اس نے اس پر یقین کر لیا۔ مگر جو مرد صاحبِ بصیرت تھے انھوں نے ہمیشہ عورت کے مساوی درجے کو تسلیم کیا۔

پھر بھی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی نہ کسی نقطے پر پہنچ کر مرد اور عورت دو شاخوں میں بٹ گئے۔ یہ سچ ہے کہ وہ دراصل ایک ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ شکل وصورت کے لحاظ سے ان میں بڑا فرق ہے۔ اس لیے ان کے کام بھی الگ الگ ہونے چاہیئں۔ ماں کا فرض ہے، جو عورتوں کی بہت بڑی اکثریت ہمیشہ ادا کرتی رہیگی، کچھ ایسی صفات چاہتا ہے، جو مردوں میں ہونی ضروری نہیں۔ عورت میں انفعالیت ہوتی ہے۔ مرد فعال ہوتا ہے۔ عورت گھر والی ہے۔ مرد روٹی کمانے والا ہے عورت روٹی کی دیکھ بھال کرنے والی اور بانٹنے والی ہے۔ اس پر نگراں اور محافظ کا لقب ہر لحاظ سے صادق آتا ہے۔ نسلِ انسانی کے بچوں کو پالنے کا فرض اس کا مخصوص حصہ ہے جس میں کوئی اُس کا شریک نہیں۔ اگر وہ ان کی دیکھ بھال نہ کرے تو نسل ہی مفقود ہو جائے۔

میرے خیال میں اس میں مرد اور عورت دونوں کی ذلت ہے ________

کہ عورت سے گھر کو چھوڑ کر اُس کی حفاظت کے لئے بندوق سنبھالنے کو کہا جائے۔ یہ تو وحشیانہ زندگی کی طرف لوٹنا اور بربادی کا پہلا قدم ہو گا مرد کے مرکب پر سوار ہونے کی کوشش میں وہ خود بھی گرے گی اور اُس کو بھی کھینچ کر گرا دے گی۔ اس کا گناہ مرد کے سر ہو گا کہ اس نے اپنی رفیق کو دباؤ ڈال کر یا لالچ دے کر اس کے خاص منصب سے ہٹا دیا۔ گھر کے اندر نظم و ترتیب قائم رکھنے کے لئے اس سے کم ہمّت اور بہادری کی ضرورت نہیں جتنی اُسے باہر کے حملے سے بچانے کے لئے ہے۔ (۳)

اگر میں عورت ہوتا تو مرد کے اس دعوے کے خلاف بغاوت کر دیتا کہ عورت اس کا کھلونا بننے کے لئے پیدا کی گئی ہے مجھے عورت کے دل میں جگہ پانے کے لئے عورت کی ذہنیت اختیار کرنی پڑی۔ میں خود اپنی بیوی کے دل میں اس وقت جگہ پا سکا جب میں نے ان کے ساتھ اپنا طرزِ عمل بدلا اور شوہری کے نام نہاد حقوق سے دست بردار ہو کر انھیں اُن کے سارے حقوق واپس دے دیئے۔ (۴)

جتنے گناہ انسان نے اپنے سر لئے ہیں۔ اُن میں کوئی اتنا ذلّت آمیز، اتنا مکروہ، اتنا وحشیانہ نہ ہو گا جتنی وہ بدسلوکی، جو اس نے نوعِ انسانی کے نصف بہتر کے ساتھ کی۔ جسے لوگ صنفِ نازک کہتے ہیں، مگر میں صنفِ نسواں کہوں گا۔ دراصل عورت مرد پر شرف رکھتی ہے۔ اس لئے کہ آج بھی وہ مجسّم ہے ایثار کا، خاموشی سے دُکھ سہنے کا عجز، عقیدے اور علم کا۔ (۵)

عورت کو چاہیئے کہ اپنے آپ کو مرد کی خواہشِ نفس کا موضوع سمجھنا چھوڑ دے۔ اس رنگ کا علاج مرد سے زیادہ خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ (۶)

عفت وہ پودا نہیں جو گرم خانے میں رکھا جائے۔ اس کی حفاظت پردے کی دیواروں سے نہیں ہو سکتی۔ اُسے تو اندر سے اُگنا چاہیئے اور اس میں

اتنی قوّت ہونا چاہیئے کہ ہر تحریص کا مقابلہ کر سکے ۔ (۷)

آخر عورتوں کی عصمت کی طرف سے یہ مریضانہ تشویش کیوں؟ کیا عورتوں کو مردوں کی پاکبازی کی دیکھ بھال کی فکر ہو؟ پھر مرد عورتوں کی عصمت کے نگراں کیوں بن بیٹھے ہیں؟ یہ ایسی چیز نہیں جو باہر سے ٹھونسی جائے۔ یہ تو اندر سے پیدا ہونے والی چیز ہے اور فرد کی ذاتی کوشش سے تعلق رکھتی ہے ۔ (۸)

میرے نزدیک عورت مجسّم ایثار ہے ۔ مگر بدقسمتی سے آج وہ محسوس نہیں کرتی کہ مرد سے کتنی زیادہ طاقت ور ہے ۔ بہ قول ٹالسٹائی کے مرد نے عورت کو ہپنا ٹزم کے اثر سے مسحور کر رکھا ہے ۔ اگر اُسے اہنسا کی طاقت کا اندازہ ہو جائے تو کبھی صنفِ نازک کہلانا قبول نہ کرے (۹)

عورت کو صنفِ نازک کہنا اُس کی ہتکِ عزت ہے ۔ یہ ناانصافی ہے جو مرد اس کے ساتھ کرتا ہے ۔ اگر طاقت سے مراد بہیمی طاقت ہے تو اس میں شک نہیں کہ عورت میں بہیمیت مرد سے کم ہے لیکن اگر اخلاقی طاقت مراد ہے تو اس میں عورت مرد سے کہیں بڑھ کر ہے ۔ کیا اُس میں حسِ وجدانی مرد سے زیادہ نہیں؛ کیا وہ مرد سے زیادہ ایثار کرنے والی، اس سے زیادہ جفاکش اس سے زیادہ باہمت نہیں؟ اس کے بغیر مرد کا وجود ہی نہیں ہوتا ۔ اگر اہنسا ہماری زندگی کا قانون ہے تو مستقبل عورت کا ہے ۔ عورت سے بڑھ کر کون دل پر اثر کر سکتا ہے ۔ (۱۰)

عورتیں زندگی کے سارے اخلاقی اور مذہبی سرمائے کی محافظ ہیں ۔ قدرتی طور پر قدامت پسند ہونے کی وجہ سے جہاں وہ اوہام پرستی کی عادتوں کو آسانی سے نہیں چھوڑتیں وہاں زندگی کی پاکیزہ اور شریفانہ قدروں کو بھی آسانی سے ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں ۔ (۱۱)

میں عورتوں کو مناسب طریقے سے تعلیم دینے کا حامی ہوں مگر اسی کے ساتھ

ساتھ میرا یہ خیال ہے کہ وہ دُنیا کو جو کچھ دے سکتی ہیں وہ اس طرح سے نہیں کہ مردوں کی نقل یا اُن سے مقابلہ کریں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ مرد کی ریس کر سکتی ہیں۔ لیکن اس طرح اُن بلند مدارج تک نہیں پہنچ سکتیں۔ جہاں پہنچنے کی اُن میں صلاحیت ہے انھیں تو ایسا بننا چاہیئے کہ مردوں میں جو کمیاں ہیں انھیں پورا کر سکیں۔ (۱۲)

عورت مرد کی رفیق ہے اور اس کے برابر ذہنی صلاحتیں رکھتی ہے۔ وہ مردوں کی ہر ایک چھوٹی سے چھوٹی سرگرمی میں حصّہ لے سکتی ہے اور آزادی کے ذہنی حقوق رکھتی ہے جو مرد کو حاصل ہیں۔ اسے اپنے دائرہ عمل میں وہی بلند مقام حاصل ہے جو مرد کو اپنے دائرے میں ہے۔ یہ قدرتی صورت حال ہونی چاہیئے۔ بغیر اس قید کے کہ ہر عورت لکھنا پڑھنا سیکھے۔ محض بے جا رسم و دستور کے بل پر جاہل محض اور نکمّے مردوں تک کو عورتوں پر وہ تفوق حاصل رہا ہے جس کے وہ مستحق نہیں ہیں اور جو انھیں ہرگز حاصل نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ (۱۳)

اگر کہیں عورتیں یہ بھول سکتیں کہ وہ صنفِ نازک سے تعلق رکھتی ہیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ جنگ کی مخالفت میں مردوں سے زیادہ کام کر سکتی تھیں۔ آپ خود ہی سوچیئے کہ آپ کے بڑے بڑے سپاہی اور سپہ سالار کیا کریں گے اگر ان کی مائیں اور بیٹیاں اس پر اڑ جائیں کہ انھیں کسی صورت سے فوجی کارروائیوں میں حصّہ نہیں لینے دیں گی۔ (۱۴)

ایک بہن نے جو ایک اچھّی کارکن ہیں، اور جن کا ارادہ تھا کہ عمر بھر کنواری رہیں تاکہ قومی کام اور اچھّی طرح کر سکیں، حال میں شادی کر لی ہے۔ اس لئے کہ انھیں اپنا آدرش رفیقِ زندگی مل گیا ہے۔ مگر انھیں یہ خیال ہے کہ ایسا کرنے سے وہ نصب العین کی بلندی سے جو انہوں نے اپنے سامنے رکھا تھا نیچے گر گئی ہیں۔ میں نے اس وہم کو ان کے دل سے نکالنے کی کوشش کی۔ اس میں شک نہیں اگر لڑکیاں قومی خدمت کی خاطر

بن بیاہی رہیں تو بہت اچھی بات ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ کہیں لاکھوں میں ایک اس ارادے میں کامیاب ہوتی ہے۔ شادی ایک قدرتی چیز ہے اور اسے کسی اعتبار سے بھی معیوب سمجھنا غلط ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے کسی فعل کو گراوٹ سمجھ لے۔ تو پھر وہ کتنی ہی کوشش کرے اس کا اخلاقی ترقی کرنا دشوار ہے۔ نصب العین یہ ہونا چاہیئے۔ کہ انسان شادی کو ایک مقدس عہد سمجھے اور شادی کے بعد ضبطِ نفس کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ ہندو دھرم میں شادی چار آشرموں میں سے ایک ہے۔ دراصل باقی تینوں آشرم اسی کی نسبت سے متعین کیے گئے ہیں۔ جن بہن کا ذکر ہے۔ اُن کو اور اُن کی ہم خیال بہنوں کو چاہیئے کہ شادی کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں بلکہ اُسے وہ اہمیت دیں جس کی وہ مستحق ہے اور سچ مچ ایک مقدس عہد ثابت کر دیں۔ اگر وہ واقعی ضبطِ نفس سے کام لیں تو وہ اپنے اندر خدمت کی او زیادہ قوت پائیں گی۔ جو عورت قومی خدمات کرنا چاہتی ہے۔ وہ اپنا رفیق زندگی بھی ایسا ہی تلاش کرے گی جو اس کا ہم خیال ہو اور دونوں کی متفقہ خدمت سے ملک کو اور زیادہ فائدہ پہنچے۔ (۱۵)

شادی سے دو شخصوں کو جو ایک دوسرے کے شریک حیات ہیں یہ حق بلا شرکت غیرے مل جاتا ہے کہ جب دونوں کی متفقہ خواہش ہو تو ایک دوسرے کے ساتھ ہم بستر ہوں۔ مگر دونوں میں سے کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ دوسرے کو ہمبستری پر مجبور کرے۔ یہ ایک جداگانہ سوال ہے کہ جب ایک شریک اخلاقی وجہ سے یا دوسری وجہ سے دوسرے شریک کی خواہش کو پورا نہیں کر سکتا۔ تو پھر کیا کیا جائے۔ اگر طلاق کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو تو میں ذاتی طور پر اس صورت میں جب میں خالص اخلاقی وجوہ سے ہم بستری سے باز رہنا چاہتا ہوں طلاق پر تیار ہو جاؤں گا مگر اپنی روحانی ترقی میں رکاوٹ نہیں پڑنے دوں گا۔ (۱۶)

یہ بہت افسوسناک بات ہے کہ ہماری لڑکیوں کو عام طور پر ماں کے

فرائض نہیں سکھائے جاتے۔ لیکن اگر بیاہ کرنا ایک مذہبی فرض ہے تو ماں بننا بھی فرض ہونا چاہیے۔ اچھی ماں بننا کوئی آسان چیز نہیں ہے۔ بچے پیدا کرنے کا کام پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ انجام دینا پڑتا ہے۔ ماں کو یہ جاننا چاہیے کہ حمل قرار پانے سے لے کر بچے کی پیدائش تک ہر قدم پر اس کا فرض کیا ہے اور جو عورت اپنے ملک کو سمجھدار، تندرست، تربیت یافتہ بچے پیش کرے وہ یقیناً ایک مفید خدمت انجام دیتی ہے۔ بڑے ہو کر یہ بچے بھی خدمت کے لیے تیار ہوں گے۔ سچی بات یہ ہے کہ جن لوگوں میں خدمت کی جیتی جاگتی روح موجود ہے وہ ہر حیثیت سے خدمت کریں گے اور کبھی ایسی زندگی اختیار نہیں کریں گے جس سے خدمت کی راہ میں رکاوٹ پڑے (۱۷)

"بعض لوگ عورت کے حقِ ملکیت سے متعلق قانون میں کسی ترمیم کی مخالفت اس بنا پر کرتے ہیں کہ عورتوں کے معاشی حیثیت سے آزاد ہونے کی وجہ سے ان میں بدچلنی پھیلے گی اور گھریلو زندگی درہم برہم ہو جائے گی۔ آپ کا اس سوال کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

میں اس سوال کے مقابلے میں ایک اور سوال پوچھتا ہوں۔

مردوں میں تو معاشی حیثیت سے آزاد ہونے اور مالک ہونے کی وجہ سے بدچلنی نہیں پھیلی؟ اگر آپ اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں تو عورتوں کے سلسلے میں بھی یہی سمجھیے۔ جب عورتوں کو بھی مردوں کی طرح ملکیت وغیرہ کے حقوق مل جائیں گے تو آپ یہ دیکھیں گے کہ ان حقوق کے ملنے کا ان کی بدچلنی یا نیک چلنی سے کوئی تعلق نہیں جو نیک چلنی عورت یا مرد کی مجبوری اور بے بسی کی وجہ سے ہو وہ کوئی قابلِ تعریف چیز نہیں۔ نیک چلنی کی جڑ تو ہمارے دلوں کے اندر ہے۔ (۱۸)

ایک نوجوان نے مجھے ایک خط لکھا ہے جس کا یہاں صرف خلاصہ ہی دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے۔

"میں ایک بیاہا آدمی ہوں۔ میں پردیس گیا ہوا تھا۔ میرا ایک دوست ہے جس پر میں اور میرے والدین آنکھ بند کر کے بھروسا کرتے تھے۔ اس نے میرے پیچھے میری بیوی کو پھسلا کر اس سے بدکاری کی اور اُسے حمل رہ گیا۔ اب میرے والد کا اصرار ہے کہ اسے اسقاط کرانا چاہیے ورنہ خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔ میرے خیال میں ایسا کرنا غلط ہوگا۔ بیچاری عورت شرم سے مری جاتی ہے۔ اُس نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔ اور ہر وقت روتی رہتی ہے۔ آپ ازراہِ کرم میری ہدایت فرمائیں کہ ایسی صورت میں میرا کیا فرض ہے؟" میں نے یہ خط ہچکچاتے ہوئے شائع کیا ہے۔ جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے اس طرح کے واقعات ہمارے سماج میں بہت شاذ نہیں ہیں۔ اس لئے اس مسئلے پر احتیاط کے ساتھ پبلک میں بحث کی جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ یہ تو میرے خیال میں روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے کہ اسقاط ایک مجرمانہ فعل ہوگا۔ نہ جانے کتنے شوہر اسی حرکت کے مرتکب ہوتے ہیں جو اس بیچاری عورت سے سرزد ہوئی اور ان سے کوئی بازپرس نہیں کرتا۔ سماج نہ صرف انھیں معاف کر دیتی ہے بلکہ ملامت تک نہیں کرتی۔ پھر عورت اپنی فضیحت کو چھپا نہیں سکتی اور مرد اپنے گناہ کو پوشیدہ رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

جس عورت کا ذکر ہے۔ اس کی حالت قابلِ رحم ہے۔ اُس کے شوہر کا متدل فرض ہے کہ بچے کی بڑی شفقت و محبت کے ساتھ پرورش کرے اور اپنے والد کے مشورے کو ماننے سے انکار کر دے البتہ یہ سوال نازک ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہے یا نہ رہے۔ ممکن ہے حالات کا تقاضا یہ ہو کہ وہ اس سے الگ ہو جائے۔ ایسی صورت میں اس کا فرض ہے کہ اس کے نان نفقے اور تعلیم کا خرچ اُٹھائے اور اسے عزت و آبرو سے زندگی بسر کرنے میں مدد دے۔ اور مجھے اس میں بھی کوئی بُرائی نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اسے اپنے ساتھ رکھے۔ بشرطیکہ اس کی ندامت سچی ہو۔ بلکہ میں ایسی

صورتِ حال کا بھی تصور کر سکتا ہوں جس میں شوہر کا یہ مقدس فرض ہوگا کہ اگر اس کی قصوروار بیوی نے اپنے قصور کی پوری طرح تلافی کر دی ہے تو اسے بلا کر اپنے ساتھ رکھے۔ (۱۹)

انفعالی مقاومت کمزوروں کا حربہ سمجھی جاتی ہے۔ مگر وہ مزاحمت جس کے لئے ایک نام گھڑنا پڑا زیادہ سے زیادہ طاقت رکھنے والوں کا حربہ ہے۔ اس کی بے مثل خوبی یہ ہے کہ گو وہ طاقت وروں کا ہتھیار ہے مگر جسمانی حیثیت سے کمزور اشخاص، بوڑھے بلکہ بچے بھی اگر مضبوط دل رکھتے ہوں۔ اس سے کام لے سکتے ہیں اور چونکہ ستیا گرہ میں جو مزاحمت ہوتی ہے، وہ اپنے اوپر دکھ اٹھا کر کی جاتی ہے اس لئے یہ ایک ایسا ہتھیار ہے، جس سے عورتیں بھی بہت اچھی طرح کام لے سکتی ہیں۔ پچھلے سال ہم نے دیکھا کہ ہندوستان میں عورتیں بہت سے موقعوں پر، دکھ اٹھانے میں اپنے بھائیوں سے بازی لے گئیں اور دونوں نے آزادی کی مہم میں اپنی اپنی جگہ شاندار رول ادا کیا۔ ملک کی خدمت کے لیے دکھ اٹھانے کی ایسی ہوا چلی کہ انھوں نے ایثار و قربانی کے حیرت انگیز کرشمے دکھائے۔ فرض کیجئے کہ یورپ میں عورتوں اور بچوں کے دلوں میں نوعِ انسان کی محبت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ پھر تو وہ مردوں پر اچانک اس طرح ہلّہ بول دیں گے کہ آن کی آن میں سارا فوجی نظام حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا۔ یہاں بنیادی تصور یہ ہے کہ عورتیں اور بچے اور دوسروں میں ایک ہی روح ہے ایک ہی طرح کی صلاحیتیں ہیں۔ سوال اس کا ہے کہ حق کی نامحدود قوت کو جو ان کے اندر موجود ہے کس طرح ابھارا جائے۔ (۲۰)

جب ایک عورت کی عصمت پر حملہ کیا جائے تو اسے ہنسا اور اہنسا کے حلقہ میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ اس کا سب سے مقدم فرض اپنی حفاظت ہے۔ اسے اختیار ہے کہ اپنی عزت بچانے کا جو طریقہ بھی سوجھے اس سے کام لے۔ اسے خدا نے ناخون اور

ذات دیئے ہیں۔ وہ انھیں پوری طاقت کے ساتھ استعمال کرے اور ضرورت ہو تو اس کوشش میں جان دے دے۔ جس مرد یا عورت نے موت کا خوف دل سے نکال دیا ہو اس میں یہ قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ نہ صرف اپنی حفاظت بلکہ اپنی جان دے کر دوسروں کی حفاظت کر سکے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم موت سے بہت ڈرتے ہیں۔ اس لیے آخر میں اس شخص سے جس کے پاس ہم سے زیادہ جسمانی طاقت ہے ہار مان لیتے ہیں۔ بعض لوگ حملہ آوروں کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ بعض رشوت سے کام لیتے ہیں۔ بعض پیٹ کے بل گھسٹتے ہیں اور دوسری طرح کی ذلتیں اٹھاتے ہیں۔ بعض عورتیں اپنا جسم ان کے حوالے کر دیتی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح موت سے بچ جائیں۔ میں یہ نکتہ چینی کے طور پر نہیں لکھ رہا ہوں۔ میں تو صرف انسانی فطرت کی کمزوری کی مثالیں پیش کر رہا ہوں۔ چاہے ہم پیٹ کے بل گھسٹتے ہوں، یا عورتیں مرد کی خواہش نفس کے آگے جھکتی ہوں۔ یہ سب اس کی علامتیں ہیں کہ انسان کو جان بہت پیاری ہے۔ اسی لئے وہ ذلیل سے ذلیل حرکت پر اتر آتا ہے۔ لہذا صرف وہی شخص جو اپنی عزت کے لیے جان دے دے در اصل جان کی حفاظت کرتا ہے۔ زندگی کا لطف تب آتا ہے جب انسان کو زندگی کا موہ نہ رہے۔ اس اصول کو ہماری فطرت کا جزین جانا چاہیئے[21]

میرے نزدیک تو تشدد کی تیاری کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ساری تیاری اہنسا کی کرنی ہے۔ اگر ہم اپنے ہاں اعلیٰ درجے کی ہمت اور بہادری پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ فرض کیجیے کچھ عورتیں ایسی ہیں کہ وہ بغیر ہتھیاروں کے اپنی حفاظت نہیں کر سکتیں تو انھیں اس مشورے کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ ہتھیار رکھا کریں۔ وہ خود ہی رکھیں گی۔ بار بار یہ سوال کرنا کہ ہتھیار رکھیں یا نہ رکھیں، ٹھیک نہیں۔ لوگوں کو جو بات سیکھنی ہے وہ یہ ہے کہ وہ آزاد شخص ہوں۔ اگر وہ اس مرکزی نکتے کو یاد رکھیں کہ سچی اور موثر حفاظت اہنسا ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے تو وہ اپنے طرز عمل کو ضرورت کے مطابق ڈھال لیں گے

یہی دنیا کر رہی ہے۔ اگرچہ اُسے اس کا شعور نہیں ہے۔ چونکہ اس میں اعلیٰ درجے کی ہمت،
یعنی وہ ہمت جو اہنسا سے پیدا ہوتی ہے نہیں ہے اس لئے وہ اپنے آپ کو طرح
طرح کے ہتھیاروں سے جن میں ایٹم بم بھی شامل ہے، مسلح کر رہی ہے۔ جن لوگوں کو
اب بھی یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ تشدّد محض بیکار ہے وہ ظاہر ہے، جتنے زیادہ ہتھیار
فراہم کر سکتے ہیں کریں گے۔ (۲۲)

امریکہ کی عورتوں کو یہ دکھانا ہے کہ عورت دنیا میں کتنی بڑی طاقت بن سکتی ہے۔
مگر یہ آپ لوگ تبھی کر سکتی ہیں، جب آپ مردوں کے کھلونے، جن سے وہ فرصت کی
گھڑیوں میں دل بہلاتے ہیں، نہ بنیں۔ آپ کو آزادی حاصل ہے۔ آپ امن کی ایک
زبردست علمبردار بن سکتی ہیں اگر آپ نفس پروری کو فروغ دینے والی جھوٹی سائنس
کے سیلاب میں نہ بہہ جائیں، جو آج سارے مغرب میں آیا ہوا ہے، بلکہ اس کے
بجائے اہنسا کی سائنس پر توجہ دیں۔ اس لئے کہ عفو اور رحم آپ کی فطرت ہے مردوں
کی نقالی کر کے نہ تو آپ مرد بن سکتی ہیں اور نہ اپنی اصلی فطرت پر قائم رہ کر اپنے خاص جوہر
کو جو آپکو ودیعت کیا گیا ہے نشوونما دے سکتی ہیں۔ خدا نے عورتوں کو اہنسا کی قوت
مردوں سے زیادہ بخشی ہے۔ یہ ایک خاموش اور بے نمود قوت ہے۔ اسی لئے اور زیادہ
مؤثر ہے۔ عورتیں اہنسا کے ربّانی پیام کی قدرتی پیامبر ہیں۔ بس اس کی ضرورت
ہے کہ انھیں اس بلند مرتبے کا احساس ہو جائے۔ (۲۳)

مگر مجھے دل سے یقین ہے کہ اگر ہندوستان کے مرد عورت اپنے اندر یہ ہمت
پیدا کر لیں کہ اہنسا سے کام لیتے ہوئے بہادری کے ساتھ موت کا سامنا کر سکیں تو
اسلحہ کی قوت کو چٹکیوں میں اڑا سکتے ہیں اور ہندوستان کے لئے خالص آزادی
یعنی عوامی حکومت حاصل کر سکتے ہیں جو دُنیا کے لئے نمونے کا کام دے۔ اس میں
عورتیں مردوں سے آگے رہ سکتی ہیں۔ اس لئے کہ وہ اہنسا کی قوت کی مجسم تصویر ہیں۔ (۲۴)

بارھواں باب

متفرق مسائل

مجھے مستقبل کا حال معلوم کرنے کی آرزو نہیں ہے، مجھے تو صرف موجودہ لمحے کی فکر ہے۔ اس کے بعد آنے والے لمحے پر خدا نے مجھے کوئی اختیار نہیں دیا ہے۔ (۱)

میں سنکی، خبطی دیوانہ مشہور ہوں۔ بظاہر یہ شہرت بے جا نہیں اس لیے کہ میں جہاں کہیں جاتا ہوں، سنکی خبطی، دیوانے میری طرف کھنچ کر چلے آتے ہیں۔ (۲)

دنیا کو کیا معلوم کہ میری نام نہاد عظمت کا دارومدار بڑی حد تک خاموش، وفادار، قابل اور بے نفس کارکنوں، مردوں اور عورتوں کی مسلسل محنت اور مشقت پر ہے۔ (۳)

میں اپنے آپ کو کند ذہن آدمی سمجھتا ہوں۔ بعض باتوں کے سمجھنے میں مجھے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیر لگتی ہے۔ مگر مجھے اس کی پروا نہیں۔ انسان کی ذہنی ترقی کی ایک حد ہے۔ مگر قلب انسانی کی صلاحیتوں کے نشو و نما کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ (۴)

یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ذہنی قابلیت کا حصہ میری زندگی میں بہت کم ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں ایک کند ذہن آدمی ہوں۔ میرے حق میں یہ بالکل صحیح ہے کہ خدا صاحب ایمان کو اتنی ہی عقل دیتا ہے جتنی اس کے لیے ضروری ہو۔ میں نے ہمیشہ بزرگوں اور دانشمندوں کا احترام کیا ہے اور ان سے عقیدت رکھی ہے مگر مجھے سب سے زیادہ عقیدت حق سے ہے۔ اس لئے میری راہ دشوار سہی مگر مجھے آسان معلوم ہوتی ہے۔ (۵)

اکثر صورتوں میں جو ایڈریس مجھے دیئے جاتے ہیں۔ ان میں وہ تعریفی الفاظ ہوتے ہیں، جو مجھ پر کسی طرح نہیں پھبتے۔ ان کا استعمال نہ لکھنے والوں کے لئے اچھا ہے نہ میرے لئے۔ ان کی وجہ سے خواہ مخواہ میری سبکی ہوتی ہے، اس لئے مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں ان کا مستحق نہیں ہوں۔ اور جب مستحق ہوتا ہوں تو ان کا استعمال بیکار ہے۔ اس سے ان خوبیوں میں جو مجھ میں موجود ہیں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ البتہ اگر میں ہوشیار نہ رہوں تو یہ ہو سکتا ہے کہ (اپنی تعریف سن کر) میرا دماغ خراب ہو جائے۔ جو اچھے کام انسان کرتا ہے اُن کا ذکر کرنے سے نہ کرنا بہتر ہے۔ تقلید تعریف کی سب سے زیادہ پر خلوص شکل ہے۔ (۶)

منزلِ مقصود ہمیشہ ہم سے دور ہوتی جاتی ہے۔ راہ طلب میں جتنی زیادہ سعی کرتے ہیں اتنا ہی نارسائی کا احساس اور بڑھتا ہے۔ تسکین سعی میں ہوتی ہے۔ اتمام میں نہیں، کامل سعی کو کامل کامیابی سمجھنا چاہیے۔ (۷)

میرے ذہن میں اپنے مشن کا تصوّر یہ نہیں ہے کہ قدیم سورماؤں کی طرح دنیابھر

میں گھومتا رہوں اور لوگوں کو مشکلوں سے نجات دیتا رہوں۔ میرا ناچیز کام یہ رہا ہے کہ لوگوں کو اپنی مشکلیں خود حل کرنے کا طریقہ بتاؤں۔ (۸)

اگر میں سیاست میں الجھا ہوا نظر آتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاست نے ہمیں سانپ کی طرح اپنے حلقوں میں اس طرح جکڑا ہے کہ کتنے ہی ہاتھ پاؤں ماریں، اُن سے نکل نہیں سکتے۔ اس لیے میں اس سانپ سے زور آزمائی کرنا چاہتا ہوں۔ (۹)

میرا سماجی اصلاح کا کام کسی طرح سیاسی کام سے اہمیت میں کم یا اس کے تابع نہیں تھا۔ دراصل جب میں نے دیکھا کہ میرا سماجی کام ایک حد تک بغیر سیاسی کام کی مدد کے ناممکن ہے تو میں نے آخر الذکر کو ہاتھ میں لیا اور وہ بھی صرف اسی قدر جس سے مجھے اول الذکر میں مدد ملے۔ اس لیے اعتراف کرنا چاہیے کہ سماجی کام یا وہ تہذیب نفس جو اس سے حاصل ہوتی ہے۔ مجھے خالص سیاسی کام سے بدرجہا زیادہ عزیز ہے۔ (۱۰)

میں خود چار بچوں کا باپ ہوں، جن کی میں نے اپنے خیال کے مطابق بہت اچھی تربیت کی ہے۔ میں اپنے ماں باپ کا نہایت فرماں بردار بیٹا اور اپنے استادوں کا اتنا ہی فرماں بردار شاگرد تھا۔ میں اس فرض کی قدر و قیمت کو جانتا ہوں جو بیٹے پر باپ کی طرف سے عائد ہوتا ہے۔ مگر ان سب سے بڑھ کر میں اس فرض کو سمجھتا ہوں جو خدا کی طرف سے عائد ہوتا ہے۔ (۱۱)

مجھے اس سے انکار ہے کہ میں خیال پرست ہوں۔ میں یہ بھی نہیں مانتا کہ ولی ہوں۔ میں تو ایک دنیا دار آدمی ہوں۔ مجھ میں وہی کمزوریاں ہیں جو آپ میں ہیں۔ مگر میں نے دنیا دیکھی ہے۔ میں نے زندگی اس طرح بسر کی ہے کہ آنکھیں کھلی رکھیں۔ میں سخت سے سخت آزمائش سے جس سے انسان کو گذرنا پڑتا ہے۔ گزرا ہوں۔ میں نے ضبط کی یہ سب منزلیں طے کی ہیں۔ (۱۲)

میں نے اس اصول کو کہ ہمیشہ ایک ہی بات پر قائم رہوں، بت بنا کے نہیں پوجا۔ میں حق کا پرستار ہوں اور مجھے وہی کہنا چاہیئے جو میں کسی مسئلے کے بارے میں ایک خاص لمحے میں سمجھتا اور محسوس کرتا ہوں بلا لحاظ اس کے کہ میں نے پہلے اس کے بارے میں کیا کہا تھا۔ جیسے جیسے میری چشم بصیرت روشن ہوتی ہے۔ میرے خیالات بھی روزمرہ کے عمل سے زیادہ واضح ہوتے چلتے ہیں، جہاں کہیں میں نے جان بوجھ کر اپنی رائے بدلی ہے۔ یہ تبدیلی صریحی طور پر نظر آنی چاہیئے لیکن میرے خیالات کا تدریجی اور غیر محسوس ارتقا صرف اُسی کو نظر آ سکتا ہے جس کا مشاہدہ بہت باریک ہو۔ (۱۳)

مجھے اس کی بالکل فکر نہیں کہ میرے خیالات ہمیشہ ایک سے نظر آئیں۔ حق کی تلاش میں میں نے بہت سے خیالات کو ترک کیا اور بہت سی نئی چیزیں سیکھیں۔ گو میں عمر کے لحاظ سے بوڑھا ہوں۔ مگر مجھے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ میری باطنی نشو ونما رک گئی ہے یا جسم کے فنا ہونے کے بعد رک جائے گی۔ مجھے تو بس اس کی فکر ہے کہ میں حق کی آواز پر جو میرا خدا ہے لحظہ بہ لحظہ لبیک کہتا رہوں۔ (۱۴)

لکھتے وقت میں کبھی اس کا خیال نہیں کرتا کہ میں نے پہلے کیا لکھا تھا۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ میں کسی مسئلے کے متعلق جو کچھ کہوں وہ میرے پچھلے قول کے مطابق ہو بلکہ یہ فکر رہتی ہے کہ وہ حق کے اس تصوّر کے مطابق ہو جو اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں حق سے قریب تر ہوتا گیا اب مجھے اپنے حافظے پر غیر ضروری بوجھ نہیں ڈالنا پڑا اور پھر لطف یہ ہے کہ جب کبھی مجھے اپنی پچاس برس پہلے کی تحریروں کا آج کی تحریروں سے مقابلہ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ میں نے اُن میں کوئی منافات نہیں پائی۔ مگر جن دوستوں کو منافات نظر آئے اُن کے لئے مناسب یہ ہے کہ اس بات کو اختیار کریں جو میں نے اپنی تازہ ترین تحریر میں کہی ہے۔ بجز اس کے کہ وہ ان کو پرانی بات قابل

ترجیح معلوم ہو۔ مگر دو میں سے ایک کو اختیار کرنے سے پہلے انھیں اچھی طرح دیکھ لینا چاہیئے کہ کہیں ان دونوں باتوں میں جو بظاہر ایک دوسرے کے منافی معلوم ہوتی ہیں کوئی گہری اور دائمی مطابقت تو نہیں ہے۔ (۱۵)

جس پرارتھنا میں حضورِ قلب ہو الفاظ نہ ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس میں الفاظ ہوں، حضورِ قلب نہ ہو۔ (۱۶)

میرے ترکِ تعاون کی تہ میں نفرت نہیں محبت ہے میرا ذاتی مذہب مجھے کسی شخص سے نفرت کرنے کی قطعی ممانعت کرتا ہے۔ یہ بات جو سیدھی سادی، مگر بڑی اونچی ہے۔ میں نے بارہ برس کی عمر میں ایک مذہبی کتاب میں پڑھی تھی۔ اس وقت سے یہ عقیدہ میرے دل میں بیٹھ گیا ہے اور روز بروز گہرا ہوتا جاتا ہے۔ اب یہ ایک شدید جذبہ بن گیا ہے۔ (۱۸)

جو بات افراد پر صادق آتی ہے۔ وہی قوموں پر بھی صادق آتی ہے۔ معاف کر دینا بہرحال اچھا ہے۔ کمزور عفو نہیں کر سکتے۔ عفو اُن لوگوں کی صفت ہے جو قوی ہیں۔ (۱۹)

دکھ اٹھانے کی واضح حدود ہیں۔ یہ دانائی کا فعل بھی ہو سکتا ہے اور نادانی کا بھی۔ مناسب حد تک پہنچنے کے بعد زیادہ دکھ اٹھانا عقلمندی نہیں بلکہ انتہائی حماقت ہے۔ (۲۰)

ہماری قوم میں سچّی روحانیت اس وقت پیدا ہوگی۔ جب ہمارے پاس سونے سے زیادہ سچائی ہو۔ قوت و دولت کے دبدبے سے زیادہ جرأت و بے خوفی ہو۔ خود پرستی سے زیادہ محبت اور ہمدردی ہو۔ اگر ہم اتنا کر سکیں کہ اپنے گھروں، محلوں اور مندروں کو دولت کے لوازم سے پاک کر کے اخلاق کے لوازم سے آراستہ کریں تو ہم دشمنوں کی طرف سے بڑی متحدہ قوت کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ بغیر اس کے کہ ہمیں ایک

ایک بڑی فوج رکھنے کا بار اُٹھانا پڑے۔ (۲۱)

میں اسے بہت بہتر سمجھتا ہوں کہ ہندوستان صفحۂ ہستی سے مٹ جائے اس کے مقابلے میں کہ وہ حق کی قربانی دے کر آزادی حاصل کرے۔ (۲۲)

اگر مجھ میں خوش طبعی کا مادّہ نہ ہوتا تو کب کا خودکشی کر چکا ہوتا۔ (۲۳)

اگر میرا کوئی فلسفہ کہا جاسکتا ہے، تو اس میں اس خیال کی گنجائش نہیں کہ ہمارے مقصد کو بیرونی قوتوں سے ضرر پہنچ سکتا ہے، ضرر تو اسی وقت پہنچتا ہے اور پہنچنا بھی چاہیے، جب مقصد خود بُرا ہو یا اس صورت میں کہ مقصد تو اچھا ہو مگر اس کی حمایت کرنے والے جھوٹے یا بزدل یا ناپاک ہوں۔ (۲۴)

کچھ ایسی بات ہے کہ میں لوگوں کی بہترین صلاحیتوں کو اُبھارنے میں کامیاب ہوتا ہوں اس کی بدولت میرا عقیدہ خدا پر اور انسانی فطرت پر اب تک قائم ہے۔ (۲۵)

اگر میں ویسا ہوتا کہ جیسا ہونا چاہتا ہوں تو مجھے کسی سے بحث کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ میرے منہ سے بات نکلتے ہی لوگوں کے دلوں میں اُتر جاتی بلکہ سچ پوچھیے تو بات کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ محض ارادے کا وہی اثر ہوتا۔ مگر مجھے دُکھ کے ساتھ اپنی کوتاہیوں کا احساس ہے۔ (۲۶)

عقلیت پسند بڑے اچھے لوگ ہیں۔ مگر عقلیت جب قادرِ مطلق ہونے کا دعویٰ کرے تو راکشس بن جاتی ہے عقل کو قادرِ مطلق ماننا اسی طرح بُت پرستی ہے جیسے پتھر کو دیوتا سمجھ کر پوجنا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ عقل کو معطل کر دیا جائے بلکہ اس پر زور دینا ہوں کہ اس قوت کو جو ہمارے اندر ہے اور عقل کو خاک سے پاک کرتی ہے، پہچانو اور اس کا احترام کرو۔ (۲۷)

ہر قسم کی اصلاحی تحریک میں اس شعبۂ زندگی کا جس کی اصلاح مقصود ہے،

مسلسل مطالعہ کرنا ضروری ہے تاکہ اس پر عبور حاصل ہو جائے۔ ان اصلاحی تحریکوں میں جن کی خوبیاں مسلم ہیں، جزوی یا کلی ناکامی دراصل ناواقفیت ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر تحریک جو اصلاح کے بھیس میں اُٹھے واقعی اصلاح کہلانے کی مستحق ہو۔ (۲۸)

جاندار ہستیوں کے معاملوں پر غور کرنے میں خشک منطقی طریقے سے کام لینا محض غلط ہی نہیں بلکہ بعض اوقات مہلک ثابت ہوتا ہے اگر ایک ادنیٰ سا عامل بھی نظر انداز ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ انسانی معاملات میں جتنے عوامل کارفرما ہیں ان سب پر آپ کو عبور حاصل نہیں تو اغلب ہے کہ آپ غلط نتیجے پر پہنچیں گے اس لیے آپ کبھی اصل حقیقت کو نہیں پا سکتے۔ بس اس کے لگ بھگ پہنچ سکتے ہیں۔ اور وہ بھی اس وقت جب آپ غیر معمولی احتیاط سے کام لیں۔ (۲۹)

یہ بہت بری عادت ہے کہ ہم دوسرے کے خیالات کو بُرا اور صرف اپنے ہی خیالات کو اچھا کہیں اور جو لوگ ہم سے اختلاف رائے رکھتے ہیں انھیں ملک کے دشمن کہہ کر بدنام کریں۔ (۳۰)

ہمیں اپنے مخالفوں کے بارے میں یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ ان میں بھی وہی خلوص نیت اور حب وطن ہے جس کا ہم اپنے لئے دعویٰ کرتے ہیں۔ (۳۱)

یہ سچ ہے کہ اکثر ایسا ہوا کہ لوگوں نے عین وقت پر میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ بہتوں نے مجھے دھوکا دیا اور بہت سے بودے نکلے۔ مگر میں اُن کے ساتھ تعلق رکھنے پر پچھتاتا نہیں۔ اس لئے کہ میں جیسے تعاون کرنا جانتا ہوں۔ اسی طرح ترک تعاون کرنا بھی جانتا ہوں۔ دنیا میں رہ کر کام چلانے کا سب سے زیادہ قابل عمل اور باوقار طریقہ یہی ہے کہ انسان دوسرے کو ویسا ہی سمجھے۔ جیسا وہ اپنے کو کہتا سنا ہے جب تک اُس کے پاس اس کے خلاف کوئی قطعی ثبوت

نہ ہو۔ (۳۲)

اگر ہمیں ترقی کرنی ہے تو ہم تاریخ کو دہرائیں نہیں، بلکہ نئی تاریخ بنائیں۔ ہم اس ترکے میں جو ہمارے بزرگ چھوڑ گئے ہیں۔ اپنی طرف سے اضافہ کریں۔ اگر ہم عالم مظاہر میں نئے انکشافات اور ایجادات کر سکتے ہیں تو کیا یہ لازمی ہے کہ ہم روحانیت کی دنیا میں دیوالیے بن بیٹھیں؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ مستثنیٰ صورتیں اتنی زیادہ ہو جائیں کہ وہی کلیہ بن جائیں؟ کیا یہ ضروری ہے کہ انسان اگر حیوانیت بالکل چھوڑ نہیں سکتا تو حیوان پہلے ہو اور انسان بعد میں؟

ہر بڑے مقصد کے سلسلے میں یہ بات زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کہ لڑنے والوں کی تعداد کیا ہے۔ فیصلہ کُن امر یہ ہے کہ وہ کس مٹّی کے بنے ہیں۔ دنیا کے سب سے بڑے آدمی دراصل ہمیشہ اکیلے ہی رہے۔ بڑے بڑے پیمبر زرتشت، بدھ، عیسیٰ، محمدؐ اور بہت سے پیمبروں کی طرح جن کے نام گنائے جا سکتے ہیں، دنیا میں یکہ و تنہا تھے وہ جانتے تھے کہ خدا اُن کی طرف ہے اس لئے اُنہیں کبھی بے کسی کا احساس نہیں ہوا۔ (۳۳)

جلسے اور انجمنیں اپنی جگہ اچھی ہیں اُن سے تھوڑی سی مدد ملتی ہے۔ مگر زیادہ نہیں۔ یہ اس باڑ کی طرح ہیں، جو معمار کام چلانے کو کچھ دیر کے لئے باندھ لیتا ہے۔ اصل چیز اٹل عقیدہ ہے جو کسی طرح دبایا نہ جا سکے۔ (۳۴)

آپ کو کتنا ہی چھوٹا سا کام کرنا ہو اُسے اتنی ہی توجہ اور احتیاط کے ساتھ کیجئے جتنی آپ اس کام میں صرف کرتے، جو آپ کے نزدیک اہم ترین ہوتا۔ اس لئے کہ انہیں چھوٹی چھوٹی چیزوں سے آپ کی سیرت کا اندازہ کیا جائے گا۔ (۳۵)

اب رہی یورپ سے اکتساب نور کرنے کی عادت تو اس معاملے میں اگر لوگوں کو میری ساری زندگی سے کوئی ہدایت حاصل نہیں ہو سکی تو پھر کیا ہدایت کر سکتا

ہوں۔ اگر مشرق کا خزانہ خالی ہو گیا ہے تو ظاہر ہے اب کو مغرب سے روشنی لینی پڑے گی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ روشنی اگر محض مریض ذہن کا تخیل نہیں، بلکہ سچ مچ کی روشنی ہے تو اس کا خزانہ کبھی خالی بھی ہو سکتا ہے۔ لڑکپن میں تو میں نے یہ سیکھا تھا کہ وہ جتنی دوسروں کو دی جائے اتنی ہی بڑھتی ہے۔ بہر حال میں نے تو اسی عقیدے پر عمل کیا ہے، اپنے آبائی سرمایۂ نور کو دل کھول کر بانٹا ہے اور وہ کبھی ختم ہونے میں نہیں آیا۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ میں کنویں کا مینڈک بن جاؤں مجھے اس میں کوئی امر مانع نہیں کہ مغرب سے آنیوالی روشنی سے فائدہ اٹھاؤں۔ البتہ یہ احتیاط رکھنی چاہیے کہ مغرب کی چمک دمک میری آنکھوں کو خیرہ نہ کر دے۔ مجھے چمک دمک پر روشنی کا دھوکا نہیں کھانا چاہیے (۳۶)

میں اس وہم کا قائل نہیں کہ ہر پرانی چیز محض اپنی قدامت کی وجہ سے اچھی ہے اور نہ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ کوئی چیز ہندوستانی ہونے کی بنا پر اچھی ہے۔ (۳۷)

میں ہر چیز پر جو قدیم کہلاتی ہے آنکھ بند کر کے ایمان لانے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میں کسی بری یا منافی اخلاق چیز کو خواہ وہ کتنی ہی قدیم کیوں نہ ہو ختم کر دینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتا۔ مگر اس کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو مجھے اعتراف ہے کہ میں پرانی رسموں اور اداروں کا پرستار ہوں اور مجھے اس سے تکلیف ہوتی ہے کہ لوگ ہر جدید چیز کے پیچھے اس طرح دیوانے ہو رہے ہیں کہ اپنی پرانی روایات کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور انھیں اپنی زندگی میں کوئی جگہ نہیں دیتے۔ (۳۸)

سچا اخلاق یہ نہیں کہ آدمی لکیر کا فقیر ہو کر رہے۔ بلکہ یہ ہے کہ وہ خود صحیح راہ کو تلاش کرے اور بے خوف و خطر اس پر چلے (۳۹)

کوئی فعل جو ارادی نہ ہو اخلاقی نہیں کہا سکتا۔ جب تک ہم مشینوں کی طرح کام کریں اخلاقی عمل کا سوال ہی نہیں ہے۔ اگر ہم کسی عمل کو اخلاقی کہنا چاہیں تو

اس کے لیئے یہ شرط ہے کہ وہ شعوری طور پر فرض سمجھ کر کیا گیا ہو۔ جو عمل خوف یا جبر سے کیا جائے وہ اخلاقی نہیں رہتا۔ (۴۰)

انسان کو سخت سے سخت تنقید کا حق اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ اپنے ہمسائے کو اپنی محبت اور اصابتِ رائے کا یقین دلا چکا ہو اور اُسے یہ اطمینان ہو کہ اگر اس کی رائے کو قبول نہ کیا جائے یا اس پر عمل نہ کیا جائے تو اُسے ذرا بھی ناگوار نہ ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں تنقید کا اہل بننے کے لیئے انسان میں محبت، صحتِ نظر اور رواداری ہونی چاہیئے۔ (۴۱)

"مجرم" کا لفظ ہماری لغت سے خارج ہو جانا چاہیئے۔ ورنہ پھر ہم سب ہی مجرم ہیں۔ "تم میں سے جو گناہ سے پاک ہو وہ پہلا پتھر پھینکے" اور ایک آدمی بھی نہیں نکلا جسے فاحشہ عورت پر پتھر پھینکنے کی مجال ہوتی۔ جیسا کہ ایک جیلر نے ایک بار کہا تھا "سب لوگ چھپے ہوئے مجرم ہیں" اس بات میں جو نیم مزاحیہ انداز میں کہی گئی تھی، بہت کچھ سچائی ہے۔ اس لیئے سب کو ایک دوسرے سے اچھے رفیق کا سلوک کرنا چاہیئے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بات کہنا آسان ہے اور کرنا مشکل ہے۔ اسی کی تاکید نہ صرف گیتا نے بلکہ سب مذہبوں نے کی ہے۔ (۴۲)

انسان خود اپنی تقدیر بناتا ہے۔ اس معنی میں اسے اختیار ہے کہ اپنی آزادی سے جس طرح چاہے کام لے۔ لیکن کاموں کا نتیجہ اس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ (۴۳)

نیکی کے ساتھ علم بھی ہونا چاہیئے۔ صرف نیکی سے کچھ زیادہ کام نہیں چلتا۔ انسان میں وہ باریک قوتِ تمیز ہونی چاہیئے، جو روحانی ہمت اور مضبوط سیرت کے ساتھ کھپ جائے۔ انسان کو یہ جاننا چاہیئے کہ نازک موقع پر کب بولے اور کب چپ رہے، کب عملی اقدام کرے اور کب نہ کرے۔ ایسی حالت میں عمل اور ترکِ عمل میں تضاد نہیں بلکہ توافق ہوتا ہے۔ (۴۴)

ہر چیز جاندار یا بے جان، جو خدا نے پیدا کی ہے اچھا پہلو بھی رکھتی ہے اور بُرا بھی۔ مردِ دانش مند اس افسانوی پرندکی طرح جو دودھ میں مکھن اور پانی کو الگ الگ کر کے مکھن کھا لیتا ہے اور دودھ چھوڑ دیتا ہے، ہر چیز میں سے اچھائی لے لیتا ہے اور بُرائی کو چھوڑ دیتا ہے (۴۵)

اب سے چالیس سال پہلے جب میں شکوک و شبہات کے ایک شدید بحران سے گذر رہا تھا۔ مجھے ٹالسٹائی کی کتاب "آسمانی سلطنت تمہارے اندر ہے" پڑھنے کا اتفاق ہوا اور میں اس سے بہت متاثر ہوا۔ میں اس زمانے میں تشدد کا قائل تھا۔ اس کو پڑھ کر میرے شبہات دور ہو گئے اور مجھے اہنسا پر پکا عقیدہ ہو گیا۔ ٹالسٹائی کی زندگی میں جو چیز میرے دل کو سب سے زیادہ لگی وہ یہ تھی کہ جو وہ کہتا تھا وہی کرتا تھا اور طلبِ حق میں جتنی تکلیف بھی اٹھانی پڑے اسے کم سمجھتا تھا۔ مثلاً اس کی سادہ زندگی کو دیکھئے تو حیرت ہوتی ہے۔ اس نے ایک ایسے امیر گھرانے میں ناز و نعم میں آنکھ کھولی تھی اور پرورش پائی، جہاں دنیا کے سارے ساز و سامان جو ہوا و ہوس کو درکار ہوں مہیا تھے۔ یہی شخص جس نے زندگی کے ہر عیش و آرام کا لطف اٹھایا تھا عین شباب کے عالم میں اس سے منہ موڑ کر چل دیا اور کبھی پلٹ کر نہ دیکھا۔

وہ اپنے زمانے کا سب سے سچا آدمی تھا۔ اس کی زندگی ایک سعیٔ مدام ایک جہدِ مسلسل تھی۔ حق کو ڈھونڈنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے اس نے کبھی سچائی کو چھپانے یا ہلکا کر کے بیان کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ بے کم و کاست اور بے خوف و خطر دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔

وہ موجودہ زمانے میں اہنسا کا سب سے بڑا علم بردار تھا۔ مغرب میں کسی شخص نے اس سے پہلے یا اس کے بعد اپنی تحریر و تقریر میں اس قدر مفصل یا پرزور طریقے

تیسری بڑی چیز اس کا "روزی کے لئے محنت" کا نظریہ تھا اور وہ یہ تھا کہ ہر شخص کو خود جسمانی مشقت کر کے اپنی روزی کمانی چاہیئے۔ دنیا میں اس قدر شدید افلاس زیادہ تر اسی وجہ سے نظر آتا ہے کہ لوگ اس معاملے میں اپنا فرض ادا نہیں کرتے۔ وہ ان سب اسکیموں کو جن کا مقصد یہ تھا کہ عوام کی غریبی کو امیروں کی خیرات سے دور کیا جائے اور یہ امیر خود محنت و مشقت سے بچ کر عیش و عشرت میں مگن رہیں، محض ریاکاری سمجھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر لوگ صرف اتنا کریں کہ اپنا بار دوسروں پر نہ ڈالیں تو پھر اس نام نہاد خیر خیرات کی ضرورت ہی نہ رہے۔

اور وہ جس بات کو اچھا سمجھتا تھا کر گزرتا تھا۔ چنانچہ ادھیڑ عمر میں اس شخص نے جس کی عمر اب تک عیش و عشرت میں بسر ہوئی تھی جفاکشی اور مشقت کی زندگی اختیار کر لی۔ اس نے جوتے بنانا اور کھیتی کرنا شروع کر دیا اور آٹھ گھنٹہ روز کڑی محنت کرنے لگا۔ مگر جسمانی محنت سے اس کا قوی ذہن کند نہیں ہوا بلکہ اس کی تیزی اور آب و تاب اور بڑھ گئی اور اسی زمانے میں اس کی زبردست کتاب "آرٹ کیا ہے" جسے وہ اپنا شاہکار سمجھتا تھا ان خالی اوقات میں لکھی گئی جو اسے اپنے اختیار کیے ہوئے پیشے کے کام کے دوران میں میسر آتے تھے۔

آج کل مغرب میں بڑی خوشنما کتابیں، جن میں نفس پرستی کا زہر بھرا ہوا ہوتا ہے سیلاب کی طرح اُمڈ کر ہمارے ملک میں آ رہی ہیں۔ اور ہمارے نوجوانوں کو بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ موجودہ زمانہ اُن کے لئے آدرشوں اور آزمائشوں کا عبوری دور ہے۔ ایک ہی چیز ہے جس کی اس بحرانی زمانے میں دُنیا کو، دُنیا کے اور خاص کر ہندوستان کے نوجوانوں کو ضرورت ہے اور وہ ٹالسٹائے کا تمدنی پسندانہ ضبط نفس ہے کیونکہ اسی سے ان کو، ان کے [illegible] کو اور دنیا کو سچی آزادی حاصل ہوگی۔ ہماری آزادی میں انگلستان یا کوئی اور اتنی رکاوٹ نہیں ڈال رہا ہے، جتنی

ہم خود اپنی کاہلی، بے حسی، اور سماجی خرابیوں سے ڈال رہے ہیں۔ اور اگر ہم اپنے
آپ کو ان خامیوں اور عیبوں سے پاک کر لیں تو دنیا کی کوئی طاقت ایک لمحے کے لئے
بھی ہمیں سوراج حاصل کرنے سے روک نہیں سکتی...... ٹالسٹائے کی زندگی
کی یہ تین بنیادی خصوصیات جن کا میں نے ذکر کیا دنیا کی اس آزمائش کی گھڑی میں ہمارے
نوجوانوں کے لئے نہایت اہم ہیں۔ (۴۶)

مجھے پکا یقین ہے کہ کوئی مستحق ادارہ امداد نہ ملنے کی وجہ سے کبھی بند نہیں
ہو سکتا۔ جو ادارے بند ہو گئے ان میں یا تو کوئی خوبی نہ تھی جس کی بنا پر پبلک
ان کی قدر کرتی یا ان کے چلانے والوں کو عقیدہ نہیں رہا یا اسی کو یوں کہیئے کہ ان میں دم
نہیں رہا۔ اس لیئے میں پبلک اداروں کے چلانے والوں سے بہ اصرار یہ کہوں گا کہ وہ اس
عام کساد بازاری کی وجہ سے جو آجکل نظر آتی ہے۔ ہمت نہ ہاریں۔ یہ قابل قدر اداروں
کے لیئے آزمائش کا زمانہ ہے۔ (۴۷)

میں نے پہلے ہی سے یہ سبق سیکھ لیا تھا کہ پبلک کے کام قرض کے روپیے سے
نہیں چلانے چاہئیں۔ بہت سے معاملوں میں لوگوں کے وعدے پر بھروسہ کیا
جا سکتا ہے، مگر روپیے کے معاملے میں نہیں (۴۸)

میں اس کا قائل نہیں کہ ایک شخص دوسرے سے تبدیل مذہب کے لیئے
کہے۔ میں کبھی یہ پسند نہیں کروں گا کہ کسی کو اس کے عقیدے سے منحرف کرنے کی کوشش
کروں بلکہ میں تو یہ چاہوں گا کہ وہ اپنے مذہب کا ادنا اچھا پیرو بن جائے۔ اس کے
یہ معنی ہیں کہ انسان سب مذہبوں کو اچھا سمجھے اور سب کا احترام کرے اور اس
سے یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ اسے سچے عجز و انکسار سے کام لینا چاہیئے اور اس
حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ نور معرفت سب مذہبوں کو جسم فانی کے ناقص
ظرف سے پہنچتا ہے۔ اس لیئے اس نقص میں کم و بیش سبھی شریک ہیں۔" (۴۹)

(ایک شخص کو جس نے پوچھا تھا کہ کیا یہ سچ ہے کہ گاندھی جی نے ایک زہریلے سانپ کو اپنے جسم سے گذر جانے دیا لکھتے ہیں۔)

یہ بات سچ ہے اور نہیں بھی ہے۔ سانپ میرے جسم پر سے گذر رہا تھا۔ میں یا کوئی اور شخص اس کے سوا کیا کر سکتا تھا کہ چپ چاپ لیٹا رہے۔ اس میں تعریف کی کوئی بات نہیں اور کون جانے کہ سانپ زہریلا تھا یا نہیں۔ یہ خیال کہ موت کوئی خوفناک چیز نہیں میرے خیال میں برسوں سے جما ہوا ہے۔ اس لئے لوگوں کی موت کا چاہے وہ مجھ سے کتنے ہی قریب اور مجھے کتنے ہی پیارے ہوں جو صدمہ ہوتا ہے۔ وہ بہت جلد دور ہو جاتا ہے۔ (۵۰)

ہمیں یہ سکھایا گیا ہے کہ جو چیز خوبصورت ہے یہ ضروری نہیں کہ مفید بھی ہو اور جو خوبصورت ہے وہ مفید نہیں ہو سکتی۔ میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ جو چیز مفید ہے وہ خوبصورت بھی ہو سکتی ہے۔ (۵۱)

جن لوگوں کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ "آرٹ کو آرٹ" کی خاطر اختیار کرتے ہیں وہ اسے ثابت نہیں کر سکتے۔ آرٹ کی بھی زندگی میں ایک جگہ ہے۔ قطع نظر اس سے کہ آرٹ ہے کیا؟ مگر آرٹ محض ایک وسیلہ ہو سکتا ہے اس مقصد کا جو ہم سب کو حاصل کرنا ہے۔ لیکن اگر وہ خود ہی اپنا مقصد بن جائے تو وہ ہمیں غلام بنا لیتا ہے اور انسانیت کے وقار کو کھو دیتا ہے (۵۲)

ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ایک ظاہری اور ایک باطنی۔ میرے نزدیک سوال صرف اس کا ہے کہ کس کو زیادہ اہمیت دی جائے ظاہر کے کوئی معنی نہیں اگر وہ باطن تک پہنچنے میں مدد نہ کرے۔ چنانچہ تمام آرٹ ایک مظہر ہے روح کا۔ ظاہری صورت کی قدر و قیمت اسی حد تک ہے کہ اس کے ذریعے روح انسانی کا اظہار ہو۔ اس طرح کا آرٹ مجھ پر بہت اثر کرتا ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ بہت

سے لوگ اپنے کو آرٹسٹ یا فنکار کہتے ہیں اور دوسرے بھی اُن کو فنکار مانتے ہیں۔ حالانکہ ان کی تخلیقات میں روح کی تڑپ اور اُپج کی خفیف سی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ (۵۳)

ہر سچے آرٹ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ روح کو خود اپنی اندرونی حقیقت کی معرفت میں مدد دے۔ میں ذاتی طور پر یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے معرفتِ نفس کے لئے ظاہری صورتوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے کمرے کی دیواریں نقش و نگار سے معرا ہوں تو کوئی حرج نہیں بلکہ میری طرف سے چھت بھی نہ ہوتا کہ میں تاروں بھرے آسمان کا، جو میرے سر پر ایک نامحدود فضائے حسن کی طرح چھایا ہوا ہے، نظارہ کر سکوں بھلا انسان کا شعوری آرٹ مجھے حسنِ قدرت کا وہ مسلسل مرقع کہاں دکھا سکتا ہے جو آنکھ اٹھا کر آسمان اور اس کے جگمگاتے تاروں پر نظر ڈالتے ہی مجھے دکھائی دیتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مجھے آرٹ کی تخلیقات کی جنھیں عام طور پر اس نام سے پکارا جاتا ہے، قدر و قیمت سے انکار ہے۔ بس اتنی بات ہے کہ مجھے ذاتی طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ فطرت کے ابدی حسن کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ ان آرٹ کی تخلیقات کی اہمیت اسی حد تک ہے جس حد تک یہ روح کو معرفتِ ذات میں مدد دیں۔ (۵۴)

مجھے موسیقی اور دوسرے فنونِ لطیفہ سے محبت ہے۔ مگر میں انھیں اتنی اہمیت نہیں دیتا۔ جتنی عام طور پر دی جاتی ہے۔ مثلاً مجھے وہ چیزیں پسند نہیں جن کے سمجھنے کے لیئے فنی معلومات کی ضرورت ہو۔ جب میں تاروں بھرے آسمان کو دیکھتا ہوں اور اس کے حسن سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچتی ہے تو مجھے جو لطف آتا ہے وہ انسانی آرٹ میں کبھی نہیں آسکتا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میں ان تخلیقات کی جو آرٹ کہلاتی ہیں۔ کوئی قدر و قیمت نہیں سمجھتا۔ مگر مجھے ذاتی طور پر فطرت کے لامحدود حسن کے مقابلے میں ان کی بے حقیقتی بہت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ زندگی آرٹ سے زیادہ عظمت رکھتی ہے۔ میں تو ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ کہوں گا کہ جس شخص کی زندگی

درجۂ کمال سے قریب تر پہنچ جائے وہ سب سے بڑا فنکار ہے۔ اس لیے کہ ایک اچھی زندگی کی مستحکم بنیاد کے بغیر آرٹ کیا ہے کچھ بھی نہیں۔ (۵۵)

جن تخلیقات میں حقیقی حُسن ہوتا ہے وہ اس وقت وجود میں آتی ہیں۔ جب سچا ادراک کارفرما ہو۔ ایسے لمحے جب زندگی میں شاذ ہیں تو آرٹ میں بھی کم ہی ہوں گے۔ (۵۶)

آرٹ صرف صورت ہی پر دھیان نہیں دیتا بلکہ اس حقیقت پر بھی جو صورت کے ماورا ہے۔ ایک آرٹ وہ ہے جو ہلاک کرتا ہے اور ایک وہ ہے جو جاں بخش ہوتا ہے۔ سچے آرٹ کو اپنے خالق کی مسرت، قناعت اور عفت کا مظہر ہونا چاہیئے (۵۷)

کچھ ایسا ہوا کہ ہم اس خیال کے عادی ہوگئے کہ آرٹ کو نجی زندگی کی پاکیزگی سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اپنے سارے تجربے کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ بالکل غلط ہے۔ آج جب میری شب زندگی سحر کے قریب پہنچ گئی ہے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ زندگی کی پاکیزگی سب سے بڑا اور اونچا آرٹ ہے۔ سدھی ہوئی آواز سے اچھی موسیقی پیدا کرنے کا فن بہت لوگ حاصل کرسکتے ہیں۔ مگر پاک زندگی کی ہم آہنگی سے یہ موسیقی پیدا کرنا کسی کو شاذونادر ہی نصیب ہوتا ہے۔ (۵۸)

میں بغیر کسی گھمنڈ کے نہایت انکسار سے کہتا ہوں کہ میرا پیغام اور میرا طریقِ عمل بنیادی طور پر ساری دنیا کے لیئے ہے اور مجھے اس سے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ اس نے پہلے ہی مغربی ملکوں میں بہت سے مردوں اور عورتوں کے دلوں کو متاثر کیا ہے اور ان کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ (۵۹)

سب سے بڑی عزت جو میرے دوست میری کرسکتے ہیں وہ یہ ہے کہ جس اصول کا میں علمبردار ہوں۔ اُسے اپنی زندگی کا دستورالعمل بنائیں یا اگر وہ اسے نہ مانتے ہوں تو اس کی دل وجان سے مخالفت کریں۔ (۶۰)

حوالے

جن کتابوں سے گاندھی جی کے اقوال اس انتخاب میں نقل کئے گئے ہیں ان کے نام ذیل میں نمبروار درج کئے جاتے ہیں۔ حوالوں میں صرف کتاب کا نمبر اور صفحے کا نمبر دیا جائے گا۔

نمبر (۱)

آٹو بیاگرفی آر دی اسٹوری آف مائی ایکسپیریمنٹس وِدھ ٹرُوتھ:
نوجیون پبلشنگ ہاؤس احمد آباد اگست ۱۹۴۸ء

(نمبر ۲)

مہاتما۔ لائف آف موہن داس کرم چند گاندھی:
از: ڈی، جی تیندُلکر جسے وِٹھل بھائی کے جھویری اور ڈی جی تیندُلکر، بمبئی ۱۳ نے آٹھ جلدوں میں شائع کیا۔
جلد اول اگست ۱۹۵۱، جلد دوم دسمبر ۱۹۵۱، جلد سوم مارچ ۱۹۵۲، جلد چہارم جولائی ۱۹۵۲ء، جلد پنجم اکتوبر ۱۹۵۲، جلد ششم مارچ ۱۹۵۳، جلد ہفتم اگست ۱۹۵۳، جلد ہشتم جنوری ۱۹۵۴۔

(نمبر ۳)

مہاتما گاندھی از پیارے لال

دی نوجیون پبلشنگ ہاؤس۔ احمد آباد

دو جلدوں میں

جلد اوّل فروری ۱۹۶۰ء، جلد دوم فروری ۱۹۵۸ء

(نمبر ۴)

باپوز لیٹرز ٹو میرا

نوجیون پبلشنگ ہاؤس۔ احمد آباد

اگست ۱۹۴۹ء

(نمبر ۵)

دی کلکٹیڈ ورکس آف مہاتما گاندھی

پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ۔
گورنمنٹ آف انڈیا، نیو دہلی۔ جلد اول ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔

(نمبر ۶)

دی ڈائری آف مہادیو دیسائی

جلد اوّل ۱۹۵۳ء۔ نوجیون پبلشنگ ہاؤس۔ احمد آباد

(نمبر ۷)

ہند سوا راج آر انڈین ہوم رول

از ایم کے گاندھی

نوجیون پبلشنگ ہاؤس - احمد آباد

پہلا ایڈیشن ۱۹۳۸ء میں چھپا - یہ حوالے ۱۹۴۶ء کے ایڈیشن کے ہیں۔

(نمبر ۸)

ویمن اینڈ سوشل انجسٹس از ایم - کے - گاندھی

نوجیون پبلشنگ ہاؤس احمد آباد

پہلا ایڈیشن ۱۹۴۲ء میں چھپا - یہ حوالے ۱۹۵۴ء کے ایڈیشن کے ہیں۔

(نمبر ۹)

دی مائنڈ آف مہاتما گاندھی

مؤلفہ آر - کے - پربھو اور یو - آر - راؤ

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن - مارچ ۱۹۴۵ء

(نمبر ۱۰)

سیلیکشنس فرام گاندھی از نرمل کمار بوس

نوجیون پبلشنگ ہاؤس - احمد آباد - سنہ ۱۹۴۸ء

پہلا باب

۱- نمبرا ص ۴
۲- 〃 ص ۴
۳- 〃 ص ۴-۵
۴- 〃 ص ۵
۵- نمبر۱۰ ص ۴،۵
۶- نمبرا ص ۱۱
۷- 〃 ص ۱۲
۸- 〃 ص ۱۲-۱۳
۹- نمبرا ص ۱۴
۱۰- 〃 ص ۱۵
۱۱- 〃 ص ۱۵-۱۶
۱۲- 〃 ص ۱۸
۱۳- 〃 ص ۱۹
۱۴- 〃 ص ۲۱
۱۵- 〃 ص ۲۳-۲۴
۱۶- 〃 ص ۲۶-۲۷
۱۷- نمبرا ص ۳۱
۱۸- 〃 ص ۳۱-۳۲
۱۹- 〃 ص ۳۲-۳۳
۲۰- 〃 ص ۳۳
۲۱- 〃 ص ۳۳
۲۲- 〃 ص ۳۳
۲۳- 〃 ص ۳۶
۲۴- 〃 ص ۳۷
۲۵- 〃 ص ۳۷
۲۶- 〃 ص ۳۸
۲۷- 〃 ص ۳۸
۲۸- 〃 ص ۴۷
۲۹- 〃 ص ۵۰-۵۱
۳۰- نمبر۲ جلد۲ ص ۴۷-۴۸
۳۱- نمبرا ص ۵۲
۳۲- ص ۵۲
۳۳- 〃 ص ۵۲-۵۳
۳۴- 〃 ص ۵۴
۳۵- نمبر۵ جلدا ص ۳
۳۶- نمبرا ص ۶۳
۳۷- 〃 ص ۶۴-۶۵
۳۸- 〃 ص ۶۶-۶۷
۳۹- 〃 ص ۷۹-۸۰
۴۰- 〃 ص ۸۱-۸۲
۴۱- 〃 ص ۸۴

نمبر شمار	نمبر		صفحہ	نمبر شمار	نمبر		صفحہ
۸۴-	نمبرا	ص	۲۶۴	۱۰۵-	نمبرا	ص	۴۱۴
۸۵-	"	ص	۲۶۸	۱۰۶-	"	ص	۴۱۴-۱۵
۸۶-	"	ص	۳۳۷	۱۰۷-	"	ص	۴۱۵
۸۷-	"	ص	۳۳۸	۱۰۸-	"	ص	۴۱۸
۸۸-	نمبر۲	ص	۴۹	۱۰۹	"	ص	۴۱۸-۱۹
۸۹-	نمبرا	ص	۳۴۲	۱۱۰	"	ص	۴۱۹
۹۰-	"	ص	۳۴۹	۱۱۱	"	ص	۴۴۳-۴۴
۹۱-	"	ص	۳۶۴-۶۵	۱۱۲	"	ص	۴۴۹
۹۲-	"	ص	۳۸۳	۱۱۳	"	ص	۴۲۱-۲۳
۹۳-	"	ص	۳۸۴	۱۱۴	"	ص	۴۲۴-۲۵
۹۴-	"	ص	۳۸۵	۱۱۵	"	ص	۴۲۵
۹۵-	"	ص	۳۸۶	۱۱۶	"	ص	۴۲۷
۹۶-	"	ص	۳۹۱	۱۱۷	نمبرا	ص	۱۶۷-۶۸
۹۷-	"	ص	۳۹۱-۳۹۲	۱۱۸	"	ص	۱۶۸-۷۰
۹۸-	"	ص	۳۹۲-۳۹۳	۱۱۹	"	ص	۲۱۴
۹۹-	"	ص	۳۹۸	۱۲۰	"	ص	۲۱۴
۱۰۰	"	ص	۳۹۸	۱۲۱	نمبر۲ جلد۲	ص	۲۱۳
۱۰۱	نمبرا	ص	۴۰۲	۱۲۲	" "	ص	۱۱۳
۱۰۲	"	ص	۴۰۶	۱۲۳	نمبرا	ص	۶۱۴
۱۰۳	"	ص	۴۰۹		نیز نمبر۹	ص	۴
۱۰۴	"	ص	۴۱۱-۴۱۲	۱۲۴	نمبر ۱	ص	۶۱۵

۱۲۵- نمبر ۱ ص ۶۱۶
۱۲۶- نمبر ۹ ص ۷
۱۲۷- " ص ۸
۱۲۸- نمبر ۲ جلد ۲ ص ۴۱۷
۱۲۹- نمبر ۱۰ ص ۱۵۰
۱۳۰- نمبر ۲ جلد ۲ ص ۴۲۱-۲۳
۱۳۱- " " ص ۴۲۵-۲۶
۱۳۲- " جلد ۳ ص ۱۴۲
۱۳۳- " " ص ۱۵۵-۵۷
۱۳۴- نمبر ۲ جلد ۴ ص ۹۳
۱۳۵- " " ص ۹۵
۱۳۶- " جلد ۶ ص ۳۵۶
۱۳۷- نمبر ۱۰ ص ۲۱۶
۱۳۸- نمبر ۳ جلد ۲ ص ۴۷۵
۱۳۹- نمبر ۲ جلد ۴ ص ۶۶-۶۷
۱۴۰- " جلد ۶ ص ۱۷۷
۱۴۱- " " ص ۲۴۱-۴۲
۱۴۲- " جلد ۵ ص ۴۷۸-۷۹
۱۴۳- " " ۷ ص ۱۰۰
۱۴۴- نمبر ۳ جلد ۲ ص ۸۰۱
۱۴۵- " " ص ۸۰۸
۱۴۶- نمبر ۲ جلد ۱ ص ۲۸۵
۱۴۷- نمبر ۳ جلد ۲ ص ۸۰۰
۱۴۸- " " ص ۴۵۳
۱۴۹- " " ص ۴۶۳
۱۵۰- نمبر ۲ جلد ۸ ص ۲۲-۲۳
۱۵۱- نمبر ۲ جلد ۳ ص ۲۴۶
۱۵۲- " " ص ۲۴۶
۱۵۳- " " ص ۳۲۴
۱۵۴- نمبر ۹ ص ۱۶
۱۵۵- نمبر ۳ جلد ۲ ص ۳۲۴
۱۵۶- " " ص ۱۰۱
۱۵۷- " " ص ۳۲۷
۱۵۸- نمبر ۳ جلد ۱ ص ۵۶۲
۱۵۹- نمبر ۹ ص ۹
۱۶۰- " ص ۹
۱۶۱- نمبر ۳ جلد ۲ ص ۷۶۶
۱۶۲- " " ص ۴۱۷
۱۶۳- " " ص ۷۸۲
۱۶۴- نمبر ۱۰ ص ۲۳۸

دوسرا باب

۱- نمبر ۹ ص ۸۵

-۴۲	نمبرا	ص	۱۰۱	۶۳	نمبرا	ص	۱۹۱-۱۹۲
-۴۳	"	ص	۱۰۱	۶۴	"	ص	۱۹۲
-۴۴	"	ص	۱۰۲	۶۵	"	ص	۱۹۷
-۴۵	"	ص	۱۰۵	۶۶	"	ص	۲۱۲
-۴۶	"	ص	۱۱۵	۶۷	"	ص	۲۰۵
-۴۷	"	ص	۱۱۸	۶۸	"	ص	۲۲۹-۲۳۰
-۴۸	"	ص	۱۲۳	۶۹	"	ص	۲۳۱
-۴۹	"	ص	۱۲۸	۷۰	"	ص	۲۳۲-۲۳۳
-۵۰	"	ص	۱۲۹	۷۱	"	ص	۲۳۵
-۵۱	"	ص	۱۳۰	۷۲	"	ص	۲۳۶-۲۳۷
-۵۲	"	ص	۱۳۴	۷۳	"	ص	۲۳۹-۲۴۰
-۵۳	"	ص	۱۳۵	۷۴	"	ص	۲۴۱
-۵۴	"	ص	۱۴۰-۱۴۱	۷۵	"	ص	۲۴۹-۲۵۰
-۵۵	"	ص	۱۵۷	۷۶	"	ص	۲۵۰
-۵۶	"	ص	۱۵۷-۱۵۸	۷۷	"	ص	۲۵۰-۲۵۱
-۵۷	"	ص	۱۶۲-۱۶۳	۷۸	"	ص	۲۵۱
-۵۸	"	ص	۱۶۳ ۱۶۴	۷۹	"	ص	۲۵۶
-۵۹	"	ص	۱۶۵	۸۰	"	ص	۲۵۷
-۶۰	"	ص	۱۶۸	۸۱	"	ص	۳۳۴
-۶۱	"	ص	۱۹۰	۸۲	"	ص	۳۶۱
۶۲	"	ص	۱۹۰-۱۹۱	۸۳	"	ص	۳۶۲-۲۶۳

۲- نمبر۱۰ ص ۲۲۳
۳- نمبر۱ ص ۳۴۱
۴- نمبر۹ ص ۲۱
۵- " ص ۲۲
۶- " ص ۲۲
۷- " ص ۲۲
۸- " ص ۲۲-۲۳
۹- نمبر۱ ص ۹
۱۰- نمبر۳ جلد۱ ص ۴۲۱-۲۲
۱۱- نمبر۱ ص ۶۱۵
۱۲- " ص ۶۱۵-۱۶
۱۳- " ص ۶۱۶
۱۴- نمبر۱۰ ص ۸
۱۵- نمبر۹ ص ۲۴
۱۶- نمبر۱۰ ص ۲۲۴
۱۷- " ص ۲۲۴
۱۸- " ص ۲۲۵
۱۹- " ص ۲۲۵
۲۰- " ص ۲۲۶-۲۷
۲۱- " ص ۲۲۸
۲۲- " ص ۲۲۶
۲۳- نمبر۱۰ ص ۲۲۷-۲۸
۲۴- " ص ۲۲۸
۲۵- " ص ۲۲۸
۲۶- نمبر۹ ص ۸۴
۲۷- " ص ۸۴
۲۸- " ص ۸۶
۲۹- " ص ۸۶
۳۰- " ص ۹۶
۳۱- نمبر۲ جلد۳ ص ۱۳۹-۴۰
۳۲- " جلد۴ ص ۱۰۸-۹
۳۳- " جلد۳ ص ۳۴۳
۳۴- " جلد۳ ص ۳۰۰
۳۵- " جلد۴ ص ۱۲۱
۳۶- نمبر۶ ص ۱۳۸
۳۷- " ص ۲۲۷-۲۸
۳۸- نمبر۴ ص ۱۷۱
۳۹- نمبر۲ جلد۲ ص ۱۶۷-۶۸
۴۰- نمبر۳ جلد۱ ص ۵۹۹
۴۱- " جلد۲ ص ۲۴۷
۴۲- نمبر۲ جلد۳ ص ۳۵۹-۶۰
۴۳- نمبر۱ ص ۶

۴۴۔ نمبر۱ ص ۶۰۷ ۶۵۔ نمبر۹ ص ۲۳
۴۵۔ نمبر۱۰ ص ۲۲۵ ۶۶۔ 〃 ص ۳۸
۴۶۔ نمبر۹ ص ۲۳ ۶۷۔ نمبر۹ ص ۵۰-۱۴۹
۴۷۔ 〃 ص ۲۳ ۶۸۔ نمبر۹ ص ۱۲
۴۸۔ 〃 ص ۲۴ ۶۹۔ 〃 ص ۱۳
۴۹۔ 〃 ص ۲۴ ۷۰۔ 〃 ص ۱۳
۵۰۔ 〃 ص ۲۷ ۷۱۔ 〃 ص ۱
۵۱۔ 〃 ص ۲۷ ۷۲۔ 〃 ص ۵
۵۲۔ 〃 ص ۳۰ ۷۳۔ 〃 ص ۱۰
۵۳۔ 〃 ص ۳۳ ۷۴۔ 〃 ص ۱۵
۵۴۔ 〃 ص ۷۰ ۷۵۔ 〃 ص ۲۳
۵۵۔ 〃 ص ۷۰ ۷۶۔ 〃 ص ۲۰
۵۶۔ 〃 ص ۷۱ ۷۷۔ 〃 ص ۲۰
۵۷۔ 〃 ص ۷۸ ۷۸۔ 〃 ص ۳۷
۵۸۔ 〃 ص ۷۸ ۷۹۔ 〃 ص ۳۸
۵۹۔ نمبر۲ جلد۳ ص ۷۷-۱۷۶ ۸۰۔ نمبر۱۰ ص ۹
۶۰۔ نمبر۱۰ ص ۱۷ ۸۱۔ 〃 ص ۴۷-۴۶
۶۱۔ نمبر۹ ص ۱۷ ۸۲۔ 〃 ص ۲۲۳
۶۲۔ 〃 ص ۲۰-۱۹ ۸۳۔ 〃 ص ۲۲۳
۶۳۔ 〃 ص ۲۰ ۸۴۔ 〃 ص ۲۲۳
۶۴۔ 〃 ص ۲۱ ۸۵۔ 〃 ص ۲۲۳

۸۶۔ نمبر۱ ص ۲۲۳
۸۷۔ " ص ۲۲۴
۸۸۔ " ص ۲۲۹
۸۹۔ " ص ۲۲۹
۹۰۔ " ص ۲۲۹
۹۱۔ " ص ۲۲۹
۹۲۔ " ص ۲۳۰
۹۳۔ نمبر۶ ص ۱۶۸
۹۴۔ نمبر۱۰ ص ۱۳۹
۹۵۔ نمبر۹ ص ۱
۹۶۔ " ص ۱-۳
۹۷۔ " ص ۳
۹۸۔ " ص ۴
۹۹۔ " ص ۳
۱۰۰۔ " ص ۵
۱۰۱۔ " ص ۵
۱۰۲۔ " ص ۵
۱۰۳۔ " ص ۱۰
۱۰۴۔ " ص ۸۱
۱۰۵۔ " ص ۸۲
۱۰۶۔ " ص ۱۰۶
۱۰۷۔ نمبر۹ ص ۱۶۷
۱۰۸۔ نمبر۱۰ ص ۲۱۰
۱۰۹۔ نمبر۳ جلد۱ ص ۳۴۸
۱۱۰۔ " جلد۳ ص ۷۸۴
۱۱۱۔ نمبر۲ جلد۷ ص ۷۶۴
۱۱۲۔ نمبر۳ جلد۲ ص ۱۴۳
۱۱۳۔ " " ص ۹۱
۱۱۴۔ " " ص ۱۴۳
۱۱۵۔ نمبر۹ ص ۱۴
۱۱۶۔ نمبر۲ جلد۲ ص ۳۱۲

تیسرا باب

۱۔ نمبر۱ ص ۱۳
۲۔ " ص ۳۷
۳۔ " ص ۱۴
۴۔ نمبر۹ ص ۱۲۶
۵۔ نمبر۷ ص ۵۱-۵۲
۶۔ نمبر۳ جلد۲ ص ۱۴۰-۴۱
۷۔ نمبر۱۰ ص ۱۶۰-۶۱
۸۔ " ص ۱۶۱
۹۔ " ص ۱۶۲

چوتھا باب

۱- نمبر۹ ص ۴۹
۲- نمبر۲ جلد۵ ص ۳۴۴
۳- نمبر۱۰ ص ۱۶
۴- " ص ۱۸
۵- " ص ۲۴
۶- " ص ۱۸
۷- " ص ۲۳
۸- " ص ۲۴-۲۵
۹- " ص ۱۷-۱۸
۱۰- " ص ۳۱-۳۲
۱۱- " ص ۲۷-۲۸
۱۲- " ص ۳۳
۱۳- " ص ۳۲
۱۴- " ص ۳۳
۱۵- " ص ۳۳
۱۶- " ص ۳۴
۱۷- " ص ۳۸-۳۹
۱۸- " ص ۱۴۲-۴۳
۱۹- " ص ۱۴۵
۲۰- نمبر۱۰ ص ۱۴۶-۴۷
۲۱ " ص ۱۴۷
۲۲- " ص ۱۶
۲۳- " ص ۳۳
۲۴- " ص ۱۴۴
۲۵- " ص ۱۴۵
۲۶- " ص ۱۴۷
۲۷- " ص ۱۴۹
۲۸- " ص ۱۴۹
۲۹- " ص ۱۵۱
۳۰- ص ۱۵۱-۵۲
۳۱- نمبر۱۰ ص ۱۵۲
۳۲- " ص ۱۵۲
۳۳- " ص ۱۵۲
۳۴- نمبر۱ ص ۲۷-۲۸، ۴۰
۳۵- " ص ۴۲۸
۳۶- " ص ۴۲۹
۳۷- نمبر۱ ص ۱۵۴
۳۸- " ص ۱۵۵
۳۹- " ص ۱۵۷
۴۰- " ص ۱۵۷

۴۱- نمبر۱۰ ص ۱۵۹-۶۰
۴۲- " ص ۲۰۶
۴۳- نمبر۹ ص ۴۲
۴۴- " ص ۳ - ۴
۴۵- " ص ۴۴
۴۶- " ص ۴۴
۴۷- " ص ۴۴
۴۸- " ص ۴۶
۴۹- " ص ۴۶
۵۰- " ص ۴۶
۵۱- " ص ۴۸ - ۴۹
۵۲- " ص ۴۸
۵۳- " ص ۵۰
۵۴- " ص ۵۲
۵۵- " ص ۵۴
۵۶- " ص ۵۸
۵۷ " ص ۶۳
۵۸ " ص ۶۴
۵۹ " ص ۶۸
۶۰ " ص ۶۸-۶۹
۶۱ نمبر۶ ص ۲۹۶

۶۲- نمبر۳ جلد ص ۱۲۴-۲۵
۶۳- " " ص ۵۰۷
۶۴- نمبر۲ جلد۷ ص ۱۵۲-۵۳
۶۵- نمبر۱۰ ص ۱۵۰-۵۱
۶۶- " ص ۱۵۳
۶۷- " ص ۱۵۳
۶۸- " ص ۱۵۴
۶۹- " ص ۱۵۴
۷۰- " ص ۱۵۵-۵۶
۷۱- " ص ۱۵۶
۷۲- نمبر۹ ص ۴۷
۷۳- " ص ۴۹
۷۴- " ص ۵۰
۷۵- نمبر۲ جلد۴ ص ۶۱
۷۶- " جلد۲ ص ۵ - ۸
۷۷- " جلد۵ ص ۲۷۳
۷۸- نمبر۲ جلد۷ ص ۱۷۱-۷۳
۷۹- نمبر۹ ص ۱۳۳

پانچواں باب

۱- نمبر۱۰ ص ۳۹

۲۔ نمبر۱ ص ۳۹
۳۔ " ص ۲۶۸
۴۔ " ص ۲۶۸
۵۔ " ص ۷۲-۲۷۱
۶۔ نیز نمبر۹ ص ۴۴
۷۔ " ص ۱۱
۸۔ " ص ۱۱
۹۔ " ص ۱۰۸
۱۰۔ نمبر۶ ص ۹۸
۱۱۔ " ص ۲۹۸
۱۲۔ نمبر۳ جلد۲ ص ۲۲۳
۱۳۔ " " ص ۴۴۲
۱۴۔ " " ص ۷۹۲
۱۵۔ نمبر۱ ص ۲۲۱
۱۶۔ " ص ۲۲۱
۱۷۔ نمبر۹ ص ۳۲
۱۸۔ " ص ۳۳
۱۹۔ " ص ۳۳-۳۲
۲۰۔ نمبر۳ جلد۱ ص ۵۷۳
۲۱۔ نمبر۱۰ ص ۲۱۶
۲۲۔ " ص ۱۸
۲۳۔ نمبر۳ جلد۱ ص ۵۹۹
۲۴۔ " " ص ۶۰۰
۲۵۔ نمبر۲ جلد۴ ص ۵۸-۵۷
۲۶۔ نمبر۱ ص ۳۵۸
۲۷۔ نمبر۲ ص ۸۰
۲۸۔ نمبر۳ جلد۱ ص ۸۹-۵۸۸
۲۹۔ نمبر۶ ص ۲۵۳
۳۰۔ نمبر۲ ص ۷۳
۳۱۔ نمبر۱۰ ص ۱۶-۲۱۵
۳۲۔ نمبر۳ ص ۵۸۶

چھٹا باب

۱۔ نمبر۱۰ ص ۲۷
۲۔ " ص ۲۷
۳۔ " ص ۲۷
۴۔ نمبر۹ ص ۱۳۷
۵۔ " ص ۱۳۵
۶۔ " ص ۱۳۴
۷۔ " ص ۳۶-۱۳۵
۸۔ " ص ۱۳۶
۹۔ نمبر۶ ص ۲۸۷

۱۰- نمبر۳ جلد۱ ص ۲۵۳
۱۱- نمبر۱ ص ۴۳
۱۲- " ص ۴۳
۱۳- " ص ۴۴
۱۴- " ص ۱۵۲
۱۵- نمبر۹ ص ۱۳۳
۱۶- نمبر۱۰ ص ۱۱۳
۱۷- " ص ۱۷۱-۷۲
۱۸- نمبر۹ ص ۵۹-۶۰
۱۹- " ص ۶۰-۶۱
۲۰- " ص ۶۳
۲۱- " ص ۶۳
۲۲- " ص ۶۳
۲۳- نمبر۳ جلد۲ ص ۹۰

ساتواں باب

۱- نمبر۹ ص ۱۲۸
۲- نمبر۱۰ ص ۷۳
۳- " ص ۷۱
۴- نمبر۹ ص ۱۲۱
۵- نمبر۲ جلد۷ ص ۲۲۴-۲۵
۶- نمبر۱۰ ص ۶۴-۶۵
۷- " ص ۶۶
۸- " ص ۶۶
۹- " ص ۶۸-۶۸
۱۰- " ص ۵۸
۱۱- " ص ۵۸
۱۲- " ص ۵۹
۱۳- " ص ۶۵
۱۴- " ص ۶۶-۶۷
۱۵- " ص ۷۱

آٹھواں باب

۱- نمبر۱۰ ص ۴۱
۲- " ص ۴۰
۳- " ص ۷۷
۴- " ص ۱۷
۵- " ص ۷۵
۶- " ص ۷۵-۷۶
۷- " ص ۷۷ ۷۸
۸- " ص ۷۹-۷۸
۹- " ص ۵۲

۱۰۔ نمبر۱۰ ص ۵۴	۲۔ نمبر۲ جلد۵ ص ۳۴۴
۱۱۔ " ص ۵۰	۳۔ نمبر۹ ص ۴۵
۱۲۔ " ص ۴۹	۴۔ نمبر۱۰ ص ۱۴۳
۱۳۔ نمبر۹ ص ۱۱	۵۔ " ص ۲۲
۱۴۔ " ص ۱۰۱	۶۔ " ص ۳۷
۱۵۔ نمبر۱۰ ص ۸۶	۷۔ " ص ۳۸
۱۶۔ " ص ۴۹	۸۔ " ص ۴۱
۱۷۔ " ص ۴۸-۴۹	۹۔ " ص ۴۳
۱۸۔ " ص ۴۹	۱۰۔ " ص ۸۲-۸۳
۱۹۔ " ص ۴۹	۱۱۔ " ص ۱۰۹
۲۰۔ نمبر۹ ص ۱۰۴	۱۲۔ " ص ۱۰۹
۲۱۔ " ص ۱۱۶	۱۳۔ نمبر۲ جلد۶ ص ۲۳
۲۲۔ " ص ۱۱۷	۱۴۔ نمبر۱۰ ص ۱۱۱
۲۳۔ نمبر۲ ص ۸۱	۱۵۔ " ص ۱۱۱
۲۴۔ " ص ۹۱	۱۶۔ " ص ۱۱۸
۲۵۔ " ص ۹۲	۱۷۔ " ص ۱۹۳-۹۴
۲۶۔ " ص ۹۴	۱۸۔ " ص ۱۹۰
۲۷۔ نمبر۲ جلد۴ ص ۱۳-۱۴	۱۹۔ " ص ۲۰
۲۸۔ نمبر۳ جلد۱ ص ۶۶	۲۰۔ نمبر۹ ص ۳
نواں باب	۲۱۔ " ص ۹
۱۔ نمبر۲ جلد۵ ص ۳۴۴	۲۲۔ " ص ۹

۲۳- نمبر۹ ص ۱۱
۲۴- نمبر۶ ص ۱۴۹
۲۵- نمبر۱۰ ص ۲۰۱
۲۶- " ص ۲۰۱-۲
۲۷- نمبر۲ جلد۲ ص ۱۵
۲۸- نمبر۱۰ ص ۴۲
۲۹- " ص ۴۲
۳۰- " ص ۱۰۹
۳۱- " ص ۱۰۹
۳۲- " ص ۱۱۰
۳۳- " ص
۳۴- " ص
۳۵- " ص
۳۶- " ص
۳۷- " ص ۱۹۱
۳۸- " ص ۱۹۱
۳۹- نمبر۹ ص ۱۰۰
۴۰- نمبر۱۰ ص ۳۶
۴۱- نمبر۹ ص ۱۳۲
۴۲- " ص ۱۳۰
۴۳- " ص ۱۳۱
۴۴- نمبر۲ جلد۲ ص ۲۴
۴۵- " " ص ۲۵-۲۶
۴۶- " جلد۱ ص ۲۵۷
۴۷- " جلد۲ ص ۲۶۹
۴۸- نمبر۱۰ ص ۲۹۲-۹۳
۴۹- " ص ۲۰۳
۵۰- " ص ۲۰۳
۵۱- " ص ۲۰۴
۵۲- " ص
۵۳- " ص

دسواں باب

۱- نمبر۱۰ ص ۲۵۱
۲- " ص ۲۵۶
۳- " ص ۲۵۶-۵۷
۴- " ص ۲۶۱-۶۶
۵- " ص ۲۶۶-۶۷
۶- " ص ۲۶۷
۷- " ص ۲۷۴
۸- " ص ۲۷۴
۹- نمبر۹ ص ۱۶۲

۱۰- نمبر۱۰ ص ۲۵۴
۱۱- " ص ۲۵۶
۱۲- " ص ۲۵۶
۱۳- " ص ۲۵۵
۱۴- " ص ۲۵۸
۱۵- نمبر۹ ص ۱۹۱
۱۶- " ص ۱۹۱
۱۷- نمبر۹ ص ۱۸۸
۱۸- نمبر۲ جلد۱ ص ۴۴
۱۹- نمبر۲ جلد۲ ص ۷۶

گیارھواں باب

۱- نمبر۱۰ ص ۲۳۹
۲- " ص ۲۴۱
۳- " ص ۲۳۹-۴۰
۴- نمبر۹ ص ۱۱۱
۵- " ص ۱۱۱
۶- " ص ۱۱۱
۷- نمبر۱۰ ص ۲۴۸
۸- " ص ۲۴۸
۹- نمبر۹ ص ۱۱۲
۱۰- نمبر۹ ص ۱۱۲
۱۱- " ص ۱۱۲
۱۲- " ص ۱۱۳
۱۳- نمبر۸ ص ۴-۵
۱۴- " ص ۱۸
۱۵- نمبر۱۰ ص ۲۴۶
۱۶- " ص ۲۴۶
۱۷- " ص ۱۸۰
۱۸- " ص ۱۸۴
۱۹- نمبر۸ ص ۸۷
۲۰- " ص ۱۸۷
۲۱- نمبر۲ جلد۶ ص ۷۸
۲۲- نمبر۳ جلد۱ ص ۳۲۷
۲۳- " جلد۲ ص ۱۰۳
۲۴- " جلد۲ ص ۱۰۴

بارھواں باب

۱- نمبر۱۰ ص ۱۱
۲- نمبر۹ ص ۴
۳- " ص ۸
۴- نمبر۶ ص ۳۱۵

۵- نمبر۶ ص ۲۱۸
۶- نمبر۹ ص ۸-۹
۷- نمبر۱۰ ص ۱۹
۸- 〃 ص ۴۴
۹- 〃 ص ۴۵
۱۰- 〃 ص ۴۵
۱۱- نمبر۲ جلد۱ ص ۲۷-۲۸
۱۲- نمبر۹ ص ۱۶
۱۳- 〃 ص ۴۱
۱۴- 〃 ص ۴۱
۱۵- نمبر۹ جلد۵ ص ۲۰۶
۱۶- نمبر۹ ص ۳۱
۱۷- 〃 ص ۶۹
۱۸- 〃 ص ۷۰
۱۹- 〃 ص ۷۹
۲۰- 〃 ص ۷۹
۲۱- نمبر۹ جلد۱ ص ۲۴۱-۴۲
۲۲- نمبر۹ ص ۱۴۵
۲۳- 〃 ص ۹



